معاشیات ہند

جلد اول

سلسلۂ نصابِ تعلیمِ جامعہ عثمانیہ

معاشیاتِ ہند

جلد اول

تصنیف

جی، بی، جتھار، ام، اے۔ پروفیسر تاریخ و معاشیات کرناٹک کالج دھارواڑ

و

یس، جی، بیری ام، اے۔ پروفیسر معاشیات سڈنہم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس بمبئی

ترجمہ (ایڈیشن ۱۹۳۷ء)

مولوی رشید احمد صاحب بی۔اے (علیگ) ایف۔آر۔ای۔یس (لندن)
رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۹ھ سنہ ۱۳۴۹ف سنہ ۱۹۴۰ء

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس و پبلشرز کی اجازت
سے جس کو حق اشاعت حاصل ہے اُردو میں
ترجمہ کر کے طبع و شایع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

معاشیات ہند (جلد اول)

باب ۱

از صفحہ ۱ تا ۱۰

معاشیات ہند: وسعت اور تعریف

باب ۲

از صفحہ ۱۱ تا ۵۶

ہندوستان کا طبیعی ماحول اور قدرتی ذرائع

باب ۳

از صفحہ ۵۷ تا ۱۴۶

آبادی

باب ۴

از صفحہ ۱۴۷ تا ۱۸۸

معاشری و مذہبی آئین ورواج

باب ۵

از صفحہ ۱۸۹ تا ۲۴۸

ہندوستان کی معاشی حالت میں تغیر

باب ۶

از صفحہ ۲۴۹ تا ۳۱۶

زراعت

پیداوار اور برآمد

باب ۷

از صفحہ ۳۱۷ تا ۳۷۱

زراعت

زمین اور اس کے مسائل

باب ۸

از صفحہ ۳۷۲ تا ۴۴۲

زراعت

محنت، ساز و سامان اور تنظیم

باب ۹

از صفحہ ۴۳۳ تا ۴۸۰

دیہی قرض داری

باب ۱۰

از صفحہ ۴۸۱ تا ۵۲۶

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک

باب ۱۱

از صفحہ ۵۷۷ تا ۶۰۴

حکومت اور زراعت سے اس کا تعلق

باب ۱۲

از صفحہ ۶۰۵ تا ۶۹۰

مالگزاری

باب ۱۳

از صفحۂ ۶۹۱ تا ۷۱۴ ختم

صنعتوں پر ایک عام نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ا

معاشیات ہند: وسعت اور تعریف

ا - تعریف

"معاشیات ہند" کی مختصر، سادہ اور جامع تعریف، عام مفہوم کے لحاظ سے، یوں کی جاسکتی ہے کہ "اس میں ہندوستان کے اہم معاشی مسائل اور ان کے ممکنہ اسباب کی تحقیق و تحلیل کی جاتی ہے اور ان مسائل کے حل کے متعلق اختیار کی ہوئی اور اختیار کرنے کے قابل تدبیروں سے بحث کی جاتی ہے۔" یہ بالکل فطری امر ہے کہ ملک کی معاشی حیثیت کو جانچتے ہوئے حکومت کی پالیسی کی یا تو نکتہ چینی کی جائے یا داد دی جائے، اور ملک کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے تجویزیں مرتب اور پیش کی جائیں۔ اس جانچ کے دوران میں نقطۂ نظر تمام تر "قومی" ہوگا، اور مقصد شروع سے آخر تک اہل ہند کی مادی فلاح و ترقی رہے گا۔ سرجان اسٹریچی نے مالیے کا میزانیہ پیش کرتے ہوئے اس اصول کی مخالفت کی تھی کہ حکومت ہند کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ محض ہندوستان کے اغراض اور مفاد کو پیش نظر رکھے؛ اور یہ خیال ظاہر کرکے اپنے من کی بات کہہ ڈالی کہ اپنے ملک کی خدمت ہی ان کے نزدیک سب سے اعلیٰ اور ارفع فرض تھا۔ یہ خیال دراصل وہی دقیانوسی نوآبادیاتی پالیسی کی صدائے بازگشت ہے جو انگلستان کے سمندر پار کے مقبوضات کے بارے میں یہ قرار دیتی تھی کہ ان کا اولین مقصد انگلستان کے اغراض اور مفاد کو پورا کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے

باب ۱ زاویہ نگاہ سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان سلطنت برطانیہ کا ایک جزو سہی، لیکن
وہ سلطنت برطانیہ کی شان اور عظمت بڑھانے کی خاطر کوئی قربانی کرنے پر اس وقت تک راضی
اور آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اس بات کا کامل اطمینان نہ ہو جائے کہ جو قربانی اس سے
مانگی جا رہی ہے وہ آخر میں اس کے اپنے قومی مفاد کے لیے ہے۔ ہم کو چاہیے کہ عام اصول کے
لحاظ سے، اپنے ملکی اغراض کو بلا پس و پیش مقدم رکھیں، اور سلطنت برطانیہ سے ہماری وسیع تر اور
کمتر ضروری وفاداری کو دوسرے درجے پر۔ سچ پوچھو تو بعینہ یہی حالت ان حکمران نوآبادیات
کی بھی رہی ہے جنھوں نے اپنے قومی اغراض کی ترقی کی کوشش کو مقدم رکھا؛ اور مادر وطن (برطانیہ)
سلطنت برطانیہ کے عناصر ترکیبی، یا بحیثیت مجموعی کل دنیا کی خیر خواہی ان کے اس پختہ ارادے
کی تابع رہی کہ وہ اپنی مادی خوشحالی اور بہبود کو بحد امکان بلند ترین معیار پر پہنچائیں گے۔ چنانچہ
یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں مثلاً اپنے محصولوں کے انتظامات کے
سلسلے میں انھوں نے بعض اوقات ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے مادر وطن، یعنی برطانیہ کو فوری
نقصان پہنچا۔ یہ بیان نوآبادیات کی حالت اور ان کے طرز عمل کی بابت، اب بھی صادق آتا ہے
اور اس واقعہ کے باوجود بڑی حد تک صحیح ہے کہ وہ جنگ عظیم کے تجربوں کی بنا پر اس بات پر
پہلے سے کسی قدر زیادہ آمادہ ہو گئے ہیں کہ سلطنتِ برطانیہ کے باہمی رشتۂ اتحاد کو مضبوط بنانے کی
2 خاطر ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ قربانی کریں پس ہندوستان بھی اسی قسم کی آزادی چاہتا ہے، تاکہ
اپنے معاشی نظام کو زیادہ تر اپنے مفاد اور اغراض کے لیے منظم کرے۔

خلاصہ یہ کہ "معاشیات ہند" ہندوستانی قومی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی موجودہ
معاشی حالت اور حیثیت کی تحقیق ہے[1]

[1] اصطلاح "معاشیات ہند" کے ساتھ یہ مفہوم منسوب کرنے میں ہمیں بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انگریزی زبان کے ساتھ کوئی
تشدد یا زیادتی کی جا رہی ہے؛ علاوہ ازیں دیرینہ رواج اس کو جائز قرار دیتا ہے کہ ہم اس مفہوم کے حق بجانب ہونے کا
اقرار کریں۔ پرنسپل پرسی آنسٹی انجہانی یہ خیال کرتے تھے کہ "معاشیات ہند" کی اصطلاح جتنی "بدنما اور ناپسندیدہ"
تھی اتنی ہی "گمراہ کن" بھی تھی۔ ہمارا یہ گمان ہے کہ اس تنقید کو حوالے اور سند کے طور پر زیادہ تر اس لیے پیش کیا جاتا
ہے کہ اس میں چند صنعتوں کا خوش اسلوبی سے مظاہرہ کیا گیا ہے، ورنہ اس میں سچائی کی بو باس تک نہیں۔ اصطلاح
کا "بدنما اور ناپسندیدہ" ہونا خالصتاً ذوق کا معاملہ ہے۔ رہا اس کا "گمراہ کن" ہونا تو، جب اس کی معین تعریف

باب ۱

۲ - دوسرا ممکنہ مفہوم

"معاشیات ہند" کی اصطلاح کو عام رواج کے مطابق، ہم نے جس مفہوم میں استعمال کرنے کی تحریک کی وہ بالکل فطری اور بصورتِ دیگر حق بجانب ہے، لیکن ایک خاص مفہوم میں کسی اصطلاح کے استعمال کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ ثابت کرنا کہ یہ اصطلاح دوسرے مفہوم پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دراصل غیر ضروری ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "معاشیات ہند" کی اصطلاح اس کے علاوہ دو اور مفہوم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے[۱]۔ سب سے اول، اس کے معنی قدیم ترین زمانے سے اب تک "ہندوستانی معاشی تخیل کی تاریخ" کے ہو سکتے ہیں۔ اگر، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تخیل کی مسلسل نشوونما کا سراغ نہ مل سکے، کوئی تحریک خیال قابل یادداشت نہ ہو، اور اگر ایک صدی کا رائج تخیل متعاقب صدیوں کے رائج تخیلات کے کم و بیش مثل ہو یہاں تک کہ حال کا زمانہ آجائے جس میں مغربی اثرات کو شمار کرنا پڑے، تو ممکن ہے کہ ایسی تاریخ کا مطالعہ کسی قدر غیر دلچسپ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی تاریخ اس معنی میں غیر مربوط ہو کہ اس میں لاعلمی کے اعتراف سے وقتاً فوقتاً رخنہ پڑے؛ اس لیے کہ بحالتِ موجودہ گزشتہ تاریخ کے اکثر دوروں کے حالات کا علم نہیں ہے؛ گو یہ ممکن ہے کہ تحقیق کی ترقی، رفتارِ زمانہ کے ساتھ اس وقت گہری تاریکی میں لپٹے ہوئے حالات کے بڑے حصہ کو روشنی میں لانے میں کامیاب ہو۔ یوں تو یہ اعتراضات "معاشیات ہند" کی اصطلاح کو "ہندوستانی معاشی تخیل کی تاریخ" کے مفہوم میں استعمال کرنے کی راہ میں کسی حال مانع نہیں ہیں؛ تاہم موخر الذکر مکمل اصطلاح استعمال کر کے پیچیدگی آسانی کے ساتھ رفع کی جا سکتی ہے۔

۳ - تیسرا مفہوم

اگر یہ بات مبنی بر صداقت ہو کہ ہندوستانی معاشرہ اور ہندوستانی حالات، مغرب کے معاشروں اور حالات سے بنیادی طور پر مختلف ہیں، یہاں تک کہ معاشیات کے معمولی ابتدائی مفروضات کا اطلاق ہندوستان پر مطلق نہ ہو سکتا ہو تو، ماننا پڑے گا کہ جہاں تک کہ وہ محض زبان کا مسئلہ ہے، "معاشیات ہند" کے معنی بجا طور پر مغرب کے مروجہ معاشی اصول سے مختلف معاشی نظریوں کے ایک بالکل نئے نظام کے بھی

بقیہ صفحہ گزشتہ ۔ کر دی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی گمراہ ہو۔

[۱] دیکھو وی۔ جی کالے کی کتاب موسوم بہ (Indian Economics) معاشیات ہند جلد اول مقدمہ۔

باب ۱

ہو سکتے ہیں۔[1] لیکن "معاشیات ہند" کوئی ایسا جدید علم تو ہے نہیں جو ہندوستانی حالات اور مواد سے تیار کیا گیا ہو، اس لیے اس مخصوص مفہوم میں "معاشیات ہند" کی اصطلاح کو استعمال کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ہندوستان اور مغربی ملکوں میں انسانی فطرت لازمی طور پر ایک ہے، اور اساسی معاشی مفروضات دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگر مغربی ملکوں میں ذاتی مفاد و اغراض کا محرک معاشیات کی بنیاد کے طور پر کام میں لائے جانے کے لیے کافی طاقتور اور مسلسل کار فرما خیال کیا جاتا ہو تو ہندوستان کے بارے میں یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کے باشندے معمولی طور پر معاشی محرک (یعنی ذاتی مفاد) کے تابع ہونے کے بجائے اخوانی محرک کے تابع ہیں۔ یہی حال دوسرے مفروضات مثلاً آزاد مسابقت، محنت و اصل کی نقل پذیری وغیرہ کا بھی ہے۔ گو یہ مفروضات مغرب کی طرح ہندوستان کے حالات کے بارے میں اسی متعدد اعتماد کے ساتھ غالباً نہیں قائم کیے جا سکتے، لیکن اس کے باوجود وہ کافی طور پر صحیح ہیں اور ہندوستان کی معاشی صورت حال کے سمجھنے میں مغربی مفکروں کے بنائے ہوئے عام معاشی نظریوں کو بیش قدر ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ عملی معاشیات کے میدان میں مغرب کا تجربہ ہندوستان کے لیے قیمتی سبقوں سے مالا مال ہے۔

چونکہ فطرت انسانی ہر جگہ ایک ہی ہے اور علم معاشیات انسانی فطرت کی بعض عام اور ہمہ گیر خصوصیات پر مبنی ہے، اس لیے واقعہ یہ ہے کہ معاشیات کا علم سارے عالم کے لیے اسی طرح ایک ہی ہوگا جس طرح کہ ریاضی، طبیعیات، کیمیا وغیرہ۔ پس اگر کوئی طالب علم جو مغربی معاشی نظریے سے واقف ہو "معاشیات ہند" کی کسی کتاب کا مطالعہ اس نظر سے کرے کہ وہ کلیتہً نئے قسم کے معاشی نظریوں سے دوچار ہوگا تو اسے مایوسی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ وہ کتاب کے مطالعے کے بعد اس بات کو کامل طور پر محسوس کر لے گا کہ بقول مارشل "معاشی اصول میں یکسانی ہے گو ان کی شکلیں مختلف ہیں" اور معاشی اصول کی اضافی نوعیت کے متعلق بھی اس کے احساس کو خاصی معقول تقویت پہنچے گی۔

---

[1] چنانچہ یہی خیال ان لوگوں کا تھا جنھوں نے پہلے "معاشیات ہند" کی اصطلاح رائج کی تھی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا موجودہ استعمال، جیسا کہ متن میں تشریح کی جا چکی ہے، غیر حق بجانب ہے۔

۴۔ معاشیات ہند: ایک جداگانہ موضوع بحث

لیکن یہ اعتراف کہ معاشیات کا علم سارے عالم کے لیے ایک ہی ہے، ہمیں یہ کہنے سے باز نہیں رکھتا کہ ہر ملک کے معاشی حالات کی جداگانہ تحقیق نہ صرف حق بجانب بلکہ ناگزیر ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایسی
۵ تحقیق کی عدم موجودگی میں اس کا قرینہ ہے کہ غلط معاشی پالیسی اختیار کی جائے، اور یہ ملک کے حقیقی اغراض کے منافی ہوگا۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشیات ہند کو ایک جداگانہ موضوع تحقیق قرار دینا چاہیے تو اس کا منشا و مفہوم ہمارے ذہن میں یہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس غلط خیال کو ذہن میں جگہ نہ دینی چاہیے کہ ہندوستان کے معاشی حالات کی تحقیق کی بنیاد کسی نہ کسی طرح دوسرے ممالک کے معاشی حالات کی تحقیق کی بنیاد سے سراسر مختلف ہے۔

۵۔ معاشیات ہند محض معاشی اصول کی تشریح نہیں جس میں ہندوستانی مثالیں ہوں

معاشیات ہند کے متعلق اکثر نصابی کتابوں میں مختلف مسائل کو "زمین"، "محنت"، "عمل"، "پیدائش"، "تقسیم"، مبادلے وغیرہ کے عام عنوانوں کے تحت بیان کیا جاتا ہے اس میں یہ فائدہ ہے کہ بحث میں بظاہر زیادہ باقاعدگی اور خوش اسلوبی پیدا ہو جاتی ہے اور تمام اہم مضامین زیر بحث آجاتے ہیں لیکن بحث کی ایسی ترتیب کی بنا پر یہ خیال قایم نہ کرلینا چاہیے کہ "معاشیات ہند" محض معاشی اصول کی ایسی تشریح ہے جس میں ہندوستانی کی معاشی زندگی کے واقعات محض نظریے کی مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یوں تو معاشی نظریے کا بیان ہندوستانی مثالوں کے ساتھ ہندوستانی طالب علم کی تفہیم میں بے شبہ زیادہ سہولت پیدا کرے گا، بہ نسبت اس کے کہ مثالیں غیر مانوس حالات سے پیش کی جائیں، لیکن اس کو "معاشیات ہند" لقب دینا حق بجانب نہ ہوگا؛ اس لیے کہ "معاشیات ہند" ایک ایسی تحقیقی بحث ہے جس کا تعلق از سرتاپا ہندوستان کی معاشی زندگی کے واقعات و مسائل سے ہے۔ اور خالص "عالمی معاشیات" کے نظریے کا حوالہ و بیان صرف اس وقت موضوع سے متعلق اور بجا ہوگا جب کہ ان واقعات و مسائل کو سمجھنے میں اس سے مدد ملے۔

ہندوستانی حالات کی ایسی جداگانہ تحقیق کو ہم "معاشیات ہند" کے نام سے اسی طرح موسوم کرتے ہیں جس طرح ان کے مماثل انگلستان کے حالات کی تحقیق کو "معاشیات انگلیشیہ" کے نام سے بخوبی تعبیر کر سکتے ہیں۔ انگلستان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں، مثلاً بنک کاری، زر،

باب ۱

نقل و حمل اور زراعت کے متعلق بے شمار تصنیفوں کے بارے میں نہایت مناسبت و موزونیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ "معاشیات انگلیشیہ" کے متعلق ہیں۔

۶۔ راناڈے کی قابل قدر خدمت۔

انیسویں صدی کے بڑے حصے میں ہمارے ملک کی سرکاری پالیسی مطلق اصول پرستی پر ناواجب طریقے سے مبنی تھی اور حکومت اس بات کی مدعی تھی کہ وہ ان عام معاشی اصول کی پیرو تھی جن کی تشریح مقبول عام انگریزی نصابی کتب میں کی گئی تھی، اور معاشی قوانین کی مفروضی نوعیت کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ چونکہ آزاد تجارت انگلستان کے حق میں مفید تھی، اس لیے اس پر زور دیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے لیے بھی آزاد تجارت ہی لازمی طور پر مفید ہوگی۔ عدم مداخلت کا اصول بہ حیثیت مجموعی انگلستان کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھا، لہذا یہ استدلال کیا گیا کہ اس اصول کو ہندوستان کے لیے بھی مساوی طور سے مفید ہونا چاہئے، حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان میں خانگی مہم پسندی یا کاروبار کا جوش عملاً مفقود تھا یا بہت ہی کم ترقی یافتہ حالت میں پایا جاتا تھا۔ معاشی نظریے کے نتائج کی بنا پر حکومت بعض اوقات نیک نیتی کے ساتھ استدلال کرتی تھی اور بعض اوقات عالی منشی کے خلاف۔ چنانچہ اکثر مفکر اشخاص کی رائے میں حکومت کی پالیسی معاشی معاملات میں ایسی ہوتی تھی کہ اس سے ہندوستان کے حقیقی اغراض پورے نہ ہوتے تھے۔ 5
ماہران سیاسیات نے اس روش اور پالیسی پر حملہ کیا اور حکومت پر قطعی طور سے یہ الزام عاید کیا کہ وہ برطانیہ یا سلطنت برطانیہ کے اغراض کو ترقی دینے کے لیے ہندوستانی قومی مفاد کو قربان کر رہی تھی۔ نیز معاشیات دانوں نے بھی اس پر حملہ کیا، اور ان میں سب سے پیش پیش جسٹس راناڈے آنجہانی تھے۔ راناڈے کا حملہ معاشی نقطۂ نظر سے تھا۔ انھوں نے اپنے عادی عالمانہ انداز میں، پُرزور اور بے نظیر الفاظ میں مخالفت کی؛ کم از کم جوش و خروش اور الفاظ کی شوکت کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں کوئی ہندوستانی مصنف نہ تھا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ معاشیات کے موضوع کے متعلق کل اصول پرستانہ بحث کے بنیادی مفروضات میں سے اکثروں کا اطلاق ہندوستان پر نہ ہوسکتا تھا؛ اور یہ کہ اگر مقصود ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو سریع کرنا تھا تو، حکومت اپنی پالیسی میں اُن متعدد خصوصیات کو بآسانی نظر انداز نہ کرسکتی تھی جو ہندوستانی حالات پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مندرجۂ ذیل عبارت میں جس کو عام طور سے بطور سند و حوالہ پیش کیا جاتا ہے، یہ بتلایا کہ وہ کونسی اہم اور خاص

باب ۱

خصوصیات ہیں جنھیں اِن کی رائے میں حکومت نے نظر انداز کیا تھا: "چونکہ یہ مفروضات (راناڈے کا مطلب اِن مفروضات سے روشن خیال انفرادیت، آزاد مسابقت، محنت و اصل کی نقل پذیری وغیرہ ہے) سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشروں پر بھی قطعی طور پر صادق نہیں آتے، اس لیے ظاہر ہے کہ ہمارے معاشرے کے مثل معاشروں میں وہ زیادہ تر نمایاں طور سے مفقود ہیں۔ ہمارے ملک کا ایک اوسط درجے کا فرد بڑی حد تک "معاشی انسان کا بالکل ضد ہوتا ہے۔ زندگی میں کسی فرد کی حیثیت کو معین کرنے میں فرد سے زیادہ طاقت ور، خاندان اور ذات پات ہیں۔ دولت کی خواہش کی شکل میں ذاتی مفاد یا خود غرضی مفقود نہیں ہے، لیکن یہی سب سے بڑا محرک بھی نہیں ہے۔ دولت کا حاصل کرنا ہی وہ واحد مقصد نہیں ہے جو پیش نظر ہو۔ آزاد اور غیر محدود مسابقت کی نہ تو خواہش ہے نہ اس کا حوصلہ، بجز اس کے کہ چند خاص جماعتوں یا کونوں گوشوں میں اس کا وجود پایا جائے۔ رسم و رواج اور سرکاری قواعد وضوابط، مسابقت سے زیادہ قوی اور پُراثر ہیں؛ اور معاہدے کے مقابلے میں حیثیت کا اثر زیادہ قطعی اور فیصلہ کُن ہے۔ محنت اور اصل میں سے کوئی بھی نقل پذیر نہیں ہے، اور نہ اتنا بے باک، دھم پسند اور واقف ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو جلد منتقل ہو۔ اجرت اور نفع کی شرحیں معین ہیں، اور حالات کے تغیرات کے لحاظ سے ان میں تناسب تبدیلی نہیں ہوتی۔ آبادی اپنے ہی قانون کی تابع ہے، چنانچہ امراض و قحط اس میں قطع بُرید کرتے رہتے ہیں، برخلاف اس کے پیدائش پر کم و بیش حالت سکون و جمود طاری ہے، اور ایک سال کی فصل کے وافر حاصل کو بار بار آنے والے خراب موسموں کی نیرنگیوں سے تحفظ کے طور پر فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ترکیب کے معاشرے میں حقیقت متعارفہ فرض کیے ہوئے میلانات نہ صرف عملی طور پر رونما نہیں ہوتے بلکہ سچ پوچھو تو اپنے اصلی رُخ سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ میلان کو حقیقت مان لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ یہ میلانات کہ پہاڑ دھل دھل کر سمندر میں بہ جائیں گے، یا وادیوں کا نشیب فراز سے بدل جائے گا، یا آفتاب سرد ہو جائے گا، ایک مقررہ مدت کے اندر ہمارے اہتمام عمل کے اسباب ہیں[1]۔

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Essays on Indian Economics (دوسرے ایڈیشن صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱) میں ایک عنوان "معاشیات ہند کے متعلق راناڈے کا نقطۂ نظر"۔

باب 6

۷۔ مغربی معاشی نظریہ اور معاشیات ہند

انیسویں صدی میں، انگلستان کے سراسر مختلف ماحول کے لیے جو معاشی پالیسی مناسب و موزوں پائی گئی تھی اس کی کورانہ تقلید ہندوستان میں کرنے کے خلاف پوری قوت اور شدت کے ساتھ احتجاج کر کے راناڈے نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ لیکن ان کے الفاظ پر ایک مدت دراز کے بعد اب غور کرنے پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس خیال کو رائج کرنے کے بظاہر وہی ایک حد تک ذمہ دار ہیں کہ مغرب کا معاشی نظریہ، ہندوستان کے معاشی مظاہر کی تشریح کرنے اور معاشی ترقی کے طریقوں کی رہنمائی کرنے میں بالکل بے کار ہے۔ راناڈے کی حد تک یہ کہنا ٹھیک ہے کہ اس خیال کو حد سے زیادہ زور دے کر اور موثر طور پر بیان کرنا معاملے کی اہمیت کے مدنظر ضروری تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حکومت وقت قدیم اور معتبر معاشیات کے احترام میں مبالغے سے کام لے رہی تھی اور اس بات کی مدعی تھی کہ وہ تمام عالم اور حالتوں پر یکساں طور سے صادق آتے تھے۔ غرض ایک سمت میں کیے ہوئے مبالغے کی اصلاح کا واحد طریقہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ مخالف سمت میں غلو بیانی کی جائے۔ راناڈے نے ایسے زمانے میں کتاب لکھی جب کہ علمی سوالات کو حل کرنے کے لیے نام نہاد دوامی معاشی قوانین کی بنیاد پر حد سے زیادہ اعتماد کے ساتھ استدلال کرنے کا طریقہ عام تھا اور نظری نتائج کو تاریخی، و استقرائی تحقیق کے ذریعے سے محفوظ کرنے کی ضرورت کا کافی احساس نہ تھا جس سے کسی خاص انسانی معاشرے پر ان نتائج کے اطلاق کی وسعت کا حال معلوم ہوتا۔ راناڈے نے ہندوستان میں جو خدمت انجام دی وہ جرمنی میں فریڈرش لسٹ کے متوازی کارنامے سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ چنانچہ لسٹ نے اپنی کتاب موسوم بہ (National System of Political Economy) شائع شدہ ۱۸۴۲ء میں قدیم و معتبر معاشیات کے دقیانوسی اصول اور ان کی نام نہاد عالمگیر صداقت کی شدومد کے ساتھ مخالفت کی" اور خاص کر موجودہ معاشی نظام کے اصول عالمیت اور تجارت آزاد کے اس اصول مطلق کے خلاف اس نے احتجاج کیا جو اول الذکر اصول کے ہم آہنگ تھا۔ اس نے قومیت کے خیال کو بہت نمایاں کیا اور اس پر زور دیا کہ ہر قوم کی خاص ضرورتیں، اس کے مخصوص حالات اور خاص کر اس کی ترقی کے درجے کے لحاظ سے ہوتی ہیں[1]۔" واقعہ یہ ہے کہ راناڈے میں زیادہ تر

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (گیارہواں اڈیشن) "فریڈرش لسٹ" پر مضمون۔

باب۱

لسٹ کی تصانیف کے مطالعے سے جوش وخروش پیدا ہوا، اور اپنے زمانے اور اپنی نسل میں
اُنھوں نے اپنے ملک کے لیے بعینہ وہی خدمت انجام دی جو لسٹ نے جرمنی کے لیے انجام
دی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں راناڈے نے دوسروں کے لیے نمونہ قایم کیا اور دوسرے اس کی
تقلید مناسب حد اور مدت سے زیادہ کرتے رہے۔ چنانچہ یہ خیال جو آجکل بھی بعض اوقات
پیش کیا جاتا ہے بہت کم حق بجانب ہے کہ معاشی مفروضات میں سے کسی مفروضے کا اطلاق
7 ہندوستانی حالات پر بہ مشکل کیا جا سکتا ہے؛ اور یہ کہ "عظیم اصول لذتیت صرف یہی نہیں چاہتا کہ
اس میں کہیں کہیں مناسب ترمیم کرلی جائے، بلکہ ہندوستان میں وہ کہیں بھی کارآمد نہیں ہے"۔
اس نوعیت کے خیالات لوگوں کے دلوں میں بعض اوقات یہ تصور قایم کرانے کی جانب رہبری
کرتے ہیں کہ ہندوستان کے معاشی مسائل کی مخصوص تحقیق ازسرتاپا جدید معاشی اسلوب کی طالب
ہے اور اس مقصد کے لیے مغربی اسلوب بالکل غیر مفید ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے معاشی مسائل پر بحث کرتے وقت ہمیں ہر ہر قدم پر مغربی
معاشی نظریے سے مدد طلب کرنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ پروفیسر برج نارائن نے اپنی تالیف
موسوم بہ "مضامین بر معاشیات ہند" (Essays on Indian Economics) میں
بتلایا ہے، راناڈے کی تحریروں کے بعد سے معاشیات اور ہندوستان دونوں کی نوعیت
بدل گئی ہے۔ معاشیات نے اپنے نتائج کی مفروضی نوعیت پر زور دینے کے بارے میں مناسب
تجربہ حاصل کرلیا ہے اور ان نتائج کو تمام دنیا کے لیے عام طور سے صحیح قرار دینے سے محترز ہوگئی ہے[2]۔
نیز چونکہ معاشی مفروضات میں اس طرح ترمیم کرلی گئی ہے کہ وہ واقعات وحقائق کے زیادہ مطابق بن گئے
ہیں اس لیے معاشیات زیادہ انسانی اور زیادہ عملی بن گئی ہے اور اپنی دیرینہ غیر فطری سادگی کو ترک
کرکے بہت زیادہ کارآمد ہوگئی ہے۔ گزشتہ چالیس سال کی مدت میں ہندوستانی حالات بھی بڑی حد تک

[1] دیکھو پی آنس ٹے کا مضمون جو انھوں نے تیسری ہندوستانی معاشی کانفرنس میں بمقام مدراس پڑھا تھا۔

[2] معاشیات کا نظریہ ایسے معین نتائج کا مجموعہ پیش نہیں کرتا جن کا اطلاق عملی طور پر براہ راست یا فوراً ہو سکتا ہو۔
نظریہ اصول کے بجائے ایک طریقہ ہے یا دماغ کے لیے ایک آلۂ کار اور فکر کا ایک اسلوب ہے
جو مفکر کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتا ہے" دیکھو جے۔ ام کینس کا عام مقدمہ جو انھوں نے کیمبرج کی معاشیات کی چھوٹی کتابوں پر لکھا ہے۔

باب ۱

بدل گئے ہیں اور مغربی حالات کے مشابہ بننے کی جانب بہت زیادہ تیزی کے ساتھ مائل ہیں ۔ ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی اور یورپی معاشی ارتقا کے باہمی اختلافی اُمور کا راگ مسلسل اور بے فائدہ طریق پر الاپنے کے بجائے مماثلتی و مشابہتی امور پر زور دے کر زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے ۔

باب ۲

ہندوستان کا طبیعی ماحول اور قدرتی ذرائع 8

۱۔ قدرتی ذرائع اور ان کی اہمیت

کسی قوم کی معاشی زندگی کو متعین کرنے میں قدرتی ذرائع جو اہم حصّہ رکھتے ہیں ان میں کسی مبالغے کی بمشکل گنجائش ہے۔ نکل سن کا قول ہے کہ خود انگلستان کی حد تک بھی "باوجود اس کے کہ انگلستان کی تجارت و صنعت کو غلبہ حاصل ہے، اور وہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے، قدرتی حالات بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ساحلی خطہ اور دریا، کوئلے اور لوہے کی زرخیز کانوں کا قُرب، معتدل و مرطوب آب و ہوا، اور زمین کی زرخیزی، یہ سب اب بھی قومی دولت کی اساس ہیں[1]" اور اگرچہ یہ ممکن ہے کہ معلومات و ذہانت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قدرت پر انسانی دسترس بڑھ جائے، پھر بھی یہ تدریجی عمل قطعی طور پر محدود ہے، اور آخری چارۂ کار کے طور پر انسان کے لیے قدرتی قوتوں اور ساز و سامان پر انحصار کرنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس باب میں ہندوستان کے طبیعی ماحول کو اجمالی طور پر بیان کرکے اس ملک کے بارے میں اپنی

[1] "اصول معاشیات" جلد اول ص ٦٦

معاشی تحقیق شروع کریں گے۔[1]

۲۔ ہندوستان: رقبہ اور آبادی

برطانوی ہند کا رقبہ ۱٬۰۹۶٬۱۷۱ مربع میل اور آبادی ۲۷۱٬۵۲۶٬۹۳۳ نفوس ہے،[2] اور دیسی ریاستوں اور ایجنسیوں کا رقبہ ۷۱۲٬۵۰۸ مربع میل اور آبادی ۸۱٬۳۱۰٬۸۴۵ نفوس ہے۔[2] ملک کا طول شمالاً جنوباً قریب قریب دو ہزار میل اور شرقاً غرباً تقریباً ۲۵۰۰ میل ہے۔ اس طرح ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے، چنانچہ برطانیہ عظمیٰ سے وہ پندرہ گونہ بڑا ہے اور روس کو نکال کر پورے یورپ کے برابر ہے۔ اس کی بری سرحد ۶۰۰۰ میل طویل ہے اور ساحلی خط کا طول ۵۰۰۰ میل ہے۔

۳۔ جغرافی محل وقوع

یوں تو جغرافی محل وقوع ہمیشہ اہم ہوتا ہے، لیکن معاشری ترقی کے آخری مرحلوں میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان کو تجارت بین الاقوام کے اغراض کے لیے باقی دنیا کے مقابلے میں بہت موافق محل وقوع حاصل ہے۔ وہ مشرقی نصف کرۂ ارض کے عین مرکز میں واقع ہے، اور تجارتی راہوں پر جو ہر سمت میں جاتی ہیں دسترس رکھتا ہے۔ چونکہ اس کا ساحلی خط طویل و وسیع ہے، اس لیے بحری راہیں بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اگر اس کو ضروری بحری ساز و سامان مہیا کر دیا جائے تو توی امید ہے کہ وہ دنیا کی تجارت کی نقل و حمل کرنے والے بڑے ملکوں میں سے ایک بن جائے گا۔

۴۔ بندرگاہوں کی کمی

ہندوستان اس اعتبار سے بہت گھاٹے میں ہے کہ ایسی قدرتی گودیوں یا بندرگاہوں کی یہاں بہت کمی ہے جن میں جدید طرز کے جہاز آ کر ٹھیر سکیں۔ مغربی ساحل کے بندرگاہ، بجز کراچی، بمبئی اور مارماگوا کے، برسات کے کل موسم میں جہازی آمد و رفت کے لیے بند رہتے ہیں۔ مشرقی

---

[1] یہ بیان زیادہ تر تیب فائلڈ فلر کی کتاب موسوم بہ "دی امپائر آف انڈیا" یا "سلطنت ہندوستان" باب ۱، "دی امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" جلد اول؛ اور ڈی، ای، ٹی، ٹن کی کتاب موسوم بہ "سلطنت برطانیہ کا معاشی جغرافیہ" (The Economic Geography of the British Empire) پر مبنی ہے۔

[2] یہ اعداد ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں۔

ساحل پر تموج بہت شدید ہے اور قدرتی بندرگاہیں مفقود ہیں۔ تاہم مدراس کے بندرگاہ میں بیش خرچ بحری دیواریں تعمیر کر کے بہت کچھ اصلاح و توسیع کر دی گئی ہے اور مشرقی ساحل پر دندانہ دار حصوں کی عدم موجودگی سے جو مشکلات پیدا ہوگئی ہیں ان پر عہدہ برآ ہونے کی ایک مزید کوشش کے طور پر ویزاگاپٹم کے بندرگاہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کی ترمیم و توسیع کا کام سردست جاری ہے۔ یوں تو کلکتے کا محل و قوع بہت اچھا ہے، لیکن ہوگلی میں ریت کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں جو بہت خرابی پیدا کرتی ہیں؛ اور چٹاگانگ کی بھی حالت اسی کے مثل ہے۔ رنگون، مولمین، بسین اور ٹواے سمندر سے دور واقع ہیں؛ علاوہ ازیں ایک اور خرابی ان میں یہ ہے کہ یہاں سے اندرون ملک تک آمد و رفت کے وسائل کی حالت بہت غیر اطمینان بخش ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ کا $\frac{6}{7}$ حصہ کیوں پانچ بندرگاہوں یعنی بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس اور کراچی تک محدود رہے، جن کے منجملہ صرف بمبئی، اور کراچی قدرتی بندرگاہ ہیں۔ ایسی غیر اطمینان بخش حالت میں، ایک ایسی سرگرم پالسی کی ضرورت بخوبی واضح ہے جس کی رو سے مناسب بندرگاہوں کی تعداد میں اضافہ ہو، نئی گودیوں کی تعمیر عمل میں آئے اور قدیم اجڑے ہوئے بندرگاہوں کی تجدید ہو، تاکہ ساحلی و خارجی تجارت کی ضرورت موثر طریقے سے پوری ہو سکے۔ جہاز رانی کی صورت حال بھی بڑی حد تک غیر اطمینان بخش ہے، اس لیے کہ ہندوستان کے پاس ایسے بحری تجارتی جہاز ہی نہیں جو اس کے شایان شان ہوں اور اس کی بحری تجارتی جدوجہد کے قدیم روایات کو برقرار رکھ سکیں۔

۵ - اندرونی وسائل آمد و رفت

ہندوستان کے بڑے بندرگاہ، اندرون ملک کے تجارتی مرکزوں سے ریلوں اور سڑکوں کے جال کے ذریعے سے ملحق ہیں۔ اندرونی وسائل آمد و رفت کی حالت جزیرہ نمائے ہند کے مقابلے میں شمالی ہند میں زیادہ بہتر اور سہولت بخش ہے۔ شمالی ہند کو یہ سہولت حاصل ہے کہ جہاز رانی کے قابل دریاؤں کی موجودگی کے علاوہ بڑے بڑے میدانوں میں سڑکیں اور ریلیں بآسانی بنائی جا سکتی ہیں۔ برخلاف اس کے جزیرہ نما میں سطح زمین ناہموار اور کوہستانی ہونے کی وجہ سے شدید مشکلات پیش آتی ہیں، جنھیں صرف بڑا خرچ برداشت کر کے ہی رفع کیا جا سکتا ہے۔ دریاؤں میں کشتی رانی کا جہاں تک تعلق ہے، جزیرہ نما اور شمالی ہند میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے، اور موخرالذکر علاقے میں صورت حال موافق ہے۔ نقل و حمل کی کل صورتحال کے بارے میں مفصل بحث 10

باب ۲

جلد دوم میں کی گئی ہے۔

۶ - طبعی محل وقوع کی مشکلات کو دور کرنے کی کوششیں۔

طبیعی محلِ وقوع کی مشکلوں اور خرابیوں کو دور کرنے کے امکان کا حوالہ دیتے ہوئے سیلگ من صاحب تہری اصلاح وترقی کا ذکر کرتے ہیں، یعنی (۱) انسانوں اور اشیا کی نقل وحمل کے بارے میں؛ (۲) ترسیل قوت کے بارے میں؛ اور (۳) مراسلت کے انتظام کے بارے میں؛ ہم ان میں سے پہلے موضوع کا سرسری ذکر کرچکے ہیں۔ ترسیلِ قوت کے مسئلے پر اس باب میں متعاقب بحث کی جائے گی۔ جہاں تک مراسلت یا ترسیل خیالات کے انتظام یا خبررسانی کا تعلق ہے، ڈاکخانہ، برقی تار، ٹیلیفون اور لاسلکی نے جغرافی محل وقوع کے اثر کو کم کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے؛ اور جدید تجارت اور معاشی جدوجہد کے نہایت اہم لوازم بن گئے ہیں۔ اِن عاملوں میں سے بعض عامل مثلاً ڈاکخانہ اور ٹیلی گراف اس وقت ہندوستان میں کافی طور پر پھیلے ہوئے ہیں؛ اور لوگ اِن سے بخوبی روشناس ہیں، چنانچہ نقل وحمل کی اصلاح وترقی سے مل جل کر انھوں نے بھی ملک کی معاشی زندگی میں اکثر صورتوں میں تبدیلی پیدا کردی ہے۔ مہذب دنیا سے گاؤں کی علٰحدگی اب اسی طرح زیادہ تر گزرے ہوئے زمانے کی بات ہے جس طرح باقی دنیا سے ہمارے ملک کی بحیثیت مجموعی علٰحدگی۔ لیکن اس کے باوجود تجارتی معلومات واطلاعات کی اشاعت کے لیے لاسلکی کے استعمال کی حد تک، ہمارا ملک اب بھی پسماندہ حالت میں ہے؛ دوسری جانب ٹیلیفون، بجز بڑے شہروں کے، دوسرے مقاموں پر ابھی تک عام طور پر رائج نہیں ہوا ہے۔

۷ - ہندوستان کی تقسیم چار نمایاں حصوں میں۔

ہندوستان کو چار نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) جزیرہ نمائے ہند، جس میں وہ کل رقبہ شامل ہے جو کراچی سے دہلی تک اور دہلی سے کلکتے تک خط کھینچنے کی صورت میں اِس خط کے جنوب میں واقع ہے؛ (۲) دریائے سندھ وگنگا کا میدان، جو جزیرۂ نما اور کوہ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے، اور دنیا کا وسیع ترین مسطح زرعی خطہ ہے؛ (۳) ہمالیہ کا کوہستانی سلسلہ جو میدان گنگا کے شمال میں واقع ہے؛ اور (۴) برما جو مشرق میں واقع ہے۔

۸ - جزیرہ نمائے ہند

اس علاقے کی سطح مرتفع ہے، اور اِس کو دریائے سندھ وگنگا کے میدان سے بندھیاچل اور ست پوڑہ کے بسیط پہاڑی

باب ۲ سلسلے جدا کرتے ہیں۔ اس سطح مرتفع کی مشرقی سرحد "مشرقی گھاٹ" اور مغربی سرحد "مغربی گھاٹ" ہے۔ موخر الذکر بدرجہا زیادہ قابل لحاظ ہیں اور ایک دیوپیکر مسلسل بحری دیوار کا کام دیتے ہیں جن کے درمیان نہ تو کوئی وسیع وادی ہے اور نہ کوئی وسیع رخنہ بجز اس نمایاں رخنے کے جو اس کی جنوبی حد سے دو سو میل اوپر واقع ہے۔ مشرقی گھاٹ بلندی اور بزرگی میں بہت کم ہیں، اور ان میں بڑی اور وسیع وادیاں رخنہ ڈالتی ہیں؛ چنانچہ یہی وادیاں، مہاندی، گوداوری، کرشنا اور کاوری جیسے دریاؤں کے ذریعے سے خلیج بنگال میں پانی کی نکاسی کا راستہ تیار کرتی ہیں۔
مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان صرف ایک تنگ خطۂ زمین ہے جو احاطۂ بمبئی کے
11 بحری ساحل کی جانب واقع ہے؛ اس واقعے کی بناء پر سمندر سے ملک کے اندرونی حصے میں داخلہ بہت دشوار ہے، حتیٰ کہ موسم برسات میں ابر بھی اس پہاڑی سدراہ کے ادھر ہی اپنا بوجھ ہلکا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے؛ اور اس طرح اندرونی علاقے میں بارش کم ہوتی ہے اور آئے دن قحط و خشک سالی کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف مشرقی گھاٹ اور مشرقی ساحل کے مابین وسیع خطۂ زمین موجود ہے۔ چونکہ مشرقی گھاٹ کی بحری دیواریں مقابلۃً زیادہ پست ہیں؛ اس لیے موسمی ہوائیں ملک کے اندر زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر جزیرہ نما کے مشرقی حصے، جو دریاؤں کی بدولت زرخیز نشیبی زمین سے مالامال ہیں، گنجان آبادی کی کفالت کرتے ہیں؛ اور اس لحاظ سے شمالی ہند کے میدانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

جزیرہ نما کی سطح، عام طور سے ناہموار اور پتھریلی ہے؛ پہاڑیوں کی چوٹیاں جنگلی درختوں سے کم و بیش ڈھکی ہوئی ہیں؛ اور نباتات اور مناظر کے لحاظ سے متعدد تضادات پیش کرتی ہیں۔ مشرق میں پست پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چاول کی زمین کے وسیع خطے ہیں؛ مغرب میں زمین کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ (اس لیے کہ جزیرہ نما میں مغرب سے مشرق کی جانب ایسا ہی ڈھال ہے جیسا کہ مکان کی چھت کا ہوتا ہے) بارش مقابلۃً کم ہوتی ہے، اور چاول کے بجائے باجرہ اور روئی کی کاشت وسیع مرتفع سطحوں پر ہوتی ہے جہاں درختوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

۹۔ میدان گنگا و سندھ

یہ شروع سے آخر تک دریاؤں اور ملائم دریائی مٹی پر مشتمل ہے؛ اور اس میں دو بڑے دریائی نظام پھیلے ہوئے ہیں جن کا رُخ مختلف سمتوں میں ہے۔ مغرب کے پانچ دریا، جن کی بناء پر پنجاب اپنے نام سے موسوم ہوا، دریائے سندھ کے زیریں حصے میں شامل ہو کر بحیرۂ عرب میں جا گرتے ہیں۔ مشرق میں دوسرے

باب ۲

بڑے دریا، بہ شمول گنگا و جمنا، اسی طریقے سے گنگا میں جا ملتے اور خلیج بنگال میں گرتے ہیں۔ سمندر کے قریب پہنچکر ان کا پانی دریائے برہم پتر کے پانی سے مل جاتا ہے جو مشرق سے نکل کر آسام کی وادی سے ہوتا ہوا آتا ہے۔ ان دریاؤں کے پانی میں جو ملائم مٹی بہ کر آتی ہے وہ بتدریج ایک وسیع ڈلٹا کو بڑھا رہی ہے جو خلیج بنگال کے سرے پر قائم ہو گیا ہے اور جس پر شہر کلکتہ واقع ہے۔

۱۰۔ ہمالیہ اور جزیرہ نما کے دریا

ہمالیہ کے دریاؤں میں پانی سال تمام بہتا رہتا ہے، اس لیے کہ موسم گرما میں بھی ہمالیہ کی برف پگھلنے کی وجہ سے ان کو پانی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ وسیع میدانوں میں بہنے کی وجہ سے دریا کے دونوں جانب نرم زرخیز مٹی کے بڑے بڑے خطے قائم ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ زرخیز مسطح خطے قدیم آریائی تہذیب کا گہوارہ رہے ہوں، اور آجکل بھی زرعی پیداوار کے قدرتی گوداموں کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض دریا مثلاً اراوڈی، گنگا اور سندھ، کشتی رانی کے قابل ہیں؛ اور ریلوں کے رواج سے قبل کے زمانے میں تجارتی نقل و حمل کی شاہ راہ کا کام انجام دیتے تھے۔ ان دریاؤں کے پانی سے ان اہم پیداآور کارہائے آبرسانی میں کام لیا جاتا ہے جن پر پنجاب، سندھ، اور صوبہ متحدہ کی خوش حالی کا بڑی حد تک دارو مدار ہے۔ اس کے برخلاف جزیرہ نمائے ہند کے دریا، موسم بارش میں بڑے زور و شور کے ساتھ بہتے ہیں، لیکن گرمی کے موسم میں ان میں پانی کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور ان کی حیثیت محض گدلے پانی اور کیچڑ سے بھرے ہوئے نالوں کی سی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر دریا تنگ اور 12
ناہموار پتھریلے راستوں سے گزرتے ہیں اور بذریعہ کشتی عبور و مرور کو ناممکن بناتے ہیں۔ آب پاشی کا انتظام ان کے ذریعے سے بھی کیا جاتا ہے لیکن وہ اول الذکر صورت سے مختلف اور زیادہ بیش خرچ ہوتا ہے، چنانچہ دریاؤں کی وادیوں میں بارش کے پانی کو جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے مخزن تعمیر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ سب تدبیریں قلت بارش کو رفع کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں جس سے یہ خطہ وقتاً فوقتاً متاثر ہوتا ہے۔

۱۱۔ کوہستان ہمالیہ

دریائے سندھ و گنگ کے بالائی حصے پر فلک بوس کوہ ہمالیہ واقع ہے، جس کی بعض چوٹیوں کی بلندی تیس ہزار فٹ ہے۔ ہندوستان کو باقی ایشیا سے ... ۲ میل طویل کوہستانی سلسلہ جدا کرتا ہے جس کے منجملہ ایک کوہ ہمالیہ ہے جس کا طول ۱۵۰۰ میل ہے۔ شمالی ہند کے میدانوں کی آب پاشی کرنے والے بڑے

دریاؤں کے ضروری پانی کی رسد ہمالیہ کے پگھلے ہوئے برف سے مہیا ہوتی ہے۔ ہمالیہ کے دونوں سروں پر، پہاڑوں کے رُخ میں اچانک تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ان کا پھیلاؤ شرقاً و غرباً ہونے کی بجائے شمالاً جنوباً ہے اور اس طرح ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے کو ملا کر وہ تین طرف سے ہندوستان کے میدانی خطے کو گھیرے ہوئے ہیں اور ہندوستان کو افغانستان و بلوچستان سے جدا کرتے ہیں۔ گو ہمالیہ کو سیاسی حیثیت سے بھی یوں اہمیت حاصل ہے کہ وہ ایک ناقابل عبور سدّ راہ ہے؛ لیکن اس سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ ہواؤں، گرمی، سردی، رطوبت اور کاشت پر بھی اثر ڈالتا ہے، اور اس طرح معاشی حالات کو بہت نمایاں طریقے پر متاثر کرتا ہے۔ باب ۲

۱۲ - برما

آخر میں، برما، جو مشرق میں واقع ہے، در اصل ایک جداگانہ جزیرہ نما کا جزو ہے۔ اس کی حالت ہندوستان خاص سے اکثر صورتوں میں مختلف و متضاد ہے، اور وہ حال حال تک سیاسی لحاظ سے بھی ہندوستان سے الگ رہا۔ اراوڈی کی زرخیز وادی، برمی قوم کا اصلی وطن ہے۔ یوں تو برمی، ارتباط قومی کے ذریعے سے اطراف و اکناف کے پہاڑی علاقوں کی جنگلی قبائلی آبادی سے ملتے جلتے ہیں؛ لیکن ان میں ایک اعلیٰ درجے کی تہذیب و مدنیت پائی جاتی ہے جو عام نقطۂ نظر سے اور معاشرتی تنظیم کے لحاظ سے ہندوؤں کی تہذیب و تمدن سے مختلف ہے۔ برما میں، جنگلوں اور معدنی دولت کے وسیع قدرتی ذرایع موجود ہیں جن سے بے شمار معاشی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

۱۳ - طبیعی و موسمی اختلافات

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بہت بڑے بڑے طبیعی و موسمی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شمال میں برف سے ڈھکی ہوئی خوش نما پہاڑی بلندیاں اور دائمی عزلت میں بہنے والے برفانی دریا ہیں۔ ان بلندیوں کے دامن میں نشیبی دریائی وادیوں کے ہموار اور وسیع خطے یا تو ریتیلے، خشک اور گرمی سے تپتے ہوئے میدان ہیں یا مرطوب ہوا کے تحت مزروعہ اور پُر از آب علاقے۔ جنوب میں ایک بڑی مرکزی سطح مرتفع ہے جہاں خود رو جنگل اب بھی قدیم وحشی منتشر قبائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ مغربی حصے میں، شکستہ اور ناہموار پہاڑیاں اور بُرج نما کھڑی اونچی چٹانوں کے سلسلے بحر ہند کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں؛ اور جنوب میں سبزے سے ڈھکے ہوئے مرتفع، ہموار اور ڈھلوان خطے ہیں۔[ف]
18 چنانچہ ایک ایسے شخص کے نزدیک جس نے ہندوستان کے متعلق جنوبی بنگال میں

ف امپیریل گزٹیر جلد اول صہ ۱

باب ۲ معلومات حاصل کی ہوں، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کی آب و ہوا تقریباً دائمی طور سے گرم اور مرطوب ہے؛ نباتات بکثرت ہے؛ دریاؤں، تالابوں، چاول کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں کی بہتات ہے؛ شہروں کی تعداد کم ہے؛ لیکن آبادی بہت گنجان ہے اور باشندے نرم دل اور کم ہمت ہیں"۔ یہاں سے آگرہ یا لاہور کی جانب بڑھیے تو "دنیا کے بہترین سبزہ زاروں اور مرطوب ترین ممالک میں سے کوئی ملک ملنے کے بجائے اوائل گرما میں سب سے زیادہ خشک اور بھورے رنگ کا علاقہ نظر آئے گا، جس کو لو اور گرم ہوائیں بھٹی بنا کر رکھ دیتی ہیں، جس کے موسم سرما میں سردی اچھی اور صحت بخش ہوتی ہے لیکن یہاں کے ہزاروں مربع میل خطوں پر بنگال کی حارہی نباتات کی جگہ، گیہوں، جو اور کرۂ معتدل کی پیداوار کی کاشت لیتی ہے۔ یہ مشہور شہروں اور خوشنما یادگاروں کا ملک ہے، جس کے باشندے طاقتور اور بلند حوصلہ ہیں۔

حوادث فضائی کے لحاظ سے ہندوستان کے حالات دنیا کے کسی دوسرے علاقے کے مقابلے میں بہت زیادہ نوعی اختلافات رکھتے ہیں، یعنی ایک ہی ملک میں گرم و معتدل ممالک کے حالات نہایت نمایاں طریقے پر ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں"۔ باہر کی جانب سے دو ملحقہ رقبے ہندوستان کو متاثر کرتے ہیں۔ شمال میں، کوہستان ہمالیہ اور سطح مرتفع افغانستان، وسط ایشیا کی آب و ہوا پیدا نہیں ہونے دیتے، اور براعظم کی سی آب و ہوا پیدا کرتے ہیں، جس کی خصوصیات میں ارضی ہواؤں کا چلنا، بہت زیادہ خشک ہوا، ان کے بڑے حصے میں حرارت کی موجودگی، رطوبت و بارش کی کمی یا عدم موجودگی داخل ہیں۔ جنوب میں، سمندر بحری آب و ہوا پیدا کرتا ہے، جس کی خاص خصوصیات میں حرارت کی عظیم یکسانی، دن کے قلیل حصے میں حرارت، ہوا کی کثیر رطوبت، اور کم و بیش جلد جلد بارش شامل ہیں۔ سردی کے موسم میں حرارت کا اوسط جنوبی ہند کے مقابلے میں پنجاب میں تقریباً تیس درجے کم ہوتا ہے۔ پنجاب، صوبۂ متحدہ اور شمالی ہند کی آب و ہوا عام طور سے ربیع وریرا کی آب و ہوا سے مشابہت رکھتی ہے، جس کا مطلع بے ابر صاف اور روشن ہوتا ہے، اور موسم ٹھنڈا اور خشک رہتا ہے۔ جنوبی ہند میں مشرقی ساحل کے مقابلے میں مغربی ساحل زیادہ گرم ہوتا ہے اور کرشنا کے منبع کے اردگرد حرارت انتہائی حالت میں پائی جاتی ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور

۱ دیکھو سر جان اسٹریچی کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان: اس کا نظم ونسق اور اس کی ترقی" چوتھا اڈیشن ص ۳ تا ص ۵۔

باب ۲

مدراس کی آب و ہوا سمندر کے قرب کے باعث معتدل ہے، لیکن کلکتے میں موسم سرما میں خوب سردی ہوتی ہے جس سے احاطہ ہائے مدراس و بمبئی کے دوسرے شہر نا آشنا ہیں، برخلاف اس کے گرمی کے موسم میں کلکتے کی گرمی نسبتہً زیادہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

۱۴۔ ہندوستان کے موسم

پنجاب میں موسم گرما کا آغاز باضابطہ طور پر ۱۵ مارچ سے ہوتا ہے اور اسی تاریخ سے جون میں بارش کے آغاز تک حرارت بتدریج بڑھتی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ سورج کی شعلہ سا کرنیں زمین کو تپا دیتی ہیں۔ اس موسم میں جزیرہ نما کے اندرونی حصے اور شمالی ہند میں گرمی زیادہ ہوتی ہے؛ اور حرارت کی حد تک شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مابین تضاد نہیں ہے، بلکہ اندرونی ملک اور ساحلی خطے بہ شمول ملحقہ رقبہ جات 14
ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دکن اور صوبۂ متوسط کے بڑے حصے کو گرم ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے، گو مئی کے مہینے میں سب سے زیادہ حرارت بالائی سندھ، شمال مغربی راجپوتانے اور جنوب مغربی پنجاب میں ہوتی ہے جبکہ آباد میں آلۂ حرارت بالبعض اوقات سایہ میں ۱۲۵ درجے گرمی بتلاتا ہے۔
ہندوستان میں، جہاں کہیں واضح طور سے متعین موسم پائے جاتے ہیں ان کی تعداد تین ہے:۔ (۱) سرد و خشک موسم یعنی موسم سرما؛ جبکہ شمالی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں، اور بجز شمالی صوبوں کے، جہاں ابر و باد کے معتدل قسم کے طوفان گاہ گاہ رونما ہوتے ہیں، دوسرے مقاموں پر بارش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے؛ (۲) مرطوب موسم جس میں گرما کی جنوب مغربی موسمی ہواؤں کی آمد آمد کے ساتھ ہی سخت تکلیف دہ گرمی ہوتی ہے؛ اور (۳) عام طور پر اچانک اور موسلادھار بارش کے آغاز سے پیشتر کا گرم و خشک موسم۔

۱۵۔ بارش

معمولی سالانہ بارش کی مقدار مختلف مقاموں پر مختلف درجے ہوتی ہے، مثلاً چیراپونجی میں جو آسام کے پہاڑوں میں واقع ہے، ۴۶۰ انچ، تو شمالی سندھ میں تین انچ سے بھی کم ہوتی ہے۔ موسمی اعتبار سے جزیرہ نمائے ہند، ایشیا کے عظیم "مون سونی" رقبے کا ایک جزو ہے، اور اس رقبے کے کسی دوسرے جزو کے مقابلے میں "مون سونی" تنظیم کو بہت زیادہ مکمل شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ "مون سون" کی اصطلاح فنی حیثیت سے ہواؤں کی اس رجعت پر صادق آتی ہے جو کل "مون سونی" رقبے میں واقع ہوتی ہے اور جو سال کے موسموں کو دو نمایاں دوروں میں تقسیم کرتی ہے، ایک جنوب مغربی مون سون کا دور، اور دوسرے شمالی مشرقی مون سون کا دور۔ حقیقت یہ ہے کہ جنوب مغربی مون سون، جنوب مشرقی تجارتی ہواؤں کا پھیلاؤ ہے جو خط استوا کو عبور کرنے کے بعد

باب ۲

دائیں جانب مڑ جاتی ہیں، اور اس طرح جنوب مغربی ہوائیں بن جاتی ہیں۔ جولائی تک یہ سارے ہندوستان پر پوری طرح چھا جاتی ہیں؛ دکن میں ہوائیں عام طور پر جنوب مغربی، گنگا کے ڈیلٹا میں جنوبی، اور اوپر ہٹ کر گنگا کی وادی میں جنوب مشرقی ہوتی ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی میں سب سے آخر میں یہ ہوائیں پہنچتی ہیں، اور سب سے پہلے یہاں سے ہٹ جاتی ہیں، چنانچہ یہاں بارش کی سالانہ مقدار بہت ہی کم ہے۔ برسات سب سے زیادہ مغربی گھاٹ، ہمالیہ اور برما میں ہوتی ہے جہاں زمین کی بلندی کی وجہ سے اس میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ستمبر میں مون سون کی شدت میں تیزی کے ساتھ کمی شروع ہو جاتی ہے، اور اس مہینے کے تقریباً وسط کے بعد شمال مغربی ہندوستان کے بڑے حصے میں بارش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد معتدل قسم کی شمال مشرقی ہوا استقلال کے ساتھ چلنا شروع ہوتی اور بتدریج سارے خلیج بنگال پر پھیل جاتی ہے۔ اس طرح اس کو "شمال مشرقی مون سون" کہتے ہیں۔ اس "مون سونی" تنظیم کی بدولت ہندوستان کی بارش میں معین دوریت پائی جاتی ہے اور اس کے باعث موسمی اعتبار سے سال کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:—

(ا) جنوب مغربی مون سون کا موسم: (۱) وسط جون سے وسط ستمبر تک یعنی عام بارش کا موسم۔ (۲) وسط ستمبر سے وسط دسمبر تک موسمی ہواؤں کے لوٹنے کا زمانہ۔

(ب) شمال مشرقی مون سون کا موسم:— (۱) جنوری اور فروری یعنی موسم سرما۔ (۲) مارچ تا وسط جون یعنی موسم گرما۔ جون میں خاص قسم کی فصلیں بوئی جاتی ہیں اور خزاں میں کاٹی جاتی ہیں، مثلاً چاول، روئی، باجرہ وغیرہ۔ اسے "فصل خریف" کہتے ہیں۔ فصلوں کی دوسری قسم اس وقت بوئی جاتی ہے جبکہ مون سون ختم ہو جاتا ہے یعنی تقریباً وسط ستمبر میں، مثلاً گیہوں، جو، السی وغیرہ۔ یہ فصل جنوری و مارچ کے مابین کاٹی جاتی ہے؛ اس کو "فصل ربیع" کہتے ہیں۔

۱۶۔ بارش کی اساسی اہمیت

یہ سارے ہندوستان کی موسمی و زرعی حالت کا محض عام بیان ہے جو ملک کے کسی خاص حصے پر چند شرائط و مستثنیات کے ساتھ صادق آتا ہے، لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ملک کے لیے موسمی بارش کتنی اہمیت رکھتی ہے؛ چنانچہ اس کی مقدار و تقسیم اور بر وقت آمد پر لاکھوں انسانوں کی تباہی و خوشحالی کا دار و مدار ہوتا ہے[1]۔ غالباً دنیا کے کسی خطے میں ہر شعبۂ زندگی پر بارش کا اس قدر

[1] سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی مہینہ ہندوستان کے بقاء حیات کی آزمائش ہوتی ہے اور وہ بہت شاذ

باب ۲ گہرا اثر نہیں پڑتا جس قدر کہ ہندوستان میں۔ یہاں زندگی سب سے اول زراعت پر منحصر ہے' زراعت کا انحصار سراسر بارش پر ہے' اور بارش قریب قریب سب کی سب جنوب مغربی موسمی ہواؤں کے ذریعے سے ہوتی ہے؛ چنانچہ ہندوستان میں ۹۰ فیصد بارش اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ جنوب مغربی سون سون' اس نقطۂ نظر سے شمال مشرقی سون سون کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اہم ہے' اور اس لحاظ سے اس کو ہندوستانی زندگی کا مرکز و محور کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی بارش کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تسلسل نمایاں طور پر غائب ہوتا ہے۔ انگلستان کو لیجئے' یہاں سال کے کسی حصے میں بھی بارش کی توقع ہو سکتی ہے' لیکن ہندوستان میں وہ بعض معین موسموں تک محدود رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں بارش کا بیشتر حصہ موسلا دھار ہوتا ہے' اور پانی زمین میں جذب ہوئے بغیر اوپر ہی اوپر بہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے زمین پوری طرح تر یا نم نہیں ہونے پاتی' جگہ جگہ پھل جاتی ہے اور پانی گڑھوں میں اس طرح جمع ہو جاتا ہے کہ بہنے نہیں پاتا۔

مختلف مقامات میں بارش کی سالانہ مقدار کی عدم یکسانی' مندرجۂ ذیل تقسیم کی بنیاد قرار دی گئی ہے:- (۱) ایسے رقبے جن میں حکمی طور پر بارش ہوتی ہے' مثلاً برما' آسام' مشرقی و جنوبی بنگال' اور وہ خطہ جو مغربی گھاٹ اور بحیرۂ عرب کے مابین اور جزیرہ نما کے انتہائی جنوبی نقطے سے شروع ہو کر ضلع سورت کی جنوبی سرحد تک پھیلا ہوا ہے؛ (۲) وہ رقبے جن میں بارش پُرخطر طریقے پر کم ہوتی ہے' یعنی دس انچ سے لیکر تیس انچ تک مثلاً اودے پور' اجمیر' اور مغربی گھاٹ کو خارج کر کے' بمبئی دکن؛ (۳) وہ رقبے جو خشک سالی سے متاثر رہتے ہیں' جہاں آب پاشی کے بغیر کاشت بڑی حد تک پُرخطر اور بعض صورت میں غیر ممکن ہے' مثلاً شمالی سندھ' مغربی راجپوتانہ' مغربی پنجاب وغیرہ۔

16 **۱۷- آب و ہوا** ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق کوئی عام کلیہ اس لیے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' اس کے حدود کے اندر تقریباً ہر اس قسم کی انتہائی آب و ہوا پائی جاتی ہے جس سے خطِ سرطان و جدی کا درمیانی خطہ یا منطقہ معتدل مانوس ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کسی نقصان کے بغیر اس سے بچ نکلتا ہے۔ دیکھو نلس (L. e. A. Knowles) کی کتاب موسوم بہ "برطانوی سلطنت ماورائے بحر کی معاشی ترقی" (the Economic clefselopment of the British overseas Empire) مطبوعۂ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ صفحہ ۲۰۔

باب ۲

یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نیم گرم یا نیم جاری ہے؛ انسانی جسم پر اس کا تھکا دینے والا اثر پڑتا ہے، اس کے برخلاف منطقہ ہائے معتدل کی آب و ہوا کا صحت بخش اثر پڑتا ہے، اسی لیے اس کے مقابلے میں اول الذکر آب و ہوا میں آبادی کی صحت و تندرستی خراب ہوتی ہے۔ چنانچہ آب و ہوا کا زیادہ موافق ہونا ہی ہندوستانی مزدور کے مقابلے میں یوروپی مزدور کی کارکردگی کے تفوق کے اسباب میں سے کم از کم ایک سبب ہے۔ اس سلسلے میں آب و ہوا کے اثر کو گو مبالغے کے ساتھ بیان نہ کرنا چاہیے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس کا اثر پڑتا ہے۔

۱۹۔ گرم آب و ہوا معاشی ترقی کے اعتبار سے

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ خطوط سرطان و جدی کے درمیانی خطوں میں قدرت ذریعۂ معاش مقابلتہً بہت آسانی کے ساتھ مہیا کرتی ہے اور انسان کو بہت کم محنت کرنی پڑتی ہے؛ علاوہ ازیں ان خطوں میں انسان کی ضرورتیں منطقۂ معتدلہ کے ملکوں کے مقابلے میں بہت مختصر ہوتی ہیں؛ چنانچہ قدرت انسان کو دائمی طور پر جد و جہد کرنے اور اپنی قوت و قابلیت اور عاقبت اندیشی سے پوری سرگرمی کے ساتھ کام لینے سے باز رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے منطقہ ہائے معتدلہ میں ہر چیز کی ویسی افراط و بہتات نہیں ہوتی جیسی کہ گرم ممالک میں، اور سخت محنت کیے بغیر کوئی شے حاصل نہیں ہوتی۔ چونکہ کام کرنا عام طور پر اور ہر حیثیت سے ضروری ہوتا ہے؛ اس لیے محنت کا وقار بڑھ جاتا ہے، اس کی اجرت زیادہ ملتی ہے اور کام کرنے والے ذہین اور آزاد ہوتے ہیں۔ چونکہ سرمایں کڑاکے کا جاڑا ہوتا ہے اور تیز و تند ہوائیں چلتی ہیں، اس لیے موسم گرما ہی میں لباس، غذا اور مکان کی تیاری کے لیے پیش خیالی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان علاقوں کی بود و باش، منظم کام، استقلال اور مشقت چاہتی ہے؛ اور اگر یہ شرطیں پوری ہوں تو ان سے ایک اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن کی ترقی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

بایں ہمہ پروفیسر کار ساونڈرس نے حال میں اس خیال کی مخالفت کی ہے کہ "جب قدرت بہت زیادہ آسانی کے ساتھ صلہ دیتی ہے تو معاشی ترقی اور تہذیب و تمدن پسماندہ حالت میں رہتے ہیں"۔ اس کے برخلاف وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ان مقامات میں جہاں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے مفید اور کارآمد اشیا کی بہتات و افراط ہوتی ہے وہاں، ان کے افادے کو محسوس کرنے کا زیادہ موقع ہوتا ہے اور یہ کہ مہارت کی اصلاح و ترقی کے باعث وہیں فی کس زیادہ سے زیادہ حاصل وصول کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے زرخیزی جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی مہارت کی

زیادہ ترغیب ہوگی"۔[۵] خواہ کچھ ہی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی گرم آب وہوا یا زرخیزی اس ملک کی گزشتہ شاندار تہذیب اور تمدن کی ترقی کی راہ میں مانع نہیں رہی۔ اہلِ ہند کی موجودہ پسماندہ حالت اور عدم توجہی، غفلت اور بے پروائی وغیرہ خصوصیات کی توجیہ ملک کی آب وہوا یا قدرت کی فراوانی سے کرنے کے بجائے دوسرے اسباب سے کرنی چاہیے۔ باب ۲

۱۹۔ جنگلات

ہندوستان کے عمدہ جنگلات اس کے سب سے زیادہ قیمتی قدرتی ذرائع میں شمار کرنے چاہئیں۔ ملک کے جنگلوں کا انحصار بہ لحاظ نوعیت زیادہ تر بارش اور بلندی پر ہے۔ جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں تاڑ، فرن، بانس اور ربڑ وغیرہ کے سدابہار جنگل پائے جاتے ہیں۔ جہاں اس سے کم تر ہوتی ہے وہاں، ساگوان، سال اور دوسری انواع و اقسام کی قیمتی لکڑی کے جنگل ملتے ہیں۔ جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے وہاں، نباتات کمیاب ہوتے ہیں اور وہ بھی تمرہندی اور اقاقیا وغیرہ کے درختوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہمالیہ میں قطب شمالی کے نیچے کے گرم ممالک کے حالات پائے جاتے ہیں اور جنگلات میں بلندی کے لحاظ سے سرو، صنوبر، بلوط، شاہ بلوط، مگنولیا، بانس وغیرہ کے درخت ہوتے ہیں۔ تمام ممالک کا یہ تجربہ ہے کہ جنگلوں کی ازسرِنو روئیدگی و ترقی کے قدرتی عمل انسان کی تباہ کاری کے قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لحاظ سے حکومت نے اس کو عام طور پر ضروری پایا ہے کہ ملک کے مستقبل اغراض کے لیے خاص تدبیریں اختیار کرے، تاکہ جنگل خلاف احتیاط تباہ کاری سے محفوظ رہیں۔ اگرچہ یہ سوال کہ آیا جنگلات کو کسی خاص ملک میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس حد تک ہے، اس کا انحصار بعض خاص حالات پر ہے، مثلاً ملک کی حیثیت و حالت، اس کے وسائل آمد و رفت، زمین کو جنگل اگانے کے علاوہ دوسرے کاموں میں لانے کے امکانات، آبادی کی ناگزیر ضروریات اور شغل اصل کے لیے سرمائے کی ممکنہ مقدار وغیرہ۔ لیکن پھر بھی اتفاق آرا اس پر ہے کہ ہندوستان کے جنگل ایک بیش قیمت قومی اثاثہ ہیں اور ان کی مناسب طریقے پر حفاظت کرنا حکومت ہند کے اہم ترین معاشی فرائض میں سے ایک ہے۔

۲۰۔ جنگلات کا افادہ

انسانی و قدرتی سیشتہ میں جنگلات براہِ راست اور بالواسطہ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ جنگلوں کے بالواسطہ

---

[۵] دیکھو اے ایم کار سانڈرس کی کتاب موسوم بہ "مسئلۂ آبادی" (The Population Problem) صفحہ ۲۴۲

باب ۲ فوائد حسب ذیل ہیں :- (۱) یہ آب و ہوا میں اعتدال پیدا کرتے ہیں، ہوا کی اضافی رطوبت میں اضافہ کرتے ہیں، بخارات میں کمی کرتے ہیں اور بارش کی مقدار میں اضافہ کرتے ہیں؛ (۲) پانی کی رسد کی تنظیم میں مدد دیتے ہیں، چشموں میں پانی کی رسد کو بہتر طریق پر برقرار رکھتے ہیں، طغیانی اور سیلاب کو روکتے ہیں اور دریاؤں میں پانی کے بہاؤ کو زیادہ تسلسل کے ساتھ جاری رکھتے ہیں؛ (۳) وہ زمین کی زرخیزی کو بڑھاتے ہیں، اس لیے کہ وہ معدنی زمینوں کو بھی زراعت کے لیے موزوں زرخیز چکنی مٹی بنانے میں مدد دیتے ہیں؛ (۴) وہ ہوائی لہروں کی شدت میں کمی کر دیتے ہیں، ملحقہ کھیتوں کو خشک یا سرد ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں، اور مویشیوں، وحشی جانوروں، چرندوں اور کارآمد پرندوں کو محفوظ رکھتے ہیں؛ (۵) بعض شرائط و حالات کے تحت وہ کسی ملک کی آب و ہوا کو خوشگوار اور صحت بخش بنانے اور اس کی حفاظت کرنے میں مدد دے سکتے ہیں؛ (۶) وہ ملک کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں اور باشندوں پر مفید جمالیاتی اثر ڈالتے ہیں۔

18 جنگلات کا براہِ راست افادہ ان کی پیداوار کے باعث ہے؛ مثلاً جلانے کی لکڑی، چوبینہ اور اشیائے خام جو مختلف صنعتوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک اور اہم فائدہ خاص کر ہندوستان میں یہ ہے کہ وہ مویشی کی چراگاہ کا بھی کام دیتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے جنگلوں کی حفاظت میں سخت خلل واقع ہو۔ لہذا ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جنگل کے رقبے کے ایک جزو کو چرائی کے لیے پوری طرح مسدود کیا جاتا ہے؛ ایک جزو میں صرف بعض جانوروں مثلاً بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے کی ممانعت کر دی جاتی ہے، اور ایک وسیع رقبے کو ہر قسم کے جانوروں کے چرنے کے لیے کھلا رکھا جاتا ہے۔ معمولی سالوں میں جو رقبے مسدود کیے جاتے ہیں ان میں خشک سالی اور قحط کے زمانے کے لیے چارہ کے ذخائر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اِس زمانے میں یا تو چرانے کی ممانعت ہٹالی جاتی ہے یا گھاس کاٹ لی جاتی ہے اور اُن علاقوں میں روانہ کی جاتی ہے جہاں اس کی سخت ضرورت ہو۔ یہ شکایت عام طور سے سنی گئی ہے کہ ہندوستان میں جنگلات کا انتظام، زرعی آبادی کے حق میں غیر ہمدردانہ ہے اور جنگل کی حفاظت و ترقی کے فرض کو مناسب طریق پر انجام دینے میں کوتاہی کیے بغیر آبادی کی ضرورتوں کو جیسا کہ چاہیے پورا نہیں کیا جاتا محکمۂ جنگلات اور زراعت و امداد باہمی کے سب سررشتوں میں جن کا تعلق مزارعین کی بہبود سے ہے، تعامل

وتعاون کی ضرورت ہے، تاکہ دو متضاد نقطہ ہائے خیال میں مطابقت پیدا ہو۔ اگرچہ صحراداری کا اصلی کام جنگلات کی حفاظت و ترقی ہے، لیکن ہمیں اِس واقعے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایک اہم پیشے اور ذیلی صنعت کے طور پر وہ زراعت سے بھی وابستہ ہے؛ اس لیے کہ جنگلات سے کسان کی اکثر ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، مثلاً جلانے کی لکڑی جو ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والے کھاد کی جگہ لے گی، مکانوں کے لیے معمولی چوبینہ، آلات اور اوزار کے لیے لکڑی اور مویشیوں کے لیے چارے کی بہم رسانی۔ یہ وہ مراعات اور سہولتیں ہیں جن کا کسان صدیوں سے خوگر رہا ہے اور جن کی اچانک موقوفی کے خلاف وہ غم و غصے کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خلاف قاعدہ اور حد سے زیادہ ناگوار ہے۔

جنگلات کے افادے کو کسان کے لیے بڑھانے اور اس کو جنگلات کے نظم و نسق پر روشن خیالی کے ساتھ نظر ڈالنے کے قابل بنانے کے مدنظر کمیشن نے سفارشیں پیش کی ہیں، جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:- (۱) ہر صوبے میں جنگلات سے استفادے کے لیے ایک افسر کا تقرر، جس کا سب سے بڑا کام جنگلات کی صنعتوں کو فروغ دینا ہو، اس لیے کہ یہ معاملہ کسانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، خاص کر ان کے لیے جو جنگلات کے قرب و جوار میں رہتے بستے ہیں۔ (۲) جنگل کے رقبوں کی از سرِ نو تقسیم، مثلاً: (أ) ایک بڑا ڈویژن جو تجارتی جنگلات یا ایسے جنگلوں کی نگرانی کرے جن کا وجود طبیعی و موسمی اعتبارات سے ضروری ہو (ب) چھوٹا ڈویژن جس کی نگرانی میں چھوٹے جنگل ایندھن کے نخلستان، دیہاتی بن، اور افتادہ زمینیں ہوں؛ اور چراگاہی سے کم و بیش بھرے ہوئے رقبوں کو جو اس وقت محکمۂ جنگلات کے تحت ہیں، دیہی انتظام کے تفویض کر دیا جائے، اور حکومت مدراس کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کے مطابق عوام کی نمایندہ کمیٹیاں یا پنچایتیں ان کی نگرانی کریں۔ (۳) جملہ نئے بھرتی شدہ افسرانِ جنگلات کے لیے زرعی کالجوں میں کچھ مدت کے واسطے نصاب کی تکمیل لازمی کر دی جائے تاکہ محکمہ جات جنگلات و زراعت کے مابین زیادہ قریبی تعلق و تعاون پیدا ہو[1]۔

19 ## ۲۱ - جنگلات کی حفاظت

ہندوستان میں برطانوی دورِ حکومت سے بیشتر ہی سے صدیوں تک جنگلوں کی خلاف احتیاط

[1] دیکھو شاہی زرعی کمیشن کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۲۸ء پیراگراف ۲۲۹ تا ۲۳۳۔

باب ۲

تباہ کاری کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانوی حکومت کے ابتدائی سالوں میں یہ تباہ کاری متعدد عاملوں کے باعث بہت بڑھ گئی، مثلاً اضافۂ آبادی، مویشیوں کی تعداد میں اضافہ، زراعت کی توسیع، اور ریلوں کی جانب سے چوبینہ اور جلانے کی لکڑیوں کی مانگ کی کثرت۔ آخر میں حکومت نے جنگلات کی تباہی کے اس خلاف احتیاط عمل کو روکنے کی ضرورت کو محسوس کیا، چنانچہ جنگلوں کی حفاظت کی پہلی منظم تدبیریں لارڈ ڈلہوزی کے دورِ حکومت میں تقریباً ۱۸۵۵ء میں اختیار کی گئیں۔ اُس زمانے میں جنگلات کے محافظوں کے عہدے بمبئی، مدراس اور برما میں موجود تھے اس کے فوراً بعد ہی دوسرے تقررات بھی عمل میں آئے اور ۱۸۶۴ء میں ایک منظم سرکاری محکمہ صدر ناظم جنگلات کے تحت قائم ہوا۔ اس کے بعد سے ہندوستان کا محکمۂ جنگلات ترقی کر رہا ہے چنانچہ اس وقت برطانوی ہند کے مجموعی رقبے کے $\frac{1}{5}$ حصے سے زیادہ اس کی نگرانی میں ہے۔ ۱۸۹۴ء میں حکومتِ ہند نے ایک اہم گشتی جاری کی جو جنگلات کے بارے میں سرکاری پالیسی کی بنیاد قرار پاتی ہے۔ اس کی رو سے جنگلوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا، (۱) وہ جنگل جن کا تحفظ موسمی یا طبیعی بنیادوں پر ضروری ہے؛ (۲) وہ جنگل جن سے تجارتی اغراض کے لیے قیمتی چوبینہ دستیاب ہو؛ (۳) چھوٹے جنگل یا بن جن میں ایسے خطے شامل ہیں جو اگرچہ حقیقت میں جنگل ہوں، لیکن ان میں گھٹیا قسم کا چوبینہ پیدا ہوتا ہو یا اعلیٰ قسم کی لکڑی ہی کم مقدار میں پیدا ہوتی ہو؛ اور (۴) چراگاہیں اور رمنے جو عام طور پر محض برائے نام جنگل ہوتے ہیں۔[1]

۲۔ ہندوستان میں جنگلات کا رقبہ

تمام صوبوں[2] کا مجموعی رقبہ ۱۱۰۱۹۰۲ مربع میل ہے، جس سے منجملہ جنگلات کا رقبہ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۲ء میں ۲۴۵۸۳۱ مربع میل یا ۲۲٫۳ فی صد تھا۔ جنگلات کے اس رقبے میں سے ۱۰۵۹۶۰ مربع میل "محفوظ (Reserved) جنگلات"، ۶۶۸۲ مربع میل "مامون (Protected) جنگلات"، اور ۱۳۳۱۸۹ مربع میل "غیر تبویب یافتہ سرکاری جنگلات" تھے۔[3] جنگلات کی تقسیم تین حصوں میں یعنی محفوظ، مامون اور غیر تبویب یافتہ

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۲۸ء پیراگراف ۲۱۵۔

[2] ان صوبوں سے دہلی کے اطراف کا علاقہ اور رانی پورا (وسطی ہند) کا برطانوی پرگنہ خارج ہے۔

[3] غیر تبویب یافتہ سرکاری جنگلات یا "جنگلات عامہ کی زمینیں" میں اکثر صوبوں میں کل غیر آباد بنجر زمین جو

سرکاری جنگلات اسی ترتیب کے لحاظ سے ہے جس ترتیب سے حکومت استعمال کرنے والے افراد اور عوام کے حقوق کے بارے میں اپنے اختیارات سے کام لیتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ تا سنہ ۱۹۳۲ میں مختلف صوبوں میں جنگلات کے رقبوں کی اضافی اہمیت کا اندازہ مندرجۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے جس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ برما اور آسام اس اعتبار سے اہم ترین بڑے صوبے ہیں۔ باب۲

صوبہ	صوبے کے کل رقبے کے مقابلے میں جنگلات کا تناسب	صوبہ	صوبے کے کل رقبے کے مقابلے میں جنگلات کا تناسب
مدراس	۱۱،۲	سی، پی و برار	۱۹،۶
بمبئی	۱۲،۰	آسام	۳۶،۸
بنگال	۱۴،۰	شمال مغربی سرحدی صوبہ	۱،۸
صوبۂ متحدہ	۴،۹	برطانوی بلوچستان	۱،۸
پنجاب	۵،۴	اجمیر مرواڑا	۵،۱
برما	۵۳،۵	کرگ	۳۳،۹
بہار و اڑیسہ	۳،۶	انڈمان اور نکوبار	۹۹،۶

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بالعموم درختوں سے عاری ہوتی ہے شامل ہے۔ اس لحاظ سے مذکورۂ بالا اعداد و شمار ملکی کے جنگلوں کے رقبے کی لازمی طور سے نمایندگی نہیں کرتے۔

باب

ہندوستان کے بڑے جنگلات کے رقبے زیادہ تر پہاڑیوں میں واقع ہیں لیکن میدانوں میں بھی نخلستان اور بن موجود ہیں جن کے درمیان کہیں کہیں کاشت کی زمین ہوتی ہے۔ جیسا کہ مذکورۂ بالا جدول سے ظاہر ہوتا ہے جنگل کی بین صوبہ جاتی تقسیم نمایاں طور پر بے قاعدہ ہے۔ علاوہ ازیں بیشتر حصہ بنجر زمین پر مشتمل ہے جو عام طور پر سب گاب درختوں سے عاری ہے۔ یہ دو خصوصیات زرعی آبادی کی کل ضرورتوں کو پورا کرنے کی مشکلات میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

۲۳۔ جنگلات کے نظم و نسق کا مقصد۔

جنگلات کے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ ان کی تباہی کی رفتار کو ان کی روئیدگی کی رفتار سے متجاوز نہ ہونے دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی پیداآور صلاحیت کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ ان دونوں مقصدوں کی تکمیل میں حکومت بحیثیت مجموعی پوری طرح کامیاب رہی ہے۔ ہندوستان کے محکمۂ جنگلات کے وجود میں آنے کے بعد ابتدائی پچاس سال تک معاشیات جنگلات کی تحقیق کی امکانی قدر و قیمت کو تسلیم نہیں کیا گیا، اور تحقیق کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے کسی قسم کی بھی تدابیر اختیار نہیں کیں۔ تاہم ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈیرہ دون ایک فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا؛ اور اس کے بعد سے ۱۹۱۸ء کے ہندوستانی صنعتی کمیشن کی سفارشوں کی بموجب اس انسٹیٹیوٹ میں کچھ سال ادھر بہت کچھ توسیع ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر متعدد و بیش بہا تحقیقاتی کام شروع کیے گئے ہیں اور سائنسی اور علمی معلومات میں مستقل ترقی ظاہر ہو رہی ہے جو آخرکار ہندوستانی جنگلات کی خام پیداوار کے بہتر اور زیادہ مکمل استفادے کی جانب رہبری کرے گی۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں جنگلات سے چوبینہ اور جلانے کی لکڑی کی اوسط پیداوار 21
۳۰۵۹۱۱۵۲۸ مکعب فٹ تھی، گھٹیا پیداوار کی فروخت سے ۲۹،۲۷،۱۳،۱۰۱ روپیہ وصول ہوئے؛ اور سرکار کو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء کے دو کروڑ ۶۵ لاکھ روپیہ کے مقابلے میں

۱؎ Forest Research Insitute

۲؎ فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے کاروبار کے تفصیلات کے لیے دیکھو ایک پمفلٹ موسوم بہ ہندوستان ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء میں" صفحہ ۱۲۱ تا صفحہ ۱۲۴؛ "ہندوستان ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں" صفحہ ۱۵۲ تا صفحہ ۱۵۵؛ "ہندوستان ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں" صفحہ ۸۴ تا صفحہ ۸۶؛ اور "ہندوستان ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں"۔

ایک کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ خالص منافعہ وصول ہوا۔ آمدنی کی اس کمی کا باعث تجارتی کساد بازاری تھی۔ برما کے جنگل ہندوستانی جنگلات میں سب سے بڑے اور اہم ترین ہیں؛ چنانچہ سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ میں ساگوان کی پیداوار ہی سے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کی خالص آمدنی وصول ہوئی۔

۲۴۔ ہندوستانی جنگلات، اشیائے خام کی فراہمی کے اعتبار سے۔

ہندوستانی جنگلات، مختلف صنعتوں کے لیے ضروری اشیائے خام فراہم کرکے اور اشخاص کی کثیر تعداد کے لیے روزگار پیدا کرکے بھی ایک اہم کام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ جنگل میں ایسی آبادی کثیر ہے جس کا ذریعۂ معاش براہ راست جنگلات کی پیداوار ہے۔ علاوہ ازیں لکڑہاروں، آرہ کشوں، گاڑی بانوں، حمالوں اور چوکھٹا تیار کرنے والوں وغیرہ کی تعداد بھی خاصی بڑی ہے جو جنگلوں میں یا ان کے نزدیک کام کرتے ہیں۔ آخر میں وہ لوگ ہیں جو جنگلات کی پیداوار خام سے کام لینے میں مصروف ہیں، مثلاً نجار، پھیا بنانے والے، کشتی ساز، رسی بانٹنے والے، دباغت کرنے والے اور لاکھ بنانے والے وغیرہ۔

۲۵۔ جنگل کی پیداوار کبیر و صغیر

جنگل کی پیداوار کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) پیداوار کبیر یعنی چوبینہ اور جلانے کی لکڑی؛ اور (۲) پیداوار صغیر، جس میں دوسری تمام پیداوار شامل ہے، مثلاً لاکھ، اشیائے دباغی، پھلیل، تارپین اور رال۔ ہندوستانی جنگلات کی پیداوار صغیر کی اہمیت روز افزوں ہے اور ان میں سے اکثروں کی مانگ دنیا کے بازاروں میں مستقل ہوگئی ہے۔ یوں تو کلکتے کے کاغذسازی کے کارخانوں میں سبائی[۱] اور بھابر[۲] جیسی گھاس استعمال کی جارہی ہے، لیکن تحقیقات کے اہم نتائج میں سے ایک یہ ثابت کرنا رہا ہے کہ کاغذ کے گودے کی تیاری کے لیے ان گھاسوں کے علاوہ بانس بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں بانس اور سیونٹا[۳] کے وسیع جنگل موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ آخرکار کل مطلوبہ کاغذ ملک ہی کے اندر تیار کرلیں گے۔

---

۱ (Sabai)

۲ (Bhabar)

۳ (Savanna)

باب ۲ ان امکانات کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت نے، ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کے مطابق، کاغذ سازی کے لیے ہندوستانی بانس کے گودے کی صنعت کو حال میں تامین دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے زرعی کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ ہر صوبے میں جنگلات سے استفادہ کرنے کے لیے ایک افسر کا تقرر کیا جائے تاکہ جنگل کے صنائع کی نشو و نما ایک افسر کی معین اور مخصوص ذمہ داری بن جائے [1]۔

22 ### ۲۶۔ ہندوستانی جنگلات کے امکانات

جنگ کے زمانے میں عراق وغیرہ میں برسرپیکار برطانوی فوجوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کو اپنے ہی ذرائع پر انحصار کرنا پڑا، اور اس کام کو انجام دینے کے لیے جو خاص تدبیریں کافی وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں انھوں نے ہندوستانی جنگلات کے عظیم پوشیدہ امکانات کو نمایاں طریقے پر واضح و ثابت کر دکھایا، اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جنگلات سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک نئے دور کا افتتاح کیا، چنانچہ یہ توقع پورے اعتماد کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ جنگلات پر منحصر صنائع کو مستقبل قریب میں وسیع اور مستقل ترقی ہوگی [2]۔

۲۷۔ ارضیاتی ترکیب

ملک کی ارضیاتی ترکیب کی مساحت میں، زمین کی بالائی سطح اور سطح کے نیچے کے حصے کا بیان شامل ہوگا۔ اول ہم بالائی سطح سے بحث کریں گے، اور اُن وسیع فرقوں کو ظاہر کریں گے جو تین بڑی ارضی ترکیبوں سے پیدا شدہ اہم قسموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ (۱) نرم دریائی مٹی کے خطے بہت وسیع، اور زرعی لحاظ سے اہم ترین ہیں۔ یہ سندھ، گجرات، راجپوتانہ، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور بنگال کے بڑے حصے ہیں؛ اور مدراس کے بعض علاقوں مثلاً کرشنا گوداوری

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۲۲۴

[2] حسب ذیل سے مقابلہ کیا جائے:- (۱) انڈین ایر بک شایع شدہ ۱۹۲۵ء؛ (۲) ان سائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں مضمون بعنوان جنگلات اور فن جنگلات؛ (۳) صنعتی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۶۱ تا ۲۸؛ اور (۴) ایک رپورٹ موسوم بہ (Work of the Forest department in India) زیر ترتیب آر ایس، ٹروپ شایع شدہ ۱۹۱۵ء ص۳ تا ص۹۔

اور تنجور کے اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ نرم مٹی کا خطہ جو کہیں بڑا اور کہیں چھوٹا ہے، جزیرہ نما کے باب ۲
مغربی و مشرقی ساحلوں کے برابر پھیلا ہوا ہے، اور جزیرہ نما کے بڑے دریاؤں کے دہانے پر ڈلٹا کے
آس پاس اکثر مقامات میں کشادہ ہو جاتا ہے۔ ان نرم دریائی مٹی کے خطوں پر بارش معتدل ہوتی
ہے اور اس کی تقسیم ہر جگہ مساوی ہے۔ یہ بات خاص کر ان خطوں پر صادق آتی ہے جو دریائے
گنگا و سندھ کے میدانوں میں واقع ہیں۔ یہاں کی مٹی مسام دار ہوتی ہے، اس کو آسانی کے ساتھ
جوتا جا سکتا ہے اور اس میں قدرتاً کیمیائی و نامیاتی اجزا کی کافی مقدار میں آمیزش ہوتی ہے۔
اس لحاظ سے یہ سب خطے خریف و ربیع کی اکثر فصلوں میں قابل کاشت ہوتے ہیں۔ (۲)
دکنی ٹریپ (سنگریزہ زمین) میں احاطۂ بمبئی، کل علاقہ برار، صوبۂ متوسط کا مغربی ایک ثلث حصہ
اور حیدرآباد دکن کا مغربی علاقہ شامل ہے۔ اس کل رقبے کی زمین بہ لحاظ نوعیت و زرخیزی
مختلف قسم کی ہے۔ دکنی ٹریپ میں اصلی سیاہ ریگڑ کی زمین واقع ہے جس کی سطح ناہموار اور
ڈھلوان ہے اور پہاڑیوں کے دامن کی عام سطح سے پست ہے۔ محل وقوع کے لحاظ سے
اس کی گہرائی میں کمی بیشی پائی جاتی ہے، اور عمق جہاں زیادہ ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ نرم
دریائی مٹی تہ بہ تہ جم گئی ہے، اور بعض مقامات مثلاً تپتی اور نربدا کی وادیوں وغیرہ میں بہت زیادہ
گہرائی کے باعث شدید بارش میں یہ خطے بے کار ہو جاتے ہیں اور فصل ربیع میں گیہوں، السی اور
چنے کی کاشت کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ دکنی ٹریپ کی سیاہ ریگڑ کی زمین میں موسم خریف
میں زیادہ تر روئی اور جوار بوئے جاتے ہیں۔ ریگڑ کی گہرائی بالعموم تین چار فٹ ہوتی ہے اور
23 اس میں چونے کا کنکر اور روڑہ ملا ہوا ہوتا ہے۔ سطح کے نیچے کی زمین میں چونے کی اچھی خاصی
مقدار ہوتی ہے اور مٹی طبق در طبق جمی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے پانی بہ کر نیچے کے پتھریلے حصے میں
چلا جاتا ہے۔ (۳) بقیہ زمینوں کو "قلم نما خطے" (crystalline tracts) کہا جاتا ہے،
اور تقریباً کل مدراس، میسور، بمبئی کا جنوبی کشرقی علاقہ، حیدرآباد کا شرقی نصف حصہ اور
صوبۂ متوسط کا دو ثلث علاقہ اس خطے پر مشتمل ہے۔ گو بحیثیت مجموعی کیمیائی اجزا کی قلت سے
اور فصلیں بہت ناقص تیار ہوتی ہیں، پھر بھی مٹی کی بعض قسمیں مثلاً سرخ چکنی مٹی یا بھورے رنگ
کی چکنی مٹی کے خطے اور مدراس و میسور کی چکنی مٹی کے پنڈول بہت زرخیز ہیں۔ متوسط درجے
کی زرخیزی والی زمینیں بھی بہت مختلف نوعیت کی پائی جاتی ہیں، اور مناسب یا اچھی گہرائی کی
زمین میں فائدے کے ساتھ آب پاشی کی جا سکتی ہے اور اس سے چاول خاص فصل کے طور پر

باب ۲

اُگایا جاسکتا ہے، کیونکہ یہاں نہروں کے ذریعے سے آب پاشی ممکن ہے اور دوسری قیمتی فصلیں تالابوں اور کنووں کے ذریعے سے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس ساخت کی سُرخ اور بھورے رنگ کی یا زرد اور سُرخ رنگ کی زمینیں بلگام ڈھاڑواڑ وغیرہ میں پائی جاتی ہیں اور میووں کے درختوں کے لیے اور سب سے زیادہ آم کے لیے خاص طور سے موزوں ہیں۔

۲۸۔ معدنی پیداوار

سنہ ۱۹۱۸ میں صنعتی کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی معدنی دولت اس کی اکثر کلیدی صنعتوں کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے، بجز ان صنعتوں کے جن میں ویناڈیم (Vanadium) نکل اور مولب ڈینیم (Molybdenum) کی ضرورت ہو۔ لیکن یہ خیال ایک زمانہ دراز تک عام تھا کہ یہ دولت عام طور پر اتنی قلیل تھی کہ وہ جدید ترین پیمانے پر منفعت کے ساتھ نہیں نکالی جاسکتی۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی ابتدا تک ہندوستانی معدنیات کو ترقی دینے کے سلسلے میں کوئی تجربے عمل میں نہیں لائے گئے تھے، اور اسی لیے ہندوستان کے معدنی امکانات کے بارے میں کوئی معتبر و صائب رائے قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات نے مختلف قسموں کی معدنی دولت کے انکشاف اور برآمد کی جانب رہبری کی ہے، چنانچہ اب ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو ہندوستان کے معدنی ذرائع کو غیر محدود یا بے نظیر نہیں کہا جاسکتا پھر بھی وہ کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں، اور ملک میں ان کی بنیاد پر متعدد کلیدی صنائع کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ جدید نقل و حمل کے نظام کی توسیع، بنک کاری کی ترقی اور ملک میں صنعتوں کے روز افزوں قیام و فروغ کی بدولت کان کنی کے کاروبار میں روز بہ روز زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ جنگ عظیم نے متعدد معدنیات کی پیدائش کے حق میں محرک کا کام کیا اور اگرچہ اس وقت جو ترقی کی گئی تھی وہ پوری طرح برقرار نہیں رکھی گئی ہے، پھر بھی ملک کو دیرپا فوائد حاصل ہوئے ہیں اور جنگ سے پیشتر معدنی پیدائش کی جو حالت تھی اس کے مقابلے میں با نمایاں طور سے زیادہ موافق معلوم ہوتی ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول[۱] سنہ ۱۹۱۴ اور سنہ ۱۹۳۱ کی بابت ہندوستان کی خاص معدنی پیداوار کا

---

[۱] یہ جدول ایک رپورٹ موسوم بہ (Statistical Abstract for British India) بابت سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۱۵ اور سنہ ۱۹۳۱ تا سنہ ۱۹۳۲ سے مرتب کی گئی ہے۔

باب ٢

سرسری اندازہ ہوگا۔ اس میں ہندوستانی ریاستیں بھی شامل ہیں :-

معدنی پیداوار کا نام	١٩١٤		١٩٣١	
	مقدار	قیمت (روپیہ)	مقدار	قیمت (روپیہ)
کوئلہ (ٹن)	١٦,٤٦٤,٢٦٣	٥,٨٦,١٠,٩٩٥	٢١,٧١٦,٤٣٥	٥,٢٩,٩٨,٣٤٤
نمک (ٹن)	١,٣٤٨,٢٢٥	٧٢,٤٩,٣٤٧	١,٨٣٩,٤٠٠	١,٣٣,٣٠,٩٥٩
سونا (اونس)	٩٠٧,٣٨٨	٣,٥٠,٧٥,٣٣٠	٣٣٠,٤٨٨	٢,٠٥,٠٩,٩٤٣
پٹرولیم (گیلن)	٢٥٩,٣٤٢,٧١٠	٢,٢١,٠٥,٨٩٢	٣٠٥,٣٨١,٧٥١	٥,٩١,٣٥,٢٥٠
شورا (ہنڈرڈ ویٹ)	٣٦٦,٢١١	٤٢,٠١,٣٧٦	١٢٣١١٧ [١]	٩٩١٠٨٧
کرومائٹ (Chromite) ٹن	٥,٨٨٨	٣٩,١٦٠	١٩,٩١٢	٢١٥٠٢٩
مس خام (ٹن)	٥,٣٢٤	١,٠٩,٤١٠	١٩٧٠٦٣	٥٢٩٥٩٣٣
ہیرا (قیراط)	٥٥	١١,٨٦٧	٦٣٩	٢٤٩٨٢

له یہ برآمد کے اعداد و شمار ہیں جو قریب قریب کل پیداوار پر مشتمل ہیں۔

باب ۲

خام لوہا (ٹن)	۴۴۱۵۷۴	۵۴۴۷۴۰	۱۶۲۴۸۸۳	۴۱۵۸۷۳۷
سنگ یشب[1] Jade Stone (ہنڈرڈویٹ)	۴۹۷۱	۱۰۰۵۷۷۱	۲۵۵۱	۳۵۲۲۶۶۴
سیسہ (ٹن)	۱۰۵۴۸	۳۰۳۴۱۸۵	۷۴۷۸۵	۱۲۸۸۸۲۷۰
مگنیسائٹ Magnesite (ٹن)	۱۶۸۰	۸۳۵۳	۵۳۳۳	۲۷۳۴۸
خام مینگنیز Manganese (ٹن)	۶۸۲۸۹۸	۱۲۱۵۸۹۶۵	۵۳۷۸۴۴	۹۸۱۳۸۷۹
ابرق (ہنڈرڈویٹ)	۴۰۵۰۶	۱۳۲۱۳۵۱	۳۸۹۶۳	۲۰۳۷۶۳۴
مونازائٹ Monazite (ٹن)	۱۱۸۶	۶۲۱۱۶۵	۹۰	۱۲۰۱۵
پلاٹینم (اونس)	۳۷	۳۱۹۵	—	—
یاقوت برما (قیراط)	۳۰۴۸۷۲	۶۴۴۹۸۸	[2] —	۴۲۸۶۴
چاندی (اونسا)	۲۳۶۴۴۴۶	۴۰۳۴۶۰	5,923,005	۵۲۲۹۲۳۴
خام ٹن (ہنڈرڈویٹ)	۵۳۹۵	۳۲۹۲۷۴	۸۵۱۰۴	۳۵۰۷۳۸۰

[1] برآمد بذریعہ بر و بحر
[2] اعداد دستیاب نہیں ہو سکے۔

باب ۲

ولفرام (ٹن) Tungsten ore (ٹنگسٹن خام)	٢٣٢٦	٢٦٧٨١٥٢	٢٢٤٨	٨٨١٦٦٥
جست خام (ٹن)	٨٥٥٣	١٦١٤٣٠	٨٥٥	١٠٧٨٥٥[1]

سنہ ۱۹۳۲ اور سنہ ۱۹۳۳ کے دو سالوں میں جتنی معدنی پیداواروں کے اعداد دستیاب ہوے ان کی کل قیمت علی الترتیب ۲۰،۲۶ کروڑ روپیہ اور ۱۰،۱ ۲ کروڑ روپیہ تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ میں اس میں مزید اضافہ ظاہر ہوا اور وہ ۲۳،۵۴ کروڑ روپیہ ہو گئی۔ اس کو گزشتہ چھ سال کی سخت تجارتی کساد بازاری کے بعد ایک حد تک ملک کی معاشی بحالی کی علامت خیال کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم اہم ترین معدنی پیداواروں میں سے بعض کا مختصر حال بیان کریں گے جن کا استحصال ہندوستان میں تجارتی بنیاد پر کیا جاتا ہے[2]:۔

25 **۲۹۔ کوئلہ** ہندوستان میں کوئلے کے کاروبار کے پھلنے پھولنے کا باعث ملک کی ریلوں کی تعمیر ہے؛ چنانچہ ریلوں نے فوراً کثیر طلب پیدا کی اور گزشتہ صدی کے نصف دوم میں ہندوستان کے کوئلے کی کانوں کے کھولنے کی جانب رہبری کی۔ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی نے گراں برطانوی کوئلہ درآمد کرنے کے بجائے کوئلے کی ارزاں اور قریب تر رسد مقامی طور پر حاصل کرنے کی

[1] ہر قسم کی جست کی برآمد بذریعہ بحر۔

[2] معدنی پیداوار کی تفصیلیں مرتب کرنے میں حسب ذیل ذرائع سے مواد اخذ کیا گیا ہے۔

(۱) کاٹن کی کتاب موسوم بہ (Hand Book of Commercial Information for India) دوسرا ایڈیشن۔ (۲) جے سی براؤن کی تصنیف موسوم بہ (India's mineral wealth) (۳) (Report) (of the Geological Survey of India) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۳ - (۴) (Annual Report) (of the Chief Inspector of Mines in India) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۴ (۵) (Satisfical) (Abstract for British India) اور (۶) (Indian year book) شائع شدہ سنہ ۱۹۳۵

باب ۲

جستجو شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کوئلے کے کاروبار کی ترقی کا راستہ کھل گیا اور متعدد مشترک سرمایہ کی کمپنیاں جو زیادہ تر یورپ والوں کی ملکیت و نگرانی میں تھیں قائم ہوگئیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۴ء اور سنہ ۱۹۰۱ کے مابین کوئلے کی پیداوار ۱ء۲ ملین ٹن سے بڑھ کر ۶ء۶ ملین ٹن ہوگئی[1]۔ یہی نہیں کہ اس کوئلے کو بنگال میں اجارہ حاصل ہوگیا بلکہ بعض مشرقی بازاروں مثلاً کولمبو، برطانوی ملایا، اور جزائر شرق الہند میں بھی یہیں سے کوئلہ جانے لگا۔ اندرون ملک اس کا صرف بڑھ جانے کی وجہ سے جنگ سے پیشتر کے پانچ سالوں میں سالانہ اوسط پیداوار بڑھ کر ۱۴ء۱ ملین ٹن ہوگئی۔ اسی زمانے میں درآمد کی اوسط مقدار جس میں زیادہ تر برطانوی کوئلہ تھا، ۴۵۵۰۰۰ ٹن تھی اور برآمد کی وسط مقدار ۸۲۵۰۰۰ ٹن رہی۔ سلطنت متحدہ کو مستثنیٰ کرکے سلطنت برطانیہ کے کسی دوسرے علاقے کے مقابلے میں ہندوستان سب سے زیادہ کوئلہ پیدا کرتا ہے۔ ہندوستانی کوئلے کی پیداوار کا بیشتر حصہ بنگال، بہار و اوڑیسہ (گونڈوانہ کی کانوں) سے نکلتا ہے۔ ان صوبوں کے علاوہ اہم ترین کانیں حیدرآباد میں سنگاریتی اور ساستی اور صوبۂ متوسط، برما، آسام، پنجاب اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی کوئلے کی رسد میں راجپوتانہ، بیکانیر اور وسطی ہند کا بھی حصہ ہے۔ اس طرح کوئلے کی تقسیم ہندوستان میں بہت ناہموار اور غیر مساوی ہے؛ اور جزیرہ نما میں اس کی کمی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ مدراس میں کوئلے کی رسد کی عدم موجودگی اور اسی کے ساتھ ریلوں کی نقل و حمل کے اعلیٰ مصارف، مدراس پریسیڈنسی میں خام لوہے کے کامیاب استحصال میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ بمبئی میں بھی مقامی طور پر کوئلے کی رسد دستیاب نہ ہوسکنے کے باعث اس قسم کی دقتوں کو برقابی قوت کے استعمال اور جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد کے ذریعے سے رفع کرنا پڑا۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ہندوستانی کوئلہ بیرونی کوئلے کے مقابلے میں خراب قسم کا ہوتا ہے۔ عمدہ فلزاتی کوک کی پیداوار کی حد تک صرف بنگالی کوئلہ بیرونی کوئلے کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

زمانۂ جنگ عظیم اور زمانہ بعد از جنگ کے ابتدائی حصے میں خاصکر سنہ ۱۹۱۷ء تا سنہ ۱۹۲۱ء کے سالوں میں اس صنعت میں بہت نمایاں توسیع و ترقی ہوئی۔ باربرداری کے جہازوں کی قلت کی بنا پر برطانوی رسد کا رک جانا، کوئلے کی قیمتوں کا اضافہ، حکومت ہند کی جانب سے

[1] دیکھو ویرا آنسٹے کی کتاب بحر ہند کی تجارت، (The Trade of the Indian Ocean) صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۱۹۸

باب ۲ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء تک کوئلے کی مانگ اور زمانۂ بعد از جنگ میں صنعتی گرم بازاری کے دور میں اندرون ملک
26 کوئلے کے صرف میں اضافہ، یہی ان عاملین میں سے چند عامل تھے جنھوں نے اس صنعت کی ترقی کے حق میں محرک کا کام کیا۔ اس کے برخلاف رکاوٹ پیدا کرنے والے عامل صرف یہ تھے :- (۱) کوئلے کی نقل و حمل کے لیے واگنوں کی قلت اور (۲) کان کنی کے لیے مزدوروں کی رسد کی کمی[1]۔ اس اثنا میں جنوبی افریقہ سے مشرقی بازاروں کو بہ شمول ہندوستان کوئلے کی برآمد تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی، جس کا باعث ایک تو یہ تھا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت برآمد کی فراخدلی کے ساتھ مالی مدد کر رہی تھی، دوسرے یہ کہ مشرقی بازاروں اور ہندوستان میں برطانوی کوئلے کی درآمد رک گئی تھی، اور تیسرے یہ کہ ہندوستان میں کوئلے کی رسد کی قلت تھی اور ریلوں میں مانگ زیادہ تھی۔ چنانچہ اسی روز افزوں ضرورت کے مدنظر ہندوستان سے کوئلے کی برآمد پر قیود عائد کی گئی تھیں۔ ان مشکلات کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد بھی ہندوستانی کوئلے کی بیرونی فروخت کی مقدار سابق کے ایک جزو سے زیادہ دوبارہ نہ ہو سکی، اور دوسری جانب ملکی بازار میں اس کو روز افزوں مسابقت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن چونکہ گزشتہ چند سالوں سے جنوبی افریقہ کی تجارت کا توازن بدل گیا ہے اور کوئلے کی نقل و حمل روڑہ یا گٹی کی شرح سے اب بآسانی ممکن نہیں رہی ہے اس لیے جنوبی افریقہ کا کوئلہ مشرقی بازاروں میں سابقہ سہولتوں سے بتدریج محروم ہوتا جا رہا ہے[2]۔ کوئلے اور کوک کی تجارت درآمد و برآمد کی تبدیلیاں مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہوتی ہیں :-

	ماقبل جنگ اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	مابعد جنگ اوسط	سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۲۷	سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
درآمد						
مقدار (ایک ہزار ٹن میں)	۴۵۵	۱۳۳	۶۳۰	۱۵۵	۱۷۹	۷۱
قیمت (ایک ہزار روپیہ میں)	۸۰۸۹	۳۰۴۱	۳۰۴۱	۳۵۶۹	۳۴۶۹	۱۲۵۰

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (کوئلے کے کاروبار کے بارے میں) شائع شدہ سنہ ۱۹۲۶ء پیراگراف (۱۱)۔

[2] دیکھو انسٹے کی کتاب محولہ سابق صفحہ ۵۵

باب ۲

برآمد						
مقدار (ایک ہزار ٹن)	۸۲۵	۵۲۶	۴۳۴	۶۴۵	۴۳۰	۳۱۱
قیمت (ایک ہزار روپیہ)	۷۵۷۷	۴۰۴۶	۵۷۲۴	۸۱۳۳	۴۹۳۵	۲۹۲۲ ۵

زمانۂ جنگ عظیم و بعد از جنگ میں کوئلے کے کاروبار کی ترقی کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں کوئلے کی مجموعی پیداوار ۱۶،۴۶۴،۲۶۳ ٹن تھی جس کی قیمت ۵،۶۹،۰۱،۰۶،۸۶،۵ روپیہ وصول ہوئی؛ اس کے برخلاف ۱۹۲۰ء میں اس کی مقدار بڑھ کر ۲۳،۸۰،۳۰،۴۸ ٹن اور قیمت ۳۲،۳۵،۲۶،۲۹ روپیہ ہوگئی۔ ۱۹۲۳ء میں مقدار گھٹ کر 27
۱۹،۷۰،۰۹،۱۶۳ ٹن اور قیمت ۲۸،۰۶،۸۰،۱۱۶ روپیہ ہوگئی۔ اس طرح اب تک پیداوار کی سب سے بڑی مقدار یعنی ۲۳،۸۰،۳۰،۴۸ ٹن ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں کوئلے کی پیداوار میں پھر کچھ اضافہ ہوا، چنانچہ مقدار ۲۲ ملین ٹن اور قیمت ۶۳۰ لاکھ تھی۔ گویا ۱۹۲۴ء میں مقدار کے ۱۱٫۴ فیصد اضافے کے ساتھ مجموعی قیمت میں صرف ۲٫۱ فیصد اضافہ ہوا۔ سال موخرالذکر میں بہار و اوڑیسہ سے ۴۸۹،۲۵۷،۱۱ ٹن اور بنگال سے ۹،۸۹،۱۹۶،۵ ٹن کوئلہ نکلا۔ ٹیرف بورڈ نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئلے کا خالص اندرونی صرف ۱۹۲۵ء میں ۲۰٫۴ ملین ٹن تھا؛ اور اندرونی طلب کو پورا کرنے میں کل رسد میں ہندوستان کا حصہ ۹۷٫۵ ملین ٹن تھا۔ کوئلے کے اندرونی صرف کی مقدار ۱۹۱۰ء کے ۹٫۸ ملین ٹن سے ۱۹۲۵ء کے ۲۰٫۴ ملین ٹن تک بڑھ جانے کا باعث یہ تھا کہ ریلوں میں اس کی طلب بڑھ گئی تھی، چنانچہ کوئلہ، ریلوں ہی میں انفرادی طور سے سب سے زیادہ مقدار میں صرف ہوتا تھا، اور ریلوں کے علاوہ لوہے اور فولاد کی روز افزوں ترقی پذیر صنعت میں اور دوسری صنعتوں میں بھی کوئلے کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ گو برقی قوت کی رسد اور روغنی ایندھن کا استعمال ہندوستان میں بڑھ رہا ہے، اس کے باوجود کوئلہ حسب سابق بکثرت استعمال ہوتا ہے؛ اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس کا استعمال بہت زیادہ وسیع پیمانے پر ہو۔ اس لیے کہ جیسا کہ درآمد و برآمد اور اندرونی صرف کے

ـــــــــ

۵ برآمد کی تخفیف بکسی حد تک خراب تجارتی حالات کا نتیجہ خیال کی جاسکتی ہے۔ نیٹالی اور جاپانی کوئلہ ہندوستانی کوئلے کے بڑے بازاروں مثلاً سیلون، ہانگ کانگ، اسٹریٹس سٹلمنٹس، چین اور سیام میں ہندوستانی کوئلے کی جگہ لے رہا ہے۔

باب ۲

اعداد و شمار سے ظاہر ہو گا، کوئلے کے کاروبار کو سب سے زیادہ تقویت پہنچانے والی شے خود ملک کے اندر کوئلے کا روز افزوں وسیع بازار ہے۔

جنوبی افریقہ کے کوئلے کی درآمد بہت کچھ بے اطمینانی کا سبب رہی ہے؛ چنانچہ مارچ ۱۹۲۴ء میں مجلس قانون ساز نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے یہ سفارش کی گئی کہ ہندوستانی کوئلے کی تامین[1] کی غرض سے جنوبی افریقہ کے کوئلے پر محصول درآمد عائد کیا جائے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی کوئلے کی کمیٹی (انڈین کول کمیٹی) کا تقرر عمل میں آیا تاکہ ہندوستانی کوئلے کو بیرونی مسابقت سے محفوظ کرنے کے مسئلے کو ٹیرف بورڈ میں پیش کرنے سے پیشتر صورت حالات کے فنی پہلوؤں پر غور و خوض اور ان کی تحقیق کر لی جائے۔ اس کمیٹی نے ہندوستانی کوئلے کے کاروبار کو تقویت پہنچانے اور خاص کر کلکتے سے ہندوستانی اور غیر ملکی بندرگاہوں کو کوئلے کی برآمد کو ترقی دینے کے مدنظر متعدد سفارشیں پیش کیں۔ کمیٹی مذکور نے یہ محسوس کیا کہ خوبی اور قیمت کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ تھا۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ خوبی کا اطمینان کرنے کی غرض سے کوئلے کی درجہ بندی کی ایک مجلس (کول گریڈنگ بورڈ[2]) قائم کی جائے تاکہ متعلقہ کوئلے کی خوبی کی ضمانت کے طور پر اس مجلس کے جاری کردہ صداقت نامے تسلیم کیے جا سکیں۔ اس سفارش کو حکومت نے منظور کر لیا۔ چنانچہ کول گریڈنگ ایکٹ بابت ۱۹۲۵ء کی شکل میں ضروری قانون وضع کیا گیا، اور اس کی رو سے ۲۰ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک باقاعدہ مجلس مرتب و قائم کی گئی۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ معدنوں سے جو قابل برآمد مصدقہ کوئلہ کلکتے

28 روانہ کیا جائے اس کے نقل و حمل کے مصارف میں تخفیف کی جائے، یعنی ریلوں کے کرایے میں ۳۷ $\frac{1}{2}$ فیصد رعایتی منہائی اور دریائی کرایوں میں بحساب ۴ر فی ٹن منہائی کی جائے۔ ان سفارشوں کو متعلقہ ریلوے کمپنیوں اور بندرگاہ کے محکموں نے منظور کر لیا ہے۔

جیسا کہ حال میں شایع شدہ رپورٹ موسوم Trade Review بابت ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء میں تبلایا گیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں صنعتی ترقی کم و بیش عام طور پر برقرار رہی لیکن اس کے باوجود کوئلے کے کاروبار کے حالات میں زیادہ اصلاح و ترقی نہیں ہوئی۔ اس اساسی صنعت کی افسوسناک حالت کا باعث یہ واقعہ رہا ہے کہ فوری پیداوار قابلیت کے مقابلے میں

[1] کوئلے کے کاروبار کو تامین دینے کے مسئلے پر جلد دوم باب فصل ۲۲ میں بحث کی گئی ہے۔

[2] Coal Grading Board

باب ۲ طلب میں کمی ہو گئی، اور اس کی وجہ سے قیمتیں بڑی حد تک گھٹ گئیں۔ کوئلے کے کاروبار کی اس تجویز کو کہ کوئلے کی پیداوار پر روک قائم کرنی چاہیے حکومت نے منظور نہیں کیا، لیکن کوئلے کی طلب کو بڑھانے اور اس کاروبار کی بحالی میں عام طور سے مدد دینے کے لیے کوئلے کی باربرداری بذریعہ ریل کے زائد کرایے میں یکم اپریل سنہ ۱۹۲۵ء سے کمی کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جنوبی افریقیہ کے کوئلے کی درآمد پر محصول متوازن عائد کرنے کی موافقت میں اسوشئیٹڈ چیمبرز آف کامرس کی جانب سے حال (سنہ ۱۹۲۵ء) میں پیش کی ہوئی پُرزور دلیل بھی قابل ذکر ہے۔ اسوشئیٹڈ چیمبرس آف کامرس (متحدہ ایوان ہائے تجارت) نے ہندوستان سے کوئلے کی برآمد کے لیے ریلوں کے کرایے میں خاص طور پر منہائی کرنے کی بھی تائید کی۔ اسی کے ساتھ سرلوی فرمر ناظم ارضی مساحتِ ہند کی حال میں شایع کردہ سرکاری اطلاع میں، آیندہ سو سال کے اندر ہندوستان کے عمدہ کوئلے کے کامل طور سے ختم ہو جانے کے امکان کے متعلق جو انتباہ ہے اس کے مدنظر ہندوستانی کوئلے کے ذرایع کی حفاظت کی تدبیریں نکالنا ضروری ہے۔

۳۰۔ لوہا

آہنی فلزیات کی معلومات بہت قدیم ہیں، اور یورپ سے کوئلے کی درآمد کی مسابقت شروع ہونے سے پیشتر دیسی آہنی صنعت سرسبزی کی حالت میں تھی، اور ملک کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوہے کی مصنوعات تیار کرنے کے جدید طریقے بڑے پیمانے پر سنہ ۱۸۷۵ء سے استعمال کیے جانے لگے؛ چنانچہ باراکار آئرن ورکس لہ کا کام اسی سال سے شروع ہوا۔ اس کارخانے کا نام بعد میں بنگال آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی ہو گیا، اور یہ موجودہ بنگال آئرن کمپنی کا پیش خیمہ تھا۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا افتتاح سنہ ۱۹۱۱ء میں بہار و اڑیسہ میں بمقام ساکچی عمل میں آیا۔ ہندوستانی فولاد تیار کرنے کا کارخانہ تقریباً سنہ ۱۹۱۳ء کے ختم پر کامیابی کے ساتھ قائم ہوا اور بہار و اڑیسہ کی کوئلے اور لوہے کی معدنوں کے قرب سے اس کو سہولت حاصل رہی۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کی مزید ترقیوں کی بحث کے لیے مناسب مقام وہ باب ہے جس میں ہندوستانی صنعتوں پر بحث کی گئی ہے۔

لہ Barakar Iron Works.

باب ۲۹

ہندوستان میں خام لوہے کی پیدائش کی ترقی مندرجۂ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتی ہے:-							
۱۹۱۴		۱۹۲۱		۱۹۳۰؎		۱۹۳۳	
مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)	مقدار (ٹن)	قیمت (روپیہ)
۴۴۱۵۴۴	۵۴۴۴۴	۹۴۴۰۸۴	۲۱۰۸۳۴۹	۱۸۴۴۹۶۲۵	۴۴۴۵۵۲	۱۴۱۴۰۹۶۲۵	۴۴۹۷۹۱۴

غالباً اہم ترین لوہے کی کانیں وہ ہیں جو سنگ بھوم میں اور کیونجھار، بونائی اور مایور بھانج کی اوڑیسائی ریاستوں میں واقع ہیں جہاں حال کی انکشافات سے یہ پتا چلا ہے کہ تقریباً مسلسل طور سے ۴۰ میل تک خام لوہے کا زنجیرہ پھیلا ہوا ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مقام پر جہاں اس خام لوہے کے زنجیرے کو ایک پہاڑی دریا کاٹتا ہوا گیا ہے اعلیٰ درجے کا ہماٹائٹ پایا جاتا ہے جس کی مسلسل موٹائی ۷۰۰ فٹ ہے اور جس میں ۶۰ فیصد سے زائد خالص لوہا ہے؛ اور اندازہ کیا گیا ہے کہ اس زنجیرے میں ۲،۸۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ ٹن خام لوہے سے کم نہیں ہے۔ ریاست میسور میں بھی خام لوہے کی تہیں پائی جاتی ہیں جن کو آہنی کارخانہ واقع بھدراوتی نکال رہا ہے۔

ایسے آہنی معاون سے جب مرور زمانہ کے ساتھ لوہا برآمد ہونے لگے گا تو لوہے کی بیرونی رسد پر ہندوستان کا انحصار انجام کار ختم ہو جائے گا۔

۳۱۔ منگنیز یہ ایک بہت ہی قیمتی صنعتی معدنی پیداوار ہے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کل دنیا کے خام منگنیز کی پیداوار کا کم از کم ۹۰ فیصد جز و فولاد تیار کرنے کے "بسی مر" اور کھلے چولھے کے طریقوں کے لیے درکار ہوتا ہے۔ منگنیز، بھاری کیمیائی، برقی اور شیشے کی صنعتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

منگنیز کی صنعت کی ابتدا ہندوستان میں سنہ ۱۸۹۲ء سے ہوتی ہے جبکہ اس کی کھندگی

۱؎ سنہ ۱۹۳۰ اور سنہ ۱۹۳۳ء میں جو کساد بازاری رہی اس کا اثر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیداوار اور قیمت میں کمی ہو گئی۔ لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں خام لوہے کی پیداوار ۱۹۱۲۰۰۰ ٹن تک بڑھ گئی گویا سنہ ۱۹۳۳ء کے مقابلے میں ۵۶ فیصد اضافہ ہوا۔ پگ آئرن اور فولاد کی پیداوار میں بھی معقول اضافہ ہوا۔

باب ۲ احاطۂ مدراس میں بمقام وزاگاپٹم شروع ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ تا ۱۹۱۰ء میں ۹۰ ہزار ٹن بذریعہ جہاز روانہ کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد سے صوبۂ متوسط کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ وہاں منگنیز کی سب سے بڑی مقدار نکلتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۵ء میں ہندوستان میں مجموعی پیداوار ۶۸۲۸۹۸ ٹن تھی جس کی قیمت ۱۳۱۵۸۹۶۵ روپیہ تھی۔ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں مقدار ۹۹۴۲۷۹ ٹن اور قیمت ۲۱۰۵۱۸۰۲ روپیہ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں پیداوار گھٹ کر ۲۱۸۲۰۷ ٹن اور قیمت گھٹ کر ۲۶۳۸۱۷۴ روپیہ ہو گئی۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے یہی پہلا سال ہے جس میں مقدار 30
اور قیمت قلیل ترین بتلائی گئی ہے۔ سرد بازاری کے اثرات جتنی شدت سے منگنیز کے کاروبار میں محسوس کیے گئے اتنی شدت سے ہندوستان کی بڑی معدنی صنعتوں میں سے کسی میں بھی محسوس نہیں کیے گئے۔ صوبۂ متوسط کے اکثر معادن سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء میں بند رہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں کچھ بحالی ہوئی جیسا کہ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیدائش ۴۰۹،۰۰۰ ٹن تک بڑھ گئی۔ خام منگنیز ہندوستان کی تین بڑی آہنی کمپنیوں کے کارخانوں میں نہ صرف فولادی بھٹیوں میں آہنی منگنیز تیار کرنے کے لیے بلکہ جھکڑ بھٹیوں میں شریک کر کے بٹر تیار کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

منگنیز پیدا کرنے والے بڑے علاقے صوبۂ متوسط، مدراس، بمبئی اور میسور ہیں۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں صنعت اپنے انتہائی عروج پر پہنچی، چنانچہ ہندوستان نے روس کی جگہ لے لی اور دنیا میں اس دھات کے پیدا کرنے والے ملکوں کی صف اول میں آ گیا، گو سنہ ۱۹۱۲ تا ۱۹۱۳ء میں ہندوستان پر روس پھر سبقت لے گیا لیکن سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد روسی برآمد بالکل موقوف ہو گئی۔ روس کچھ سال ادھر پیداوار حاصل کرنے اور قرضہ دینے کے غیر معاشی طریقے اختیار کر کے خام دھات کی کثیر مقدار کم قیمت پر بازار میں پیش کرنے کے قابل ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کی کانوں کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستان میں آہنی منگنیز کی روز افزوں تیاری اور قیمتوں کے کثیر اضافے نے منگنیز کی پیداوار کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ تا ۱۹۳۰ء میں خام دھات کی قابل برآمد مقدار ۸۱۶،۰۰۰ ٹن اور اس کی قیمت ۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپیہ تھی۔ برآمد کی اس انتہائی مقدار میں سنہ ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء میں کمی ہو گئی، چنانچہ ۱۹۸،۰۰۰ ٹن دھات برآمد ہوئی اور اس کی قیمت ۴۸ لاکھ روپیہ وصول ہوئی۔ اس کمی کی وجہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں منگنیز کے ذخیرے میں اضافہ اور فولاد کی تیاری میں کمی ہو گئی تھی اور اس لحاظ سے منگنیز کی طلب گھٹ گئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ء میں خام منگنیز کی برآمد کی مقدار ۲۶۶،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۵ لاکھ روپیہ اور

باب ۲

سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں مقدار ۶۴۰،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۸۰ لاکھ روپیہ تھی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آہن و فولاد و اسلحہ سازی کی صنعتوں میں گرم بازاری کی وجہ سے منگنیز کی طلب کسی قدر بحال ہو گئی۔

۳۲ - سونا

ہندوستان، دنیا کے سونے کی پیداوار کا صرف تقریباً تین فیصد پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان میں سونا پیدا کرنے والا اہم ترین رقبہ کولار کی کان ہے جو شرقی میسور میں واقع ہے، اور ہندوستان کی مجموعی پیداوار کا ۹۸ فیصد سونا یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کولار کی پیداوار مائل بہ زوال ہے، سب سے بڑی مقدار یعنی ۸،۵،۶۱۶ اونس سنہ ۱۹۰۵ میں حاصل ہوئی۔ باقی جزو کا بیشتر حصہ اننتاپور کی کانوں سے برآمد ہوتا ہے جو احاطۂ مدراس میں واقع ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں سنہ ۱۹۰۳ میں ہٹی کی کان میں کام شروع ہوا، لیکن سنہ ۱۹۲۰ کے بعد سے کام موقوف ہے۔ دریائے اراواڈی کی تہ سے کیچڑ نکال کر اور چھان کر سونا نکالنے کا عمل اس لیے مایوس کن ثابت ہوا کہ اس سے بہت ہی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب، صوبۂ متوسط اور صوبۂ متحدہ میں بھی مٹی دھو کر سونا نکالنے سے قلیل مقدار نکلتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ میں سونے کی مجموعی مقدار ۳۳۶۱،۰۸ اونس پیدا ہوئی
31 اور اس کی قیمت دو کروڑ ۷۶ لاکھ ۴۰ ہزار ۷۱ روپیہ تھی، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۲ میں مقدار ۳۲۹۶۸۱ اونس اور قیمت ۲،۵۳،۵۱،۲۲۸ روپیہ ہوئی تھی۔ سونے کی قیمت کی زیادتی حال میں ہندوستان میں سونے کی پیدائش کے حق میں کسی حد تک محرک ثابت ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ میں پیداوار کی مقدار ۳۲۲،۰۰۰ اونس تک گھٹ گئی، لیکن قیمت ۲ کروڑ ۹۲ لاکھ تک بڑھ گئی جو سنہ ۱۹۳۱ کے بعد سے بجوالۂ اسٹرلنگ بیش ترین قیمت ہے۔

۳۳ - چاندی، سیسہ، جست

سلطنت ہند کے حدود کے اندر جو دھاتیں پیدا ہوتی ہیں ان کی فہرست میں صرف سنہ ۱۹۰۹ کے بعد سے چاندی کا اضافہ ہوا ہے۔ تقریباً کل پیداوار بالائی برما میں باڈون سے حاصل ہوتی ہے اور ملک کی ضرورتوں کے مقابلے میں (کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ چاندی صرف ہوتی ہے) اس کی مقدار بہت ہی حقیر سی ہے۔ باڈون کے خام سیسے اور جست کو پگھلانے سے ذیلی پیداوار کے طور پر چاندی حاصل ہوتی ہے۔ برما کے خام دھات کے عظیم ذخائر کا پتا لگ جانے کے بعد سے یہ توقع ممکن ہو گئی ہے کہ برما بہت قریب زمانے میں دنیا کی سیسے کی

پیداوار میں اہم ترین نیا عامل بن جائے گا؛ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء میں تقریباً ۷۲۰۴۵ ٹن سیسہ نکلا باب ۲
جس کی قیمت ایک کروڑ پندرہ لاکھ آٹھ ہزار نو سو پندرہ روپیہ تھی۔ ہندوستان میں اس کا صرف تقریباً بقدر ۴۰۰۰۰ ٹن سالانہ ہوتا ہے، اور کثیر مقدار برآمد کے لیے بچ رہتی ہے۔ سیسے کی کان جست کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے، چنانچہ جست بہ مقدار کثیر برآمد کیا جاتا ہے۔ سیسے کی طرح جست کے بارے میں بھی یہ توقع ہے کہ ہندوستان دنیا کی رسد کا اہم جزو مہیا کرے گا۔ باڈون کی کانوں کا ایک اور سلسلے میں بھی ذکر ضروری ہے؛ اور وہ یہ کہ سیسہ، چاندی اور جست کے سلفائڈ گندھک کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں کہ اس سے ہندوستان کی گندھک کے ترشے کی ضرورت سردست پوری ہو سکتی ہے جو صنعتی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے؛ لیکن اس توقع نے ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنا۔

۳۴ - پٹرولیم[۱]

ہندوستان میں تیل پیدا کرنے والے دو نمایاں رقبے ہیں اور وہ کوہ ہمالیہ کی قوس کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ مشرقی کنارے پر جو رقبہ واقع ہے اور جو غالباً بہ لحاظ زیادہ اہم ہے اس میں آسام اور برما شامل ہیں اور ان سے مجموعی پیداوار کا ۹۵ فیصد تیل نکلتا ہے۔ مغربی کنارے پر جو رقبہ ہے اس میں پنجاب اور بلوچستان شامل ہیں۔ سب سے کامیاب تیل کے چشمے برما میں وادی اراواڈی میں پائے جاتے ہیں جہاں سے دیسی پٹرولیم کا ۹/۱۰ حصہ پیدا ہوتا ہے۔

پٹرولیم کی پیداوار سنہ ۱۹۰۴ء میں تقریباً ۱۸ ملین گیلن تھی، لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں وہ بڑھ کر ۳۲۲ ملین گیلن ہو گئی۔ ملک میں مٹی کے تیل کی عظیم طلب اب اس رسد سے بھی بدرجہا متجاوز ہو گئی ہے جو برما سے حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بیرونی ممالک سے یہ بہ مقدار کثیر درآمد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۷ء میں ۱۵۸،۰ ملین گیلن، سنہ ۱۹۲۸ء میں ۱۰۴،۴ ملین گیلن اور
سنہ ۱۹۳۰ء میں ۱۰۸،۵ ملین گیلن، سنہ ۱۹۳۲ء میں ۱۰۸،۷ ملین گیلن اور سنہ ۱۹۳۳ء میں ۸۷،۵ 32
ملین گیلن درآمد کیے گئے۔ ٹیرف بورڈ نے اندازہ کیا ہے کہ "ملکی رسد کی مقدار، مجموعی طلب کی مقدار کے مقابلے میں ۳۵ تا ۴۰ فیصد کم ہے"[۲]۔ ہندوستان کی پٹرولیم کی پیداوار اور اس کے منجملہ

[۱] پٹرولیم کی صنعت کی ترقی کا دلچسپ حال معلوم کرنے کے لیے دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ صنعت روغن کے بارے میں شائع شدہ سنہ ۱۹۲۸ء باب ا جس پر ہماری کتاب جلد دوم میں صنائع ہند کے باب "بیرونی تیل سے شرحوں کی جنگ" کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔ [۲] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ صنعت روغن کے بارے میں پیراگراف (۳۳)۔

جو ملکی کا تیل نکلتا ہے اس کا کوئی حصہ برآمد نہیں کیا جاتا۔ لیکن جن اشیا کی زیادہ تر برآمد ہوتی ہے باب ۲
وہ یہ ہیں :- پٹرول نبزین (Benzine) موم اور موم بتیاں۔ خاص کر ملکی صرف
میں اضافے کے باعث پٹرولیم کی برآمد بشمول نبزین، بنزول (Benzol) اور پٹرول
بہ سرعت زوال پذیر ہے۔ ملکی پٹرول کی کثیر پیداوار کے باوجود رسد اتنی کافی نہیں ہوتی جس سے
ملکی طلب پوری ہو سکے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء میں طلب بقدر
۵۲٫۸ ملین گیلن یا ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء کے انداز سے کے مقابلے میں ۹٫۷ ملین گیلن زیادہ تھی۔
پٹرول کی برآمد اب تقریباً رک گئی ہے اور ٹیرف بورڈ اس بات کا اندیشہ محسوس کرتا ہے کہ ہندوستان
میں عنقریب اس کی قلت ہو جائے گی جس کو پورا کرنے کے لیے باہر سے کثیر مقدار درآمد کرنی پڑے گی
چنانچہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء میں ۵ ملین گیلن پٹرول درآمد کیا گیا۔

۱۹۲۴ء تک پٹرولیم کے اعداد و شمار سے یہ پتا چلتا ہے کہ پیداوار میں تدریجی تخفیف کا
قطعی میلان پایا جاتا ہے، جس کا خاص باعث یہ ہے کہ نیانگ یانگ کی پیداوار گھٹ گئی ہے،
جو برما کے تیل کے چشموں میں قدیم ترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ چشمہ ہے۔ ان اعداد
سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان بشمول برما کی پیداوار کو ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کی اعلیٰ سطحوں تک
(جبکہ $\frac{1}{2}$ ۳۰٫۵ ملین گیلن سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی تھی) برقرار رکھنے میں روز افزوں
دقت محسوس ہو رہی ہے، چنانچہ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں پیداوار گھٹ کر
۹۰٫۹ ، ۱۳۱ ، ۱۸ ، ۲ گیلن ہو گئی۔ پھر بھی حالیہ سالوں میں پیداوار کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس میلان میں اصلاح ہو گئی ہے۔ پٹرولیم کی پیداوار ۱۹۲۸ء میں ۳۰۵٫۹ ملین، ۱۹۲۹ء میں
۳۰۶٫۱ ملین، ۱۹۳۰ء میں ۳۱۱٫۰ ملین اور ۱۹۳۴ء میں ۳۲۲٫۰ ملین گیلن تھی، جو آخر الذکر
مجموعی مقدار سب سے بڑی انتہائی مقدار ہے جس کا حال اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ ۱۹۳۰ء
اور ۱۹۳۴ء کا اضافہ آسام کی پیداوار کے بہت ہی کثیر متناسب اضافے اور برما کی پیداوار کی
قلیل سی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ آسام کی زائد پیداوار نے اسی زمانے کی برما کی پیداوار کی کمی اور پنجاب
کی پیداوار کی عظیم تخفیف کو تقریباً زائل کر دیا ہے۔ لیکن نئے اہم چشمے دریافت ہونے تک
یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ کاموں میں زیادہ سرمایہ لگانے کے بجائے احتیاط
اور کفایت شعاری کے اصول پر کام کیا جائے۔ ٹیرف بورڈ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اٹاک
اور آسام کے چشموں کے امکانات بہت بڑے ہیں[1]۔ ہندوستانی پٹرولیم کی پیداوار کا

[1] ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت روغن)، پیراگراف (۵)

ب تناسب دنیا کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی حقیر ہے۔ دنیا کی مجموعی پیداوار کچھ
سال ادھر سے سرعت کے ساتھ بڑھ گئی ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء کے مقابلے میں جبکہ پیداوار 33
۷،۹۶ ملین لانگ ٹن تھی وہ بڑھ کر سنہ ۱۹۲۷ء میں ۵،۸،۷۱ ملین لانگ ٹن ہوگئی۔ ہندوستان کا حصہ
باوجود اس کے کہ پیداوار میں قطعی طور پر اضافہ ہوا اس زمانے میں ۱۱ فیصد سے گھٹ کر
۴،۹ فیصد ہوگیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں دنیا کی پیداوار میں ایک اور نمایاں اضافہ ہوا، یعنی
مقدار ۱۸۱ ملین ٹن سے زائد تھی۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں مزید اضافہ ہوا اور پیداوار ۲۰۲ ملین ٹن
سے زائد ہوگئی لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں دنیا کی پیداوار گھٹ کر ۱۹۹ $\frac{1}{2}$ ملین ٹن ہوگئی۔ سنہ ۱۹۳۲ء
میں تقریباً ۱۷۰ ٹن تک گر گئی، اور اس کے برخلاف سنہ ۱۹۳۳ء میں پیداوار پھر ۱۹۸ ملین ٹن تک
بڑھ گئی۔ موخرالذکر سال میں دنیا کی رسد کے منجملہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ۵،۲۶ فیصد
اور روس سے ۶،۰۱ فیصد جزو حاصل ہوا۔ ہندوستان کا حصہ سنہ ۱۹۲۸ء میں ۴،۶ فیصد تھا جو
سنہ ۱۹۲۹ء میں گھٹ کر ۶،۰ فیصد ہوگیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں کچھ بڑھ کر ۴۶،۰ ہوگیا۔ اور سنہ ۱۹۳۳ء میں
پھر ۶۲،۰ فیصد تک گھٹ گیا۔ موخرالذکر سال میں ہندوستان کا درجہ دنیا کے پٹرولیم پیدا
کرنے والے ملکوں میں بارھواں تھا[1]۔

۳۵۔ ابرق

ابرق زیادہ تر برقی صنعت میں حاجز واسطے[3] کے طور پر استعمال ہوتی ہے؛
اور جنگ عظیم کے زمانے میں لاسلکی پیام رسانی، علم ہوائی جہاز رانی اور
نقل و حمل بذریعہ موٹر کی ترقیوں کے سلسلے میں اس نے بہت اہمیت حاصل کرلی چنانچہ اس کے
بغیر یہ ترقیاں ناممکن ہوتیں۔

ہندوستان میں سالہا سال سے ابرق کثیر مقدار میں پیدا ہو رہی ہے، چنانچہ اس کی مقدار
دنیا کی مجموعی مقدار کے $\frac{2}{5}$ سے زیادہ ہے۔ ابرق زیادہ تر بہار، نیلور، سلم، مدراس پریسیڈنسی
کے اضلاع ملیبار، ٹراونکور اور اجمیر مرواڑہ اور راجپوتانہ کے دوسرے علاقوں میں دستیاب
ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۱،۰۵،۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ ابرق برآمد کی گئی جس کی قیمت
۶۹ لاکھ روپیہ تھی۔ یہ غالباً ہندوستان کی مجموعی سالانہ پیداوار کی نمایندگی کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ
پیداوار کے اعداد غیر مکمل ہیں، چنانچہ اس کی مقدار برآمد کی تقریباً نصف ہے۔

[1] دیکھو انس ٹے کی تصنیف محولۂ بالا، ص ۱۸۹
[2] دیکھو "انڈین ایربک" بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء ص ۷۰۵۔
[3] Insulating Medium

باب ۲

۳۶ - ولفرام

ٹنگس ٹن (Tungsten) میں سب سے بڑی خام دھات یہی (ولفرام) ہوتی ہے، اور تیز تراش فولاد کی تیاری میں جو جنگی اغراض کے لیے بے بہا ہے اس کا استعمال ناگزیر ہے۔ ٹنگس ٹن بھی دوسرے اہم کاموں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً تاباں لمپ کے ریشوں کے تار تیار کرنے رنگریزی اور اگن روک سامان وغیرہ کے لیے۔ ولفرام کی کان کنی ہندوستان میں سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئی اور دوسرے ہی سال برما سے ۱۳۰۰ ٹن پیداوار کی برآمد نے برما کو دنیا کے ولفرام پیدا کرنے والے ملکوں کی پہلی صف میں کھڑا کر دیا۔ برما اور خاصکر ٹوائے کی کانوں میں ولفرام کی تہیں زمانہ جنگ عظیم میں سلطنت کے لیے اہم ترین ثابت ہوئیں۔ اختتام جنگ کے بعد سے زمانہ جنگ کے محرک کی عدم موجودگی کے باعث صنعت میں انحطاط پیدا ہو گیا ہے۔

۳۷ - شورا

شورے کی طلب صنعتی اغراض مثلاً شیشہ سازی، غذا کے تحفظ اور کھاد کی تیاری کے لیے بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار عملاً بہار، صوبۂ متحدہ، اور پنجاب تک محدود ہے۔ کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دنیا میں 94
نائٹریٹس (Nitrates) کی رسد کا عملی اجارہ حاصل تھا جو دھماکو اشیا اور کیمیاوی کھاد کی تیاری کے لیے نہایت اہم ہیں۔ لیکن ایک حد تک حکومت ہند کے محصول کی پالسی کے باعث اور ایک حد تک دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان کو دوسرے رقیبوں یعنی غیر ممالک نے اس حیثیت سے ہٹا دیا۔ حکومت ہند نے مالی اغراض کے لیے ایک بھاری محصول برآمد عائد کر کے کچھ زمانے تک ہندوستانی اجارے سے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جنگ کے زمانے میں ہندوستانی شورے کی پیدائش اپنی سابقہ حالت پر کسی حد تک عود کر آئی، اس لیے کہ سامان جنگ کی تیاری کے سلسلے میں اس کی ضرورت تھی۔ بیرونی بازاروں میں جنگ کے زمانے کی طلب کی موقوفی اور چائل کے نائٹریٹ اور فرانس کے پوٹاش کے نمکوں کے مقابلے نے اس صنعت پر مخالف اثر ڈالا، چنانچہ جنگ کے زمانے میں اوسط پیداوار ۴۴۰۰۰۰ ہنڈرڈویٹ اور قیمت ۸۰ لاکھ روپیہ تھی لیکن سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء میں مقدار ۱۷۳,۰۰۰ ہنڈرڈویٹ اور قیمت ۱۴ لاکھ تک گھٹ گئی[1]

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسومہ بہ ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا، سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء
(Review of the Trade of India)

تقریباً کل پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے اور صرف ایک خفیف جزو کھاد کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے اور وہ بھی خاصکر آسام کے چائے کے باغوں کے لیے ملک میں رکھ لیا جاتا ہے۔ باب

۳۸ - دوسری معدنی پیداوار

دوسری معدنی پیداوار، جو ہندوستان کی معدنی پیداوار میں بہ لحاظ اہمیت دوسرے درجے پر ہے، سیسہ، ٹن، تانبا، جست، الیومنیم، کرومائٹ، یشب، پوٹاش، عنبر، الماس، یاقوت، گندھک وغیرہ ہے۔

۳۹ - نمک

ہندوستان میں نمک کے سالانہ صرف کا تقریباً تین چوتھائی حصہ خود ملک ہی میں پیدا ہوتا ہے، اور مجموعی صرف کی مقدار دو ملین ٹن سے زائد ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں نمک کی مجموعی پیداوار ۱۷،۱۸۲۲۴ ٹن اور اس کی قیمت ایک کروڑ ۱۴ لاکھ ۴۲ ہزار ۸ سو چھپاسٹھ روپیہ تھی۔ اسی سال ہندوستان میں ۳۹۶۸۱۸ ٹن نمک درآمد ہوا جس کا بڑا حصہ عدن اور ماتحت علاقوں سے آیا۔ برخلاف اس کے سنہ ۱۹۳۲ء میں ۱۴،۷،۲،۵۵ ٹن نمک درآمد ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں نمک کی پیداوار بہت بڑھ گئی، یعنی ۱۹،۶۳،۰۰۰ ٹن ہو گئی۔ ہندوستانی نمک کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ بمبئی، مدراس اور برما کے سواحل پر سمندر کے پانی کی تبخیر کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ نمک کا دوسرا منبع پنجاب میں سالٹ رینج اور کوہاٹ کی کانیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوہاٹ میں نمک کے ذرایع اس قدر وافر ہیں کہ بہت طویل زمانے تک وہ کام دیتے رہیں گے۔ دوسرے دو ذرایع یہ ہیں کہ راجپوتانے میں جھیل سانبھر کے کھارے پانی سے نمک بنایا جاتا ہے اور رَان آف کچھ خوردگی سرحد پر کھارے پانی کو گڑھے کھود کر جمع کیا جاتا ہے، جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو نمک نکال لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں نمک کی پیداوار کو بڑھانے اور ملک کو خودکفیل بنانے کا مسئلہ سنہ ۱۹۲۹ء میں ٹیرف بورڈ کے روبرو پیش ہوا جس کی رپورٹ سنہ ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئی۔ اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ بیرونی نمک کی معمولی طلب بنگال کے بازار کے لیے تقریباً ۵،۰۰،۰۰۰ ٹن اور برما کے بازار کے لیے ۸۰،۰۰۰ ٹن ہو گی۔ بنگال کے بازار میں (جس کو زیادہ تر ہندوستان خاص خیال کیا جا سکتا ہے) "سفیدی، کنکریوں کی ہمواری اور رطوبت کی عدم موجودگی" کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، قیمت بھی طلب کو متعین کرنے والا عامل ہے۔ کلکتے کے بازار میں قیمتوں میں بہت شدید تغیرات واقع ہوتے ہیں، جس کا باعث کسی 35
حد تک تو نقل و حمل کی شرحوں کے تغیرات ہیں، لیکن زیادہ تر کاروباری اتحادوں اور سوداگروں

باب ۲ کا عمل ہے۔ ٹیرف بورڈ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ بنگال کے بازار کی کل طلب ہندوستان اور عدن مل کر پوری کر سکتے ہیں، چنانچہ تنہا عدن میں سالانہ ۳۰۰،۰۰۰ ٹن نمک پیدا ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو نمک سمندر کے راستے کراچی اور اوکھا سے اور بذریعۂ ریل کھیورا، سانبھر اور پیچ بھدرا سے آتا ہے اس کے ذرایع کو مناسب ترقی دی جائے۔

بنگال کے لیے کھیورا وغیرہ سے جو نمک بذریعۂ ریل آتا ہے اس کی رسد قومی اغراض کے نقطۂ نظر سے کراچی اور اوکھا سے بذریعۂ بحر لائے ہوئے نمک کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے، اگرچہ موخر الذکر مرکزوں کو بعض خاص قدرتی سہولتیں حاصل ہیں۔ بذریعۂ ریل جو نمک آتا ہے وہ زمانۂ جنگ میں قلت نہ ہونے دینے کا ضامن ہے۔ اضافۂ پیداوار کے نتیجے کے طور پر ریلوں کی نقل و حمل بڑھے گی اور نمک کی قیمتوں میں کمی ہوگی لیکن ریل سے جو نمک آتا ہے اس کی کمی کو سمندر سے نمک لا کر پورا کرنا چاہیے۔ بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ حکومت رسد کے ان ذرایع کو ترقی دینے کے خیال سے ان کی مکمل جانچ کرے اور نمک کے لیے ریلوں کی شرحوں کی تخفیف کے مسئلے کی پوری تحقیقات کرے۔ قیمتوں میں ثبات پیدا کرنے کے لیے جو ہندوستانی رسد کے ذرایع کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے، بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ درمیانی تدبیر کے طور پر حکومت بنگال میں نمک کی درآمد کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے۔ حکومت کو چاہیے کہ مناسب قیمت فروخت پر اس ہندوستانی نمک کو خریدے جو بذریعۂ بحر لایا جاتا ہے اور بذریعۂ ریل لائے ہوئے نمک کا استعمال عوام میں بڑھائے۔ مزید ضرورت ظاہر ہو تو اس کو بیرونی تیار کرنے والوں سے خرید کر پورا کیا جائے۔ یہ پالسی کراچی، اوکھا بلکہ عدن کے چھوٹے کارخانوں کو بھی بیرونی مقابلے کی زد سے محفوظ رکھے گی۔ لیکن چونکہ حکومت، درآمدہ نمک کی فروخت اور تقسیم کی بہترین ایجنسی نہیں ہے، لہذا بورڈ یہ سفارش کرتا ہے کہ ایک مجلس فروخت Marketing Board رفاہ عام کمپنی کے طور پر ترتیب دی جائے جو شمالی ہند میں نمک کی خرید و فروخت کا انتظام اپنے ذمے لے۔ خریداری کرتے وقت بورڈ کو چاہیے کہ مطلوبہ خوبی کے ہندوستانی نمک کو ترجیح دے، اور ایک مناسب قیمت فروخت مقرر کی جائے جو کرایۂ نقل و حمل کی تبدیلی کے تابع رہے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس میں حکومت کو مستقل نمایندگی حاصل ہونی چاہیے اور حکومت کو نامنظوری (Veto) کا حق حاصل ہونا چاہیے[1]۔ درآمدہ نمک کی قیمت میں معتدبہ کمی اور اس کے نتیجے کے طور پر مجوزہ

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت نمک سازی) شایع شدہ سنہ ۱۹۳۰ء۔

باب ۲

حکومتی نگرانی سے زیادہ سادہ مستعدانہ کارروائی کی ضرورت کے مدِنظر مجلس قانون ساز کی ایک حالیہ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ تمام بیرونی نمکوں پر ۱/۲-۴ آنے فی من کا زائد محصول عارضی طور پر عائد کیا جائے، عدن کا نمک اس سے مستثنیٰ رہے اور عدن کو اس غرض کے لیے ہندوستان کا جزو سمجھا جائے۔ اس سفارش کو قانون (زائد) محصول درآمد نمک (Salt Additional Import Duty Act بابتہ ۱۹۳۱ء میں شریک کر لیا گیا اور یہ قانون ۱۸ مارچ ۱۹۳۱ء کو نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کی مدت ابتداً ایک سال رکھی گئی تھی، لیکن متعاقب توسیعی قوانین کے ذریعے وقتاً فوقتاً اس میں توسیع کی گئی جو ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو ختم ہونے والی تھی۔ قانون تتمۂ مالیہ بابتہ ۱۹۳۱ء کی رو سے نمک کی کروڑگیری اور چنگی پر ۲۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا۔[۱] مجلس قانون ساز کی صنعت نمک سازی کی کمیٹی کی سفارش کے مطابق ۱۹۳۳ء میں زائد محصول فی من ۱/۲-۴ آنے سے گھٹا کر ۱/۲-۲ آنے کر دیا گیا۔ بنگالی ممبروں نے زائد محصول کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ وہ بنگالی صارفوں کو نقصان پہنچا کر عدن کے پیدا کرنے والوں کی امداد کا اثر پیدا کرتا ہے۔ بہر صورت عدن اور برما کی ہندوستان سے قریب الوقوع علٰحدگی کے مدِنظر محصول تکرر غور چاہتا ہے۔ 36

۴۰۔ عمارتی پتھر

ہندوستان میں تعمیر کے کام کے لیے جو اہم ترین پتھر دستیاب ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک "ریت پتھر" ہے، جو بندھیاچل کے پہاڑی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ ریت پتھر ایک وسیع رقبے میں پائے جاتے ہیں جو ڈیہری (موقوعہ دریائے سون) سے ہوشنگ آباد اور گوالیار تک اور یہاں سے آگرہ اور نیمچ تک پھیلا ہوا ہے۔ اشوک کے زمانے سے موجودہ زمانہ تک ہندوستانی فن تعمیر کے متعدد عظیم شاہکار اسی پتھر سے تیار ہوئے ہیں۔ جزیرہ نما کے جنوبی حصے میں مختلف قسم کے آتشی پتھروں کو زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مرکز میں دوسرے قسم کے تعمیری مسالے سلیٹ (Slate) اور چونے کا پتھر ہیں؛ صوبۂ متوسط اور وسطی ہند وغیرہ میں باسلٹی (Basalt) چٹان پائی جاتی ہے؛ لیٹرائٹ یا خشتی پتھر ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے؛ مشہور پوربندری پتھر، بمبئی اور کراچی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے؛ ضلع جبل پور اور صوبۂ متوسط کے دوسرے علاقوں میں سنگ مرمر موجود ہے؛ اس کے

[۱] دیکھو باب متعلقہ "مالیہ" جلد دوم۔

باب ۲

علاوہ پتھروں کی بے شمار قسمیں ملک میں پائی جاتی ہیں ۔

۴۱ سمنٹ سازی کی اشیا

سمنٹ سازی کے لیے اہم ترین خام اشیا کھریا یا چونے کا پتھر، اور چکنی مٹی درکار ہوتی ہیں جو ہندوستان میں بکثرت دستیاب ہوتی ہیں؛ مثلاً ریاست بنڈی راجپوتانہ میں لاکھیری کے قریب اور کٹنی میں بھی، جہاں چونے کا پتھر اور چکنی مٹی عمدہ ملتی ہے ۔ دوسرے علاقے کاٹھیاوار میں پوربندر اور صوبۂ متحدہ میں لکھنو اور کانپور کے نواح ہیں ۔ ہندوستان میں بنی ہوئی پورٹ لینڈ سمنٹیں بہترین انگریزی قسموں کے مساوی خیال کی جاتی ہیں ۔ بحیثیت مجموعی ہندوستانی سمنٹ سازی کی صنعت کا مستقبل بظاہر بہت روشن معلوم ہوتا ہے ۔

۴۲ ۔ چونا

چونے کا سب سے اہم سرچشمہ چونہ کا پتھر ہے جس کا ذکر اس کے دوسرے مفید کاموں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ اس کی رسد تقریباً غیر محدود ہے اگرچہ صرف ان ہتوں اور طبقوں میں کام کیا جاتا ہے جن کا محل و قوع نقل و حمل کے اغراض کے لیے یا کسی اور خاص مقامی سبب سے بہت مناسب ہے ۔

۴۳ ۔ نباتی ذرایع

37 ملک کا وسیع رقبہ، بلندی کے اختلافات، عرض بلد کی وسعت، آب و ہوا اور مختلف خواص رکھنے والی زمینیں، ہندوستان کو انواع و اقسام کی نباتی پیداوار اگانے کے قابل بناتی ہیں جو منطقہ حارہ کے جنوب اور منطقہ معتدلہ میں پیدا ہوتی ہیں ۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل بیان سے اس کی توضیح ہوگی ۔ (۱) کھانے کے اجناس :۔ چاول بنگال، بہار و اوڑیسہ اور برما اور ایک حد تک بمبئی اور مدراس میں؛ گیہوں شمال و مغربی ہند میں؛ جوار اور باجرا بمبئی اور مدراس میں؛ مکائی بہار و اوڑیسہ، صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں؛ چنا پنجاب، بہار و اوڑیسہ، صوبۂ متحدہ اور صوبۂ متوسط میں ۔ (۲) جڑی بوٹی :۔ گرم مسالے اور بگھار مدراس، بمبئی اور بنگال میں؛ نیشکر کل ہندوستان میں، خاصکر صوبۂ متحدہ میں؛ قہوہ مدراس اور کورگ میں؛ چائے آسام اور بنگال میں؛ (۳) تخم :۔ السی، تل، سرسوں، رائی، مونگ پھلی اور ارنڈی وغیرہ جیسے روغندار تخم مدراس، صوبۂ متحدہ، صوبہ جات متوسط، بمبئی اور برما میں ۔ (۴) ریشے :۔ روئی بمبئی، برار، پنجاب اور مدراس میں؛ سن بنگال میں ۔ (۵) متفرق :۔ افیون صوبۂ متحدہ میں؛ تمباکو بنگال، بہار، بمبئی، اور مدراس میں؛ چارہ کی فصلیں پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں؛ جنوبی ہند اور برما میں سن کونا (کونین)؛ انڈیا ربر آسام، خاصیہ پہاڑی اور برما میں؛ ان کے علاوہ دوسری جنگل کی پیداوار ۔

باب ۲

۴۴ - حیوان

ہندوستان جیسے زرعی ملک کے لیے حیوانات کی موجودگی کی اہمیت پر
زور دینے کی بمشکل ضرورت ہے۔ ہندوستانی حالات کے تنوع نے فطری طور
سے حیوانات میں بھی بہت کچھ تنوع پیدا کر رکھا ہے۔ چنانچہ یورپ کے مقابلے میں ہندوستانی حیوانات
کے انواع و اقسام کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے۔ گائے اور بھینس کی قدر زیادہ تر دودھ دینے والے
جانوروں کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ زرعی معیشت کے نظام میں بیل اہم کام انجام دیتا ہے' نہ صرف
بار برداری کے جانور کی حیثیت سے بلکہ کھیتوں میں کام کرنے کی حیثیت سے بھی؛ اور گھوڑوں یا میکانکی
قوت کے استعمال سے کسان عملاً بے بہرہ ہے۔ زرعی کاروبار میں استعمال کیے جانے والے جانوروں
نیز بھیڑ بکریوں کا فضلہ ہندوستانی کسان کو اس کا مطلوبہ کھاد قریب قریب سب کا سب مہیا کرتا ہے؛
اور مصنوعی کھاد کا رواج ابھی بہت ہی ابتدائی حالت میں ہے۔ غریب گدھا ہر جگہ پایا جاتا ہے اور
اس سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ اونٹ' ملک کے ریتیلے علاقوں میں پایا جاتا ہے اور ریگستانوں میں حمل ونقل کے
کام میں لایا جاتا ہے۔ مچھلی بہت اہمیت رکھتی ہے' خاص کر بنگال' آسام' اور جزیرہ نما کے ساحلی خطوں جیسے علاقوں
میں چنانچہ یہاں کے رہنے والوں کی غذا میں' وہ نائٹروجن کے عناصر مہیا کرتی ہے جو دوسرے مقامات میں 38
دالوں سے پورے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی سمندروں میں کھانے کے قابل مختلف قسم کی مچھلیاں دستیاب
ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ذرائع ابھی اس بات کے محتاج ہیں کہ جدید طریقوں سے مناسب اور باقاعدہ طور پر کام لیکر فوائد حاصل کیے جائیں۔
ہندوستان کے وسیع جنگلات میں مختلف قسموں کے وحشی جانوروں اور پرندوں کی بہتات
ہے اور وہ شکاری کے لیے بہت اچھا شکار مہیا کرتے ہیں۔

۴۵ - قوت کے ذرائع

ہندوستان میں قوت کے اہم ذرائع کوئلہ' جلانے کی
لکڑی' تیل اور الکحل' ہوا اور پانی ہیں۔ کوئلہ کا ذکر معدنی
پیداوار کے تحت کیا جا چکا ہے۔ جنگلات کے افادے کا حال بھی جلانے کی لکڑی کی رسد کا
منبع ہونے کی حیثیت سے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن اکثر ہندوستانی جنگلات' پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے
ہیں جہاں سے نقل وحمل بہت دقت طلب اور بیش خرچ ہوتی ہے۔ اگر اس دقت کو بھی موثر طریقے
سے رفع کر لیا جائے تب بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا جلانے کی لکڑی کی رسد' طلب کا ساتھ صنعتی اغراض
کے لیے اس وقت تک دے سکتی ہے جب تک کہ وسیع پیمانے پر شجر بندی نہ کی جائے۔ صنعتی کمیشن
نے لکڑی کی کشید کے فوائد پر خاص طور پر توجہ مبذول کی ہے اور بیان کیا ہے کہ اس طریقے سے
لکڑی کا کوئلہ اور اسی کے ساتھ متھیلی الکحل' چوبی تارکول وغیرہ جیسی قیمتی ذیلی پیداوار حاصل

ہو سکتی ہے جس کو فروخت کرنے سے لکڑی کے کوئلے کی مقامی قیمت میں بہت بڑی حد تک کمی ہو جائے گی۔ کمیشن مذکور یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ قوت کے چھوٹے کارخانوں کو چھوڑ کر سب کارخانوں میں مصنوعی گیس پلانٹ Suction Gas Plant سے کام لیا جائے کہ اس سے انتہائی سہولت ہوگی اور کام اچھا ہوگا؛ اور اس نقطۂ نظر سے کمیشن ایسے طریقے اختیار کرنے کے بارے میں سفارش کرتا ہے جن کی بناء پر ایسے پلانٹ کے لیے ایندھن کی قیمت میں کمی ہونے کا قرینہ ہے۔ ہندوستان کی حیثیت تیل کے ذرائع کی حد تک معدنی پیداوار کے تحت جانچی جا چکی ہے اور اس بات پر زور دیا جا چکا ہے کہ اس سے کام لینے میں بڑی احتیاط کے ساتھ کفایت کی جائے لیکن چونکہ بلوچستان، پنجاب، آسام وغیرہ میں تیل کی موجودگی کے امکان کو اب بھی مشتبہ قرار دینا ضروری ہے اور چونکہ برما کے چشموں سے بسرعت استحصال کیا جا رہا ہے لہٰذا ہم اس خاص قسم کی قوت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کر سکتے۔

جس حد تک صنعتی اغراض کے لیے الکحل سے بطور قوت محرکہ استفادہ کرنے کے امکان کا تعلق ہے وہاں تک، بعض قسم کی نباتی پیداوار اس قابل معلوم ہوتی ہے کہ اس سے الکحل کی مطلوبہ مقدار نکالی جا سکے۔ لیکن یہ پھر بھی ایک قیاسی چیز ہے اور احتیاط کے ساتھ تحقیق اور تجربہ چاہتی ہے۔ اس کام میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جنگلی کی بندشوں کو کسی حد تک نرم کر دیا جائے۔

۶۴ - آبی قوت

ارزاں قوت محرکہ کی رسد، کامیاب صنعتی ترقی کے اساسی شرائط میں سے ایک ہے۔ صنعتی اغراض کے لیے قوت کی تکوین کی غرض سے کوئلہ جلانے کی لکڑی یا تیل کی رسد کے بارے میں ہندوستان کی صورت حال، مذکورہ اسباب کی بناء پر خاطر خواہ طریقے پر موافق نہیں ہے۔ لیکن آبی قوت کے ترقی پانے کے اچھے خاصے توقعات ہیں۔ اب تک آبی قوت، بارش کی موسمی نوعیت کے باعث محدود رہی ہے اور اس کے لیے پانی کے بیش خرچ ذخائر تعمیر کرنا ناگزیر ہے جو مقامات دور واقع ہیں ان میں برقی قوت پہنچانے کا طریقہ کامیاب ثابت ہونے سے پیشتر، روئی کی صرف دو ایک خاصی بڑی گرنیاں جیسی کہ بمقام گوکاک بمبئی میں ہیں اور متعدد چھوٹے کارخانے جو نخل بندوں کی زمینوں میں پہاڑیوں میں واقع ہیں کسی بڑی حد تک آبی قوت سے استفادہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں پہاڑی دریاؤں پر اور آب پاشی کی نہروں میں آبشاروں پر پن پہیے آٹے کی گرنی چلانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے لیکن حالیہ زمانے میں بڑی بڑی برقابی تجاویز پر بہت کچھ توجہ مبذول کی گئی ہے۔ چنانچہ دربار میسور نے پہلا برقابی

باب ۲

کارخانہ مشرق میں بمقام سیواسمودرم دریائے کاویری پر ۱۹۰۲ء میں قائم کیا جس کا اولین مقصد معدنِ طلائے کولار کو قوت مہیا کرنا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد دربارِ کشمیر نے اسی کے مماثل کارخانے دریائے جھلم پر قائم کیے جن میں بیس ہزار برقی اسپی قوت کی تکوین کے لیے کافی پانی لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ احاطۂ بمبئی میں مغربی گھاٹ اس قسم کی تجاویز کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں، چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہندوستان کے عظیم ترین برقابی کارخانے ان ہی علاقوں میں واقع ہیں۔ ٹاٹا ہائڈرو الکٹرک اسکیم، یعنی برقابی تجویز، ہندوستان کی صنعتی ترقی میں ایک بہت بڑی پیشقدمی کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ ٹاٹا ہائڈرو الکٹرک پاور سپلائی کمپنی نے اس قسم کے کارخانوں میں سے پہلا کارخانہ ۱۹۱۵ء میں لوناولا کے نواح میں کھولا لیکن بمبئی کی گرنیوں کی عظیم صنعتی طلب پھر بھی ایک حد تک تشنہ ہی رہی، اور برقی رسد کو مزید ترقی دینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بعد کی تجویز جو وادیٔ آندھرا کی برقی اسکیم (مابتہ ۱۹۲۲ء) کے نام سے موسوم ہے اس بات کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی گئی ہے کہ اس سے پوری ترقی کی حالت میں ایک لاکھ اسپی قوت مہیا ہوگی۔ ایک اور اہم منصوبہ جس پر "نیلا مولا کی تجویز" کے نام سے ٹاٹا پاور کمپنی ۱۹۲۷ء سے کام کر رہی ہے اسکے متعلق یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ اسپی قوت مہیا ہوگی؛ اور دریائے کونا کی کشادہ وادی میں ٹاٹا کی ایک اور عظیم الشان تجویز زیرِ غور ہے۔ ان تجاویز کے روبہ عمل آنے کے نتیجے کے طور پر بمبئی کو اس کے قرب وجوار میں کوئلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے جو گھاٹا تھا وہ بالکل رفع ہو جائیگا، اس لیے کہ یہ سب کارخانے معمولی طور پر ۲۴۶۰۰۰ اسپی قوت مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسری جانب بھاپ کی جگہ برقی قوت لے لینے کی وجہ سے بمبئی کی صحتِ عامہ کے حالات کی بھی بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ چنانچہ بمبئی کی سوتی کپڑے کی گرنیاں اور دوسرے کارخانے کم وبیش ڈیڑھ لاکھ اسپی قوت صرف کرتے ہیں۔ تھانہ، کلیانی اور عظیم تر پونہ بھی اپنی برقی قوت کی رسد اسی ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک اور اہم برقابی مہم پنجاب کی مانڈی کی تجویز ہے جس کے مکمل طور پر عملی صورت اختیار کر لینے کے بعد توقع ہے کہ قوت کی عظیم مقدار مہیا ہوگی جس سے صنعتی مرکزوں کی بہت بڑی تعداد کام لے سکے گی اور دہلی جیسے دور افتادہ مقامات بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ ۱۹۳۳ء میں اس اسکیم کا کام شروع ہوا۔ مدراس میں جو بمبئی کے مقابلے میں کوئلے کی عدم موجودگی کی بنا پر بہت زیادہ مشکلات میں گھرا ہوا ہے، کچھ سال ادھر بعض 40
دلچسپ ترقیاں رونما ہوئی ہیں۔ پائی کارا برقابی تجویز پر ۱۹۲۹ء کے اختتام پر حکومتِ مدراس نے عمل شروع کیا اور اس پر اب کام ہو رہا ہے۔ اس تجویز کی نشوونما کے لیے پائی کارا ندی کے پانی سے استفادہ کیا جاتا ہے جس کا منبع نیلگری کی سطح مرتفع ہے۔ "میٹر برتا ہا تجویز" جس کو مشہور "میٹر کی

باب ۲

آب پاشی کی تجویز سے ملا دیا گیا ہے، اس پر کام جاری ہے؛ اور تکمیل ہونے کے بعد وہ ۶۰ ہزار اسپی قوت کی بیش ترین پیداوار تیار کرنے کے قابل ہوگی۔[1] اس تجویز پر ۱۹۲۳ء سے عمل شروع ہوا۔ صنعتی کمیشن کی سفارشوں کے مطابق حکومت ہند نے ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی ایک مکمل آبی مساحت کی۔ اس مساحت کے نتائج سے متعدد دلچسپ امکانات برقابی قوت کی ترقی کے سلسلے میں معلوم ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں بجانب مشرق سات بڑے دریاؤں کے پانی کا اعلیٰ ترین بہاؤ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہمالیہ سے ہزار فٹ کے ڈھال پر کم از کم تین ملین اسپی قوت مہیا کرے۔ علیٰ ہذا دوسرے علاقوں کے دریاؤں کے بارے میں بھی یہی بات کم و بیش صادق آتی ہے۔ یہ توقع کی گئی ہے کہ برقابی تجاویز نہ صرف صنعتوں کو قوت مہیا کرنے کے لیے بلکہ ہندوستان میں آب پاشی کی سہولتوں میں وسعت پیدا کرنے کی حد تک بھی مفید ثابت ہوں گی۔

ممکن ہے کہ ہمیں ایسے زمانے کی آمد کی خوش آیند توقع قائم کرنے کی ترغیب ہو جبکہ ہر گاؤں کو جو برقابی قوت کے مستقر سے مناسب فاصلے پر واقع ہو برقی لہروں کی رسد مہیا کی جائے گی جس سے اس کو اپنی دیہی صنعتوں کو ترقی دینے اور دیہی زندگی کے آرام و آسایش میں اضافہ کرنے میں مدد ملے گی۔ ان خوشگوار توقعات کے پورا ہونے کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمت یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر تجاویز کے ابتدائی مصارف نہایت کثیر ہوتے ہیں۔ بارش چونکہ موسم پر موقوف ہے، اس لیے بیش قیمت ذخیرہ ہائے آب کی تعمیر ضروری ہے اور اس طرح جو مصارف عائد ہوں گے ان کی بنا پر قوت کافی ارزاں نرخ پر مہیا کرنا دقت طلب ہوگا۔ بمبئی جیسے صنعتی مرکزوں میں بھی جہاں کوئلہ گراں ہے، ابھی تک برقابی قوت مقابلتہً کافی ارزاں ثابت نہیں ہوئی ہے۔ آیا سائنس اس وقت کو رفع کرے گی یا نہیں اس کو صرف مستقبل ہی ثابت کر دکھا سکتا ہے۔[2]

۴۷۔ دولتمند ملک کے مفلس باشندے

مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان نہایت زرخیز ملک ہے اور انواع و اقسام کے قدرتی ذرایع رکھتا ہے۔ یہ ایک پامال مقولہ ہے کہ گو قدرت نے اپنی نعمتیں فراخدلی کے ساتھ ملک کو دے رکھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اہل ہند ان سے پوری طرح بہرہ ور ہونے اور استفادہ

[1] دیکھو انڈین ایر بک بابتہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۳۴۶۔
[2] دیکھو گاڈگل کی اصل تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۳۸ تا صفحہ ۲۳۹۔

کرنے سے قاصر رہے۔ یہاں قدرت کے وافر عطیے کے مقابلے میں انسان کا افلاس بہت نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے یہ مقولہ عام طور سے مشہور ہوگیا اور تقریباً کہاوت بن گیا ہے کہ ہندوستان ایک دولتمند ملک ہے جس کے باشندے نادار اور مفلس ہیں۔

باب ۳

آبادی

۱۔ مجموعی آبادی

۱۹۳۱ء کی گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی 41
کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷ سو ۷۸ ہے جس کے منجملہ برطانوی ہند میں ۲۷ کروڑ ۱۵ لاکھ ۲۶ ہزار ۹ سو ۳۳ نفوس اور دیسی ریاستوں میں ۸ کروڑ ۱۳ لاکھ ۱۰ ہزار آٹھ سو ۴۵ نفوس آباد ہیں۔ گو ہندوستان، رقبے میں ریاستہائے متحدہ امریکا کا نصف ہے؛ لیکن ریاستہائے متحدہ کی آبادی کے قریب قریب تگنی آبادی رکھتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی، کل دنیا کی آبادی کا تقریباً $\frac{1}{5}$ ہے۔

۲۔ صوبوں اور ریاستوں میں آبادی اور مذاہب کے اعداد و شمار

صفحہ ۵۸ الف پر مندرجہ جدول میں صوبوں اور ریاستوں کے متعلق حسب ذیل تفصیلات

باب ۳

دئے گئے ہیں (۱) مجموعی آبادی اور گنجانی فی مربع میل؛ (۲) عورتوں کی تعداد فی ہزار مرد؛ (۳) آبادی کی تقسیم بہ لحاظ مذہب؛ (۴) ۱۸۸۱ئہ تا ۱۹۲۱ئہ میں مجموعی آبادی میں فی صد تغیر اور (۵) ۱۹۲۱ئہ تا ۱۹۳۱ئہ میں بعض مذاہب میں فی صد تغیر۔ آبادی کے مختلف پہلوؤں پر جو اس جدول میں اعداد کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

۳۔ آبادی کی گنجانی کو متعین کرنے والے عامل

آبادی کی گنجانی (یعنی تعداد نفوس جن کی کفالت ایک مربع میل میں ہوتی ہے) آب و ہوا کے حالات، جان و مال کے تحفظ، آرام و آسایش کے معیار، معاشی ذرایع اور معاشی ترقی کی حالت پر منحصر ہے؛ دوسرے الفاظ میں گنجانی کا مدار خارجی ماحول پر اور انسان کی جانب سے اس کے استفادے پر ہے۔ اگر کسی ملک کے معاشی ذرایع وافر اور زرخیز ہوں تو، دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، ظاہر ہے کہ وہ قلیل اور کم زرخیز معاشی ذرایع رکھنے کی صورت کے مقابلے میں زیادہ گنجان آبادی کی کفالت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں کوئی قوم اپنے تہذیب و تمدن کے فنون کے لحاظ سے جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی اتنی ہی زیادہ صلاحیت اس میں ایک گنجان آبادی کی کفالت کی ہوگی۔ صنعتی و تجارتی حیثیت سے ایک اعلیٰ درجے کا ترقی یافتہ ملک جس میں کاشت عمیق ہو رہی ہو، معمولی طور پر گنجان آبادی رکھتا ہے، مثلاً انگلستان اور ویلس (۶۸۵ فی مربع میل) اور بلجیم (۶۵۴ فی مربع میل)۔ اگر ملک خالصتاً زرعی ہو تو، اس سے بہ درجہا کم آبادی کی وہ کفالت کر سکے گا۔ یہ واقعہ کہ ہندوستان اساسی حیثیت سے ایک زرعی ملک ہے یہاں کی آبادی کی گنجانی کے قلیل اوسط کی توجیہ کر دیتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر ملک گلہ بانی کے دور میں سے گزر رہا ہو تو، وہ زرعی دور کے مقابلے میں فی مربع میل قلیل تر تعداد میں نفوس کی کفالت کرے گا، اور شکار کے دور میں تو اس سے بھی بہ درجہا کم۔ زرعی ملک میں آبادی کی گنجانی کا انحصار زراعت کی نوعیت پر بھی ہوگا۔

باب ۳ محض یہ امر کہ کتنے نفوس کی فی مربع میل کفالت ہوتی ہے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، تاوقتیکہ ہم زیر بحث آبادی کے آرام و آسائش کے معیار کو بھی ملحوظ نہ رکھیں۔ مثلاً بنگال کی گنجانی کا اوسط ۶۴۶ فی مربع میل ہے، جو بلجیم یا انگلستان اور ویلس کے اوسط کے قریب قریب ہے۔ لیکن جہاں تک خوش حالی کے معیار کا تعلق ہے وہاں تک 44 بنگال ان دو مذکورۂ بالا ممالک میں سے کسی سے بھی مقابلہ نہیں کرتا۔ بنگال میں گنجان آبادی کی موجودگی صرف اس کے افلاس کو ظاہر کر سکتی ہے، اس لیے کہ بنگال بڑی حد تک زرعی ملک ہے؛ چنانچہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بہترین حالات کے تحت، زراعت، آرام و آسائش کے مناسب معیار پر ۲۵۰ نفوس فی مربع میل سے زیادہ کی کفالت نہیں کر سکتی۔

۴۔ گنجانی اور خوش حالی

قریب ترین زمانے کی مردم شماری کے بموجب کل ہندوستان میں آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۹۵ نفوس فی مربع میل ہے۔ مندرجۂ ذیل جدول میں مقابلے کی غرض سے بعض دوسرے ملکوں کی اوسط گنجانی کے اعداد پیش کئے جاتے ہیں:۔

ملک	اوسط آبادی فی مربع میل	ملک	اوسط آبادی فی مربع میل
بلجیم	۶۵۴	آسٹریا۔	۱۹۹
انگلستان و ویلس	۶۸۵	اسپین	۱۰۷
فرانس	۱۸۴	جاپان	۲۱۵
جرمنی	۳۳۲	ریاستہائے متحدہ امریکا	۴۱
ہالینڈ	۵۴۴	نیوزی لینڈ	۱۱،۸
		مصر	۳۴
		چین	۲۰۰

باب۲

مندرجۂ بالا جدول پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ اوسط گنجانی کی بنا پر معاشی حالت و حیثیت کے متعلق نتائج اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ اور مصر دونوں ادنیٰ گنجانی ظاہر کرتے ہیں، لیکن ریاستہائے متحدہ کا تمول مقابلۃً بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف ایک جانب ریاستہائے متحدہ اور دوسری جانب انگلستان و ویلز کے مابین گنجانی کے لحاظ سے تو بہت بڑا فرق ہے، لیکن یہ فرق ان کی معاشی حیثیت کے اعتبار سے، ان کے مساوات پر رہنے میں مانع نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ہر ملک کی حالت کی جداگانہ تحقیق کرنی چاہیئے تاکہ اس کی آبادی کی گنجانی اور اس کی معاشی حالت کا باہمی تعلق، اگر کچھ ہو تو معلوم ہوجائے۔

صفحہ ۵۸ الف —— پر مندرجہ جدول سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں میں آبادی کی گنجانی میں بہت ہی عظیم اختلافات ہیں۔ یوں تو آبادی کی گنجانی پر متعدد عوامل اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان کے منجملہ کسی ایک عامل کے حوالے سے آبادی کی عدم مساواتوں کی توجیہ کرنا بہت شاذ ہی ممکن ہے۔ مثلاً یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندوستان میں بارش ہی اساسی طور سے کثرت آبادی کا تعین کرتی ہے؛ اس لیے کہ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ بارش جنوبی برما میں ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود آبادی کے لحاظ سے وہ سب سے کم آباد خطوں میں سے ایک خطہ ہے۔ اگر بارش مقررہ حد سے متجاوز ہوجائے تو، بجائے نفع بخش ہونے کے قطعاً نقصان رساں ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بہترین حالات پیدا کرنے کے لیے بارش کا سالانہ اوسط تقریباً ۴۰ انچ ہونا ضروری ہے، بشرطیکہ بارش کی تقسیم مناسب ہو۔ صرف اس صورت میں جبکہ بارش اس سے کم ہو یا اس کی تقسیم ناقص ہو، بارش کی مقدار کے اختلافات زراعت پر اور اس طرح آبادی کی گنجانی پر قابل لحاظ اثر ڈالتے ہیں۔ کاشت کی کامیابی کا انحصار جس حد تک پانی پر ہو، اس حد تک آب پاشی بدیہی طور سے وہی اثر ڈالے گی 45
جو بارش ڈالتی ہے؛ اور اس لحاظ سے جہاں آب پاشی کا انتظام ہو وہاں گنجانی کو متعین کرنے میں وہ ایک اہم عامل ہوتی ہے۔

باب ۳

لیکن اس واقعے کا لحاظ کرتے ہوئے کہ آب پاشی کا اثر ہندوستان کے مجموعی رقبے کے بہت ہی چھوٹے جزو پر پڑتا ہے، گنجانی پر اس کے اثر کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملک کو بحیثیت مجموعی لیا جائے تو، سطح کی شکل اس سے بدرجہا زیادہ اہم عامل ہے۔ اگر دوسرے حالات مساوی رہیں تو، کامیاب زراعت کا انحصار زیادہ تر سطح کی شکل پر ہوتا ہے۔ زمین ہموار و مسطح ہو تو، ہر ہر انچ پر کاشت ممکن ہے اگر زمین غیر مسطح و ناہموار ہو تو، کاشت عام طور پر دقت طلب اور پُرخطر ہوتی ہے، خواہ نشیبی علاقے بہت ہی زرخیز کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنجان آباد خطے مسطح میدان ہیں، مثلاً بنگال، مشرقی صوبۂ متحدہ اور جنوبی جزیرہ نما میں مشرقی ساحل پر نشیبی خطے۔ وسیع میدان، جن میں زرخیز زمین کے طویل و عریض خطے موجود ہوں اور بارش بھی خاصی ہوتی ہو، بدیہی طور سے کثرتِ آبادی کے موئد ہیں، جیسے بنگال اور صوبۂ متحدہ۔

یہ واقعہ کہ ان اعتبارات سے حالات اس قدر موافق نہیں ہیں بمبئی کی نسبتہً ادنیٰ گنجانی کی توجیہ کرتا ہے۔ برما میں چونکہ جنگلات کا بہت بڑا رقبہ موجود ہے، اس لیے اس کی آبادی مقابلتہً کم ہے (بلکہ بحالت موجودہ گنجائش کے لحاظ سے آبادی بہت کم ہے)۔ بعض اوقات ناموافق آب و ہوا، دوسرے فوائد اور دوسری سہولتوں کو زائل کر دیتی ہے اور مقابلتہً ادنیٰ گنجانی کی جانب رہبری کرتی ہے، جیسا کہ آسام میں۔

زمین کی نوعیت، صرف اس وقت اہم عامل بن جاتی ہے جبکہ زمین کی خوبی کے ساتھ ساتھ بارش بھی نہاں ضروری مقدار میں ہو۔ فی نفسہ زمین کی نوعیت کا اثر ہندوستان میں بہت نمایاں اور قابل لحاظ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اختلافات بحیثیت مجموعی اس قدر باریک ہیں کہ بڑے رقبوں سے بحث کرتے وقت ان کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔

آبادی کی گنجانی کی عدم مساواتوں کا باعث ایک حد تک لوگوں کی یہ عادت بھی ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نہیں جاتے، اور آزادانہ اندرونی نقل پذیری کی راہ میں متعدد دوسری دقتیں بھی حائل ہیں۔ دہلی کی مثال (جس کی گنجانی کا اوسط فی مربع میل = ۱۱۰ ہے) اپنی آپ نظیر ہے، اس لیے کہ شہر دہلی کی کثیر شہری آبادی

سے دہلی ڈویژن کی مجموعی آبادی کا بڑا جزو مرتب ہوتا ہے۔

۵ - آبادی کی تقسیم بلحاظ مذہب [1]

خام اندازے کے بموجب برطانوی ہند میں بسنے والے ہر سو اشخاص میں سے ۶۸ ہندو، ۲۲ مسلمان، ۳ بدھ مت کے پیرو ۳ مظاہر پرست، ا سکھ اور ا عیسائی ہیں۔ اس کا مساوی قرینہ ہے کہ بقیہ دو میں سے ایک عیسائی یا بدھ مت کا پیرو اور دوسرا اجنبی ہو جیسا کہ صفحہ ۵۸ الف کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے، وسطی و جنوبی ہند میں دوسری قوموں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے، اور یہ حالت خاص کر احاطۂ مدراس میں زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں ہندوؤں کی آبادی کل آبادی کے ۸۹ فی صد سے کم نہیں ہے۔ دوسرے
صوبے جہاں ہندو آبادی کی کثرت ہے آسام، بہار و اڑیسہ، صوبۂ متحدہ، وسطی ہند 46
راجپوتانہ اور بمبئی ہیں۔ اس کے برخلاف شمال مغربی صوبۂ سرحدی، بلوچستان اور کشمیر میں تقریباً کل آبادی مسلمانوں کی ہے اور پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بدھ مت کے پیرو، تقریباً سب کے سب برما میں آباد ہیں؛ چنانچہ وہاں کی آبادی کا ۸۵ فی صد حصہ بدھ مت کا پیرو ہے۔ علیٰ ہذا اسکھ پنجاب میں محدود ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان میں جین مت کے پیروؤں کی تعداد ۱۲۵۲۱۰۵ تھی، اور اس مجموعے کا کم و بیش نصف حصہ احاطۂ بمبئی، مدراس کے زیر اثر دیسی ریاستوں اور بڑودہ میں تھا۔[2] جن قدیم و نیم مہذب قوموں کو "مظاہر پرستوں"[3] کی ذیل میں شمار کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر بہار و اڑیسہ، صوبۂ متوسط اور آسام میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ

لہ - مردم شماری کی رپورٹ (بابتہ سنہ ۱۹۳۱ء)، صفحہ ۳۸۷، اور ایک کتاب موسوم بہ "انڈین ایر بک بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء" صفحہ (۴۰)۔

ٰ٢ - ہم فنڈلے شراس صاحب کے ممنون ہیں کہ ان سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی؛ (چنانچہ دیکھو اکنامک جرنل Economic Journal ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء، صفحہ ۴۶۹)۔

٣ - Animists

ایک خاصی بڑی تعداد بنگال، برما، مدراس، راجپوتانہ، وسطی ہند اور حیدرآباد میں بھی موجود ہے۔ عیسائیوں کی مجموعی آبادی کا ۳/۵ حصہ جنوبی ہند میں رہتا ہے۔ پارسی اور یہودی زیادہ تر احاطۂ بمبئی میں آباد ہیں۔

۶۔ آبادی کی تقسیم بلحاظ پیشہ

صفحہ ۶۴ پر مندرجہ اعداد[1] سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف پیشوں کی اضافی اہمیت کیا ہے جن کے ذریعے سے باشندگان ہند کسب معاش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہ پیشہ زراعت کو کثیر غلبہ حاصل ہے اور یہی آبادی کے بیشترین حصے کا ذریعۂ معاش ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آبادی کی تقسیم بہ لحاظ پیشہ میں کوئی بڑا تغیر ہوا ہے، بجز اس واقعے کے "نقل و حمل" کے تحت کچھ حقیقی اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ "دس سال کی مدت میں رسل و رسائل میں ہر جگہ اضافہ ہو گیا ہے، سڑکوں کی حالت بہتر ہو گئی ہے اور موٹروں کی آمد و رفت ہر جگہ ہونے لگی ہے۔" دماغی پیشوں اور فنون درسی کے تحت خفیف اضافہ ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد بتدریج زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں مزدوروں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں زراعت میں کام کرنے والوں کا تناسب ۹ء۷۰ تھا، اور اس کے برخلاف سنہ ۱۹۳۱ء میں ۶ء۶۵ ہو گیا۔ ڈاکٹر ہٹن ناظم مردم شماری کی رائے میں یہ تخفیف حقیقی نہیں ہے بلکہ ظاہری ہے، اور اس کا باعث یہ ہے کہ زراعت سے جن عورتوں کی کفالت ہوتی ہے ان کی کثیر تعداد کو غلطی سے خانگی ملازموں میں محسوب کیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مزدوروں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں جہاں صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا فی صدہ ۳۸ء۱۰ ہے وہیں ان میں سے صرف ۵ء۱ فی صد کی کفالت منظم صنعتوں کے ذریعے سے ہوتی ہے[2]۔

---

[1] دیکھو "برطانوی ہند کا اعدادی خلاصہ" Statistical Abstract of British India سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء جدول نمبر (۱۰)

[2] نیز دیکھو باب ۲، جلد دوم۔

باب ۲

47

مزدوروں کی تقسیم پیشوں یا ذرائع معاش کے لحاظ سے (مطابق مردم شماری ۱۹۳۱ء)

پیشہ یا ذریعۂ معاش («اقسام» اور ذیلی اقسام)	[illegible] تعداد[2]	حقیقی مزدور[1] مرد	حقیقی مزدور[1] عورتیں	ذیلی پیشہ (مزدوروں کے عزیز)	[illegible] مزدوروں کا تناسب
ا۔ خام اشیا کی تیاری	۱۱۱،۱۶۴،۵۸۶	۷۴،۷۰۰،۵۸۵	۱۸،۹۳۹،۸۵۴	۷،۵۲۴،۱۴۷	۶۵٫۸۴
(۱) حیوانات و نباتات کا استعمال	۱۱۰،۹۷۰،۳۲۴	۷۴،۴۴۱،۰۰۲	۱۸،۸۵۳،۴۳۷	۷،۴۶۵،۸۸۵	۶۵٫۶۰
(۲) معاون کا استعمال	۴۰۴،۲۶۲	۲۵۹،۵۸۳	۸۶،۴۱۷	۵۸،۲۶۲	٫۲۴
ب۔ مادی اشیا کی تیاری اور بہم رسانی	۲۹،۶۶۹،۴۷۱	۱۸،۶۸۲،۳۴۱	۶،۹۲۴،۶۱۵	۴،۰۳۲،۵۱۵	۱۷٫۵۶
(۳) صنعت	۱۷،۵۲۲،۶۸۲	۱۰،۷۹۷،۵۲۷	۳،۵۵۴،۴۲۶	۲،۱۷۲،۰۲۹	۱۰٫۳۸
(۴) نقل و حمل	۲،۷۷۸،۵۲۰	۲،۰۹۹،۱۹۸	۲۴۲،۲۰۸	۴۳۷،۱۱۴	۱٫۶۵
(۵) تجارت	۹،۳۳۶،۶۶۹	۵،۷۸۵،۶۱۶	۲،۱۲۷،۹۸۱	۱،۴۲۳،۳۷۲	۵٫۵۳
ج۔ سرکاری نظم و نسق اور فنون مدنی	۴،۸۱۹،۴۵۲	۳،۷۸۳،۴۵۴	۳۶۳،۴۴۵	۶۷۲،۵۵۳	۲٫۸۶
(۶) جمعیتہ عامہ	۹۴۱،۲۲۲	۸۳۴،۴۵۳	۷،۰۲۱	۹۹،۹۴۹	٫۵۶
(۷) انتظام عامہ	۱،۱۵۲،۹۶۳	۹۶۲،۷۴۱	۳۲،۵۴۳	۱۵۸،۶۷۹	٫۶۹
(۸) پیشے اور فنون مدنی	۲،۷۲۳،۱۶۶	۱،۹۸۹،۲۶۰	۳۲۳،۸۸۱	۴۱۴،۰۲۵	۱٫۶۱
د۔ متفرق	۲۳،۲۰۳،۴۸۹	۷،۹۱۷،۴۳۲	۱۲،۹۰۱،۲۱۸	۲،۶۸۴،۸۴۹	۱۳٫۷۴
(۹) زیادہ تر آمدنی پر گزارہ کرنیوالے اشخاص	۲۸۰،۹۵۵	۱۶۸،۸۲۹	۴۷،۰۴۵	۶۵،۰۸۱	٫۱۶
(۱۰) خانگی	۱۲،۶۷۴،۱۱۰	۲،۰۹۴،۴۸۷	۸،۸۰۳،۷۹۰	۱،۷۷۵،۸۳۳	۷٫۵۱
(۱۱) ایسے پیشے جن کی پوری طرح تعریف نہیں کی گئی	۸،۴۹۹،۶۸۹	۴،۵۹۹،۲۳۸	۳،۱۷۹،۴۰۴	۷۲۱،۰۴۷	۵٫۰۳
(۱۲) غیر پیدا آور	۱،۷۴۸،۷۳۵	۱،۰۵۴،۸۷۸	۵۷۰،۹۶۹	۱۲۲،۸۸۸	۱٫۰۴
میزان	۱۶۸،۸۳۰،۱۱۴[3]	۱۰۵،۰۸۳،۸۱۲	۴۸،۸۲۹،۱۲۲	۱۴،۹۱۴،۰۹۴	۱۰۰٫۰۰

۱۔ بشمول ذیلی پیشہ

۲۔ ۳،۱۱۲ کمانے والوں (یعنی ۲،۵۲۱ مردوں اور ۵۹۵ عورتوں) کو شامل کر کے جن کے پیشے منسوب نہیں کئے گئے تھے۔

۳۔ کمانے والے اور کام کرنے والے وابستگان ملا کر۔

باب ۲

باقی مزدوروں کا بڑا حصہ غیر منظم صنعتوں میں مصروف ہے جو ذاتی اور خانہ داری کی ضرورتوں اور کام کے سادہ آلات کی بہم رسانی کے متعلق ہیں۔ ملک کے نظم و نسق 48
اور اس کی حفاظت میں مزدوروں کی مجموعی تعداد کا صرف ½ فی صد حصہ مصروف ہے، اور بقیہ تعداد کی کفالت؟ خانہ داری، متفرق اور غیر پیداآور پیشوں سے ہوتی ہے۔ گو مختلف صوبوں میں زرعی پیشہ، دوسرے پیشوں پر مختلف تناسب کے ساتھ غالب ہے، پھر بھی کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے جس میں زراعت کسی نہ کسی شکل میں صف اول میں نہ ہو۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ ایک تجارتی شہر ہے اور بنگال، بہار اور اوڑیسہ میں بے شمار صنعتی و معدنی کاروبار جاری ہیں، مشرقی صوبوں کی آبادی کی بڑی اکثریت کا پیشہ زراعت ہی ہے اور ہندوستان کے کسی دوسرے خطے کے مقابلے میں یہاں زراعت کے ذریعے سے کسب معاش کرنے والوں کی تعداد کا فی صد بہت زیادہ ہے۔ صنعتی مزدوروں کی حد تک مقامی آبادی کا سب سے بڑا تناسب حصہ پنجاب، صوبہ متحدہ اور بمبئی میں موجود ہے۔ لیکن ان تینوں صوبوں کے منجملہ پہلے دو صوبوں کی معاشی زندگی میں زراعت ہی کو غلبہ حاصل ہے، اور گو صنعتی پیشوں میں اشخاص کی کثیر تعداد مصروف ہے پھر بھی یہ پیشے زیادہ تر گھریلو صنعت کی نوعیت رکھتے ہیں۔ بمبئی میں، منظم صنعت کی ترقی کسی حد تک معاشی اہمیت رکھتی ہے؛ لیکن سردست وہ زیادہ تر چند بڑے بڑے شہروں تک محدود ہے۔ غیر مشخصہ پیشوں کی ذیل میں اشخاص کی اکثریت مزدور پیشہ ہے جن کی محنت مخصوص و معین شکل نہیں رکھتی، اور بقیہ اشخاص زیادہ تر غیر معین محرر ہیں۔

دنیا کے مہذب و متمدن ممالک میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت پر انحصار کرنے والی آبادی کا تناسب سب سے بڑا ہے، اور صنائع، تجارت، نقل و حمل وغیرہ میں کام کرنے والی آبادی کا تناسب سب سے کم ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کی توضیح مندرجہ ذیل جدول میں کی گئی ہے[1] جس میں یہ

[1] دیکھو برج نرائن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی آبادی" صفحہ ۹۲۔

باب ۳

بتایا گیا ہے کہ ہر پیشے کے ذریعے سے مجموعی آبادی کے کتنے فی صد کی کفالت ہوتی ہے۔

ملک مع سال مردم شماری	حیوانات ونباتات کا انحصال	کان کنی اور صنعت	تجارت اور نقل وحمل
جرمنی ۱۹۰۷ء	۲۸٫۶	۴۲٫۲	۱۳٫۴
آسٹریا ۱۹۱۰ء	۴۸٫۴	۲۶٫۵	۱۲٫۴
اٹلی ۱۹۱۱ء	۳۴٫۲	۱۶٫۹	۵٫۰
اسپین ۱۹۱۰ء	۲۱٫۱	۵٫۲	۱٫۵
فرانس ۱۹۱۱ء [۱]	۴۰٫۷	۳۵٫۸	۹٫۸
ہالینڈ ۱۹۰۹ء	۱۰٫۹	۱۳٫۵	۷٫۵
ڈنمارک ۱۹۱۱ء	۳۶٫۴	۲۷٫۳	۱۶٫۶
سوئٹزرلینڈ ۱۹۱۰ء	۲۷٫۷	۴۲٫۷	۱۶٫۴
برطانیہ عظمیٰ وآئرلینڈ (صرف مزدور) ۱۹۱۱ء [۲]	۱۱٫۶	۵۶٫۸	۱۳٫۱
ریاستہائے متحدہ (دس سال سے زیادہ عمر کے مزدور) ۱۹۲۰ء	۲۶٫۳	۳۳٫۴	۱۷٫۹
ہندوستان ۱۹۳۱ء	۶۶٫۴	۹٫۵	۷٫۰

اگر کسی ملک کی معاشیات کا انحصار اتنی بڑی حد تک زراعت پر ہوجتنا کہ ہندوستان کا ہے تو، اس ملک کی معاشیات کا غیر مستقل وغیر ثبات پذیر رہنا ضروری ہے۔ زراعت پر انحصار کے معنے بارش پر انحصار کے ہیں؛ اور اگر بارش نہ ہو تو، اس کے نتیجے کے طور پر تکلیف ومصیبت کا دور دورہ ہوگا اور باشندوں 49

[۱] ان اعداد کا تعلق صرف مزدوروں سے ہے۔

[۲] قریب ترین زمانے کے اعداد وشمار (۱۹۳۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں تقریباً ۵۰ فی صد مزدوروں کا ذریعۂ معاش صنعت ہے اور ۸ فی صد کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔

باب ۳

کی اکثریت اس سے متاثر ہوگی۔ اگر باشندوں کا بڑا حصہ زراعت پر براہ راست انحصار کرنا ترک کردے تو ایسی صورت پیدا نہ ہوگی۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے صورت حال کے متعلق نہایت صحیح اندازہ لگایا جب اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہندوستان کے باشندوں کے افلاس اور ان کو پیش آنے والے خطرات و مصائب کا باعث بڑی حد تک یہ بدبختانہ واقعہ ہے کہ زراعت، آبادی کے بڑے حصے کا تقریباً واحد پیشہ ہے؛ اور اس صورتِ حال کی اصلاح کی تدبیر کے طور پر کمیشن سفارش کرتا ہے کہ صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ملک کے معاشی ذرائع کی ہر جہتی ترقی کے ذریعے سے آبادی کو اس سے زیادہ مساویانہ طور سے پیشوں میں تقسیم کرنا نہایت مناسب اور ضروری ہے۔

۷۔ شہروں اور دیہات کی آبادی[۱]

شہروں اور دیہی علاقوں میں آبادی کی تقسیم سے زراعت کی غالب حیثیت کا مزید ثبوت ملتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کے پیشے ان کی بود و باش کے مقام کا تعین کرتے ہیں۔ مجموعی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کا فی صد ۱۹۲۱ء میں ۲ر۱۰ تھا، جو ۱۹۳۱ء میں کچھ بڑھ کر ۱۱ فی صد ہو گیا۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے شہری اور دیہی آبادیوں کے تغیرات معلوم ہوں گے؛ اور "مجموعی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کا بہت ہی قلیل تناسب اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی آبادی اور دیہی آبادی کے تغیرات قریب قریب برابر ہیں، اور اس کے برخلاف مجموعی آبادی اور شہری آبادی کے تغیرات میں بہت بڑا تفاوت ہے۔

اضافہ از ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء

مجموعی	شہری	دیہی
۶ر۱۰ فی صد	۲۰ فی صد	۶ر۹ فی صد

[۱] مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول صفحہ ۴۴۔

جدول الف

مقاموں کی تقسیم	سنہ ۱۹۳۱ء: مقاموں کی تعداد	سنہ ۱۹۳۱ء: آبادی	سنہ ۱۹۲۱ء: مقاموں کی تعداد	سنہ ۱۹۲۱ء: آبادی	مجموعی آبادی فی ہزار کے شمار سے: سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۸۹۱ء
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
مجموعی آبادی	۶۹۹،۴۰۶	۳۵۲،۸۳۷،۷۷۸	۶۸۷،۹۸۱	۳۱۸،۹۴۲،۴۸۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
شہری علاقے	۲،۵۷۵	۳۸،۹۸۵،۴۲۷	۲،۳۱۶	۳۲،۴۷۵،۲۷۶	۱۱۰	۱۰۲	۹۴	۹۹	۹۵
شہر جن کی آبادی حسب ذیل ہے:- ۱- ایک لاکھ اور اس سے زائد۔	۳۸	۹،۶۷۴،۰۳۲	۳۵	۸،۲۱۱،۷۰۴	۲۷	۲۶	۲۲	۲۲	۲۲
۲- ۵۰ ہزار تا ایک لاکھ	۶۵	۴،۵۷۲،۱۱۳	۵۴	۳،۵۱۷،۷۴۹	۱۳	۱۱	۹	۱۲	۱۱
۳- ۲۰ ہزار تا ۵۰ ہزار	۲۶۸	۸،۰۹۱،۲۸۸	۲۰۰	۵،۹۶۸،۷۹۴	۲۳	۱۹	۱۸	۱۷	۱۶
۴- ۱۰ ہزار تا ۲۰ ہزار	۵۴۳	۷،۴۴۹،۴۰۲	۴۵۱	۶،۲۲۰،۸۸۹	۲۱	۱۹	۲۰	۲۲	۱۹
۵- ۵ ہزار تا ۱۰ ہزار	۹۸۷	۶،۹۹۲،۸۴۲	۸۸۵	۶،۲۲۳،۰۱۱	۲۰	۲۰	۱۹	۲۰	۲۱
۶- ۵ ہزار سے کم	۶۷۴	۲،۲۰۵،۷۶۰	۶۹۱	۲،۳۳۳،۱۲۹	۶	۷	۶	۶	۶
دیہی علاقے	۶۹۶،۸۳۱	۳۱۳،۸۵۲،۳۵۱	۶۸۵،۶۶۵	۲۸۶،۴۶۷،۲۰۴	۸۹۰	۸۹۸	۹۰۶	۹۰۱	۹۰۵

باب ۳

سب سے زیادہ ترقی بیس ہزار تا پچاس ہزار آبادی کے شہروں میں رونما ہوئی ہے، چنانچہ ان کی مجموعی آبادی اب پچاس ہزار تا ایک لاکھ نفوس کے شہروں کی آبادی سے تقریباً دونی ہوگئی ہے، اور ان ۳۸ شہروں کی آبادی سے بہت کم نہیں ہے جن کی انفرادی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ بڑے صنعتی اور نیم صنعتی شہروں نے ان چھوٹے شہروں کے نقصان سے ترقی کی ہے جن کی آبادی دس ہزار یا اس سے کم ہے۔

شہری آبادی کا اوسط آسام کے ۴٫۳ فی صد سے بمبئی کے ۲۲٫۶ فی صد تک ہے؛ چنانچہ ہندوستان کے بڑے صوبوں کے مقابلے میں بمبئی پریسیڈنسی میں شہری آبادی سب سے زیادہ تعداد میں ہے۔

ہندوستان کی بحیثیت مجموعی ۱۱ فی صد شہری آبادی کے مقابلے میں فرانس
51 کی شہری آبادی ۴۹ فی صد، شمالی آئرستان کی ۵۰٫۸ فی صد، کینیڈا کی ۵۳٫۷ فی صد، ریاستہائے متحدہ امریکا کی ۵۶٫۲ فی صد اور انگلستان اور ویلز کی ۸۰ فی صد ہے۔

پچھلے صفحے کی جدول الف[1] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں میں اور بہ لحاظ وسعت مختلف درجے کے شہروں میں آبادی کی تقسیم کیا ہے، اور یہ امر پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ کم و بیش ۴۰ سال میں شہری آبادی نے بہت کم ترقی کی ہے۔

جدول ب سے بڑے شہرون کا حال معلوم ہوتا ہے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ایسے شہر صرف ۳۹ ہیں، اور ان میں سے صرف سات کی آبادی چار لاکھ سے زائد ہے۔

اکثر مغربی ممالک میں انیسویں صدی میں منظم صنعتوں نے بہت ترقی کی جس کے نتیجے کے طور پر شہری آبادی میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ اضافہ رونما ہوا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں شہری آبادی

[1]۔ رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول حصۂ اول صفحہ ۴۶۔

جدول ب

شہر	آبادی	شہر	آبادی
کلکتہ[1]	۱،۴۸۵،۵۸۲	پٹنہ	۱۵۹،۶۹۰
بمبئی	۱،۱۶۱،۳۸۳	مانڈلے	۱۴۷،۹۳۲
مدراس	۶۴۷،۲۳۰	شولاپور	۱۴۴،۶۵۴
حیدرآباد	۴۶۶،۸۹۴	جے پور	۱۴۴،۱۷۹
دہلی	۴۴۷،۴۴۲	بریلی	۱۴۴،۰۳۱
لاہور	۴۲۹،۷۴۷	ترچناپلی	۱۴۲،۸۴۳
رنگون	۴۰۰،۴۱۵	ڈھاکہ	۱۳۸،۵۱۸
الہ آباد	۳۱۳،۷۸۹	میرٹھ	۱۳۶،۷۰۹
بنگلور	۳۰۶،۴۷۰	اندور	۱۲۷،۳۲۷
لکھنؤ	۲۷۴،۶۵۹	جبل پور	۱۲۴،۳۸۲
امرتسر	۲۶۴،۸۴۰	پشاور	۱۲۱،۸۶۶
کراچی	۲۶۳،۵۶۵	اجمیر	۱۱۹،۵۲۴
پونا	۲۵۰،۱۸۷	ملتان	۱۱۹،۴۵۷
کانپور	۲۴۳،۷۵۵	راول پنڈی	۱۱۹،۲۸۴
آگرہ	۲۲۹،۷۶۴	بڑودہ	۱۱۲،۸۶۲
ناگپور	۲۱۵،۱۶۵	مراد آباد	۱۱۰،۵۶۰
بنارس	۲۰۵،۳۱۵	ٹنے ویلی	۱۰۹،۰۶۸
الہ آباد	۱۸۳،۹۱۴	میسور	۱۰۷،۱۴۲
مدورا	۱۸۲،۰۱۸	سیلم	۱۰۲،۱۷۹
سری نگر	۱۷۳،۵۷۳		

[1] مضافات اور ہوڑا کو شامل کرکے۔

باب ۳

نمایاں طور سے حالتِ جمود ہی میں رہی[۱]۔ صنعتی انقلاب کی بدولت انگلستان کی شہری آبادی میں جو کثیر اضافہ واقع ہوا وہ اس قدر مشہور واقعہ ہے کہ اس پر یہاں تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

52 موجودہ زمانے میں یہاں شہروں اور دیہات میں آبادی کی تقسیم بہت زیادہ غیر مساوی ہے اور شہروں میں کل آبادی کا بہت ہی قلیل جزو فروکش ہے؛ یہ اہلِ ہند کی معاشی پسماندگی کی بین علامت ہے۔ رانا ڈے نے ترقی پذیر دیہی زندگی اور پیشے پر تبصرہ کرتے ہوئے (اس لیے کہ وہ ایسے زمانے میں لکھ رہے تھے جب کہ شہروں میں بسنے اور شہری پیشے اختیار کرنے کی خفیف سی معکوس تحریک بھی ظاہر نہ ہوئی تھی) بتایا کہ اس کے معنے قوت، ذہانت اور خود حصری کے زائل و سلب ہو جانے کے ہیں۔ تہذیب و ترقی نے ہمیشہ شہروں میں جنم لیا اور یہاں سے ان کی شعاعیں دیہات میں پہنچیں، ورنہ دیہات نے اپنی حالت پر قایم رہ کر شاذ ہی ترقی پذیر نشو و نما کی صلاحیت ظاہر کی۔ ہندوستان کی شہری اور دیہاتی آبادی کی موجودہ تقسیم کو شہروں کی موافقت میں صرف اس طریقے سے از سر تا پا بدلا جا سکتا ہے کہ صنایع، تجارت اور نقل و حمل کو ترقی دی جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہمیں ان خطرات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے جو لندن، نیویارک، بمبئی اور کلکتہ جیسے چند بڑے شہروں میں کثیر آبادی کے اجتماع سے منسوب کئے جاتے ہیں؛ لیکن اگر متوسط درجے کے شہر تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہوں تو اس کی بدولت بڑے پیمانے کی پیدایش کے جملہ کفایات اور شہری زندگی کی جملہ راحتیں اور سہولتیں حاصل ہوں گی، اور اس کے ساتھ جدید شہروں کے کثیف اور گندہ علاقوں میں اخلاقی و جسمانی صحت کے خطرات سے بچنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] سر فریڈرک سائکس نے حال (۱۹۲۵ء) میں ڈیلی ٹیلیگراف کو ایک مضمون "ہندوستان میں تنظیم جدید" کے عنوان سے بھیجا تھا، اس میں اس تضاد کو بہ خوبی واضح کیا گیا ہے۔ انگلستان میں ۴/۵ آبادی شہروں میں رہتی ہے، برخلاف اس کے ہندوستان میں ۴/۵ حصہ دیہات میں رہتا سہتا ہے۔

باب ۳

۸۔ آبادی کی صنفی تقسیم

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہر ہزار مردوں میں عورتوں کا تناسب ۹۴۰ ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی کثرت ظاہر کرنے والے برطانوی ہند کے صوبے صرف مدراس، بہار، اور اوڑیسہ ہیں مندرجۂ ذیل جدول میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی مختلف عمروں میں صنفی ترکیب کیا ہے یا دوسرے الفاظ میں فی ہزار مرد کتنی عورتیں ہیں، اور اس حیثیت سے ہندوستان کا بعض دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا گیا ہے[۵۱]۔

نام ملک	سال	۰ تا ۱۰	۱۰ تا ۲۰	۲۰ تا ۳۰	۳۰ تا ۴۰	۴۰ تا ۵۰	۵۰ تا ۶۰	۶۰ تا ۷۰	۷۰ اور اس سے زیادہ
جرمنی	۱۹۱۰	۹۸۹	۹۹۵	۱۰۰۱	۱۰۰۴	۱۰۳۳	۱۱۱۲	۱۲۱۹	۱۳۱۴
آسٹریا	۱۹۱۰	۹۸۹	۱۰۲۳	۱۰۴۳	۱۰۴۹	۱۰۸۷	۱۰۷۱	۱۱۱۸	۱۱۹۹
اطلی	۱۹۱۱	۹۶۳	۱۰۱۷	۱۱۲۱	۱۱۰۸	۱۰۵۷	۱۰۳۱	۲۰۲۸	۱۰۳۸
ہنگری	۱۹۱۰	۹۹۰	۱۰۱۲	۱۰۵۹	۱۰۵۱	۱۰۲۸	۹۹۳	۱۰۱۷	۱۰۶۱
فرانس	۱۹۱۱	۹۸۹	۹۹۴	۱۰۲۱	۱۰۰۸	۱۰۲۶	۱۰۵۹	۱۱۵۵	۱۳۰۰
انگلستان و ویلز	۱۹۱۱	۹۹۶	۱۰۰۹	۱۱۱۴	۱۰۸۲	۱۰۷۸	۱۰۹۳	۱۱۶۷	۱۴۱۶
ریاستہائے متحدہ امریکا	۱۹۱۰	۹۷۹	۹۹۰	۹۵۳	۹۰۳	۸۸۴	۸۵۹	۹۲۵	۱۰۲۳
جاپان	۱۹۱۳	۹۸۶	۹۶۸	۹۶۷	۹۶۶	۹۴۹	۹۷۲	۱۰۴۲	۱۲۱۰
ہندوستان	۱۹۱۱	۹۹۲	۸۷۴	۱۰۲۴	۹۱۰	۹۱۲	۹۵۰	۱۰۹۲	۵۲
ہندوستان	۱۹۲۱	۹۹۸	۸۶۹	۱۰۲۲	۹۰۵	۹۰۲	۹۲۶	۱۰۴۹	

۵۱۔ دیکھو برج نرائن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۴۲۔

۵۲۔ ان اعداد میں وہ سب لوگ شریک ہیں جن کی عمر ۶۰ یا اس سے متجاوز تھی۔

باب۲

اس جدول سے بعض دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے کم عمر جماعت (یا۔تا۔ ۱سال کی عمر والوں) میں تمام ملکوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم ہے[1] لیکن جوں جوں
53 ہم زیادہ عمر والوں کے درجے کی جانب بڑھتے ہیں، ہندوستانی حالات مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے تناسب کو مختلف ظاہر کرنے لگتے ہیں؛ اور عام نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حالات یورپ کے حالات کے برخلاف عورتوں کی زندگی کے لیے نمایاں طور سے ناموافق ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں دس سال کی عمر سے اور خاص کر سن بلوغ پر پہنچ جانے کے بعد، عورتوں کی شرح اموات مردوں کی شرح اموات سے زیادہ معلوم ہوتی ہے جو یورپ کے حالات کے برعکس تجربہ ہے۔ اس کی ایک توجیہ اس واقعے سے ملتی ہے کہ پردہ جیسے بعض معاشری رسم و رواج خاص کر ان عورتوں کی صحت پر نہایت مضر اثر ڈالتے ہیں جو گنجان شہروں میں رہتی ہیں۔ پردہ، خوش حال مسلمانوں اور ان علاقوں کے ہندوؤں میں پایا جاتا ہے جہاں مسلمانوں کا اثر بہت قوی رہا ہے۔ لیکن عورتوں میں کثرتِ اموات کا سب سے بڑا سبب کم سنی کا بیاہ ہے جو لڑکیوں کو ایسی عمر میں حاملہ بن جانے کے خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں جسمانی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی جیسا کہ بڑودہ کی

[1] یوں تو لڑکیوں کی ولادت کی کمی ایک عام واقعہ ہے، چنانچہ ہندوستان میں تولد شدہ ہر ۱۰۰ لڑکیوں کے مقابلے میں ۱۰۸ لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یورپی ملکوں میں اس عدم مساوات کی اصلاح، بچوں کی اموات کی اس اعلیٰ شرح سے ہو جاتی ہے جو لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کے بارے میں ہے۔ وٹلی کا مقولہ ہے کہ "نامیاتی لحاظ سے عورت، مرد کے مقابلے میں 'زیادہ طاقتور ہے" (دیکھو ان کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷)۔ پھر بھی ہندوستان میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد کی کمی کو بعض اوقات اس بات کی علامت تصور کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی حد تک طفل کشی کا رواج پوری طرح معدوم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رسم نہ صرف گھٹیا اور نیچ قوموں میں بلکہ کسی حد تک جاٹ، کھتری، گوجر، راجپوت وغیرہ جیسی معزز اور مشہور قوموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ (بابتہ ۱۹۲۱ء) جلد اول ضمیمہ (۶)۔

باب ۲

مردم شماری بابتہ سال ۱۹۱۱ء کے مہتمم نے کہا ہے "بیشمار لڑکیاں جو مائیں بن جاتی ہیں،
عروسی خواب گاہ سے مرگھٹ کی چتا تک کی مسافت بہت تیزی کے ساتھ طے
کر جاتی ہیں اور اعصابی کمزوری، دق اور رحمی شکایتوں کا بری طرح شکار ہوتی ہیں"۔
جیسا کہ سر جان میگا نے ۱۹۴۳ء میں تحقیق کرنے کے بعد بتلایا ہے، ہندوستان میں
زچاؤں کی اموات کی شرح بحیثیت مجموعی ۲۴٫۵ فی ہزار ہے۔ بہ قول موصوف
بنگال میں یہ شرح تقریب قریب ۵۰ فی ہزار ہے۔ انگلستان میں محض اس بنا پہ
اضطراب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہاں شرح ۴٫۱۱ فی ہزار ہے، گویا اس شرح
کو بھی بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ ایک اور ممکنہ سبب یہ ہے کہ ہندوستان
میں عورتوں کی زندگی مغرب کے مقابلے میں بہت کم قیمت مانی جاتی ہے
اور صرف مردوں ہی کا یہ خیال نہیں ہے بلکہ خود عورتیں بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں؛
چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر عورتوں کی صحت کی جانب دیدہ و دانستہ بہت
بے پروائی اور بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ ابتدائی سالوں میں لڑکیوں کی داشت
میں کم اور لڑکوں کی داشت میں زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک سبب
یہ واقعہ بھی ہے کہ کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کو وضع حمل سے
پیشتر اور بعد ضروری آرام لینے اور وقفے سے متمتع ہونے کا شاذ ہی موقعہ ملتا ہے اور
کثرت کار کی وجہ سے ان کی صحت خراب اور جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔
دیہاتی قابلہ کی غیر ماہرانہ دایہ گری بھی ایک مزید مؤید سبب ہے۔ اس صورت
حالات میں جو چیز خاص طور پر تشویش کا باعث ہے وہ یہ واقعہ ہے کہ ہر مردم شماری 54
کے موقع پر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کا تناسب غلطی طور پر زیادہ
سے زیادہ گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔

یوں تو عام آبادی میں عورتوں کی تعداد کم ہی ہے، لیکن شہروں کی آبادی
میں یہ کمی بہت زیادہ ہے؛ اور یہ حالت مغربی ممالک کے بالکل برعکس ہے،
چنانچہ وہاں کے شہروں میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بڑی حد تک
زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے کارخانوں میں
کام کرنے والے مزدور عارضی طور پر نقل مقام کرتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کو

شہروں میں بہت شاذ لاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شہری صنعتوں میں عورتوں سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۱ء میں عورتوں کی تعداد ہر ہزار مردوں میں کلکتے میں صرف ۴۸۹ اور بمبئی میں ۵۵۴ تھی۔

یہ کہنے کی بمشکل ضرورت ہے کہ شہروں میں عورتوں کی قلت کا اثر مزدوروں کی صحت و آسائش اور ان کے اخلاق پر نہایت مضر پڑتا ہے۔

ہندوستان میں عورتوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں مزدور پیشہ عورتوں کا فی صد ۲۵ ہے۔ اس کے مقابلے میں انگلستان اور ویلز میں کم و بیش ۲۶، فرانس میں ۳۹ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۱۰ ہے۔ اس لحاظ سے مغرب کے بعض سب سے زیادہ ترقی ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کا فی صد کم نہیں ہے۔ یہ غالباً ایک تعجب خیز امر ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ عورتوں کی صرف قلیل تعداد پردے کے زیر اثر ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ہندوستان کے افلاس پر بھی ضمنی طور پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں مردوں کی کسب معاش کی صلاحیت میں اصلاح و ترقی ہوتے ہی عورتیں مزدوری کے پیشے سے بالعموم دست کش ہو جایا کرتی ہیں۔ عزت و آبرو کے مروجہ خیالات کی بنا پر گھر کی عورتوں کے لئے تا حد امکان تلاش معاش کی غرض سے باہر نکلنے کی روک تھام کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مزدوری پیشہ عورتوں کی تعداد کی کثرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے بے کاری کے تعیش کو برداشت کر سکتے ہیں۔ خاندان کی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی خاطر، ان کو کام پر لگایا جاتا ہے، اگرچہ بادل ناخواستہ[1]۔

[1] ۔ مردم شماری کے اغراض کے لیے ایسی عورت کو بھی مزدور شمار کیا جاتا ہے جو اساسی طور سے خانہ داری میں مصروف ہو اور اپنے وقت کا صرف ایک قلیل جزو آمدنی والے پیشے میں صرف کرتی ہو۔ گو افلاس کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک، اس نتیجے کی بنیاد اس واقعے پر قایم کرنا بظاہر بالکل حق بجانب ہے کہ قومی معاشری تعصبات کے باوجود عورتوں کی کثیر تعداد تلاش معاش میں گھر سے باہر نکلنے پر

باب ۳
55

۹۔ تقسیم آبادی بلحاظ عمر

مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ میں مندرجۂ ذیل اعداد موجود ہیں جن سے ۱۸۹۱ء تا ۱۹۳۱ء کے پانچ عشروں میں ہندوستان کی آبادی کے ۱۰ ہزار مردوں اور عورتوں کی عمروار تقسیم کا حال دہ سالہ گروہ بندی کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

گروہ بلحاظ عمر	۱۹۳۱ مرد	۱۹۳۱ عورتیں	۱۹۲۱ مرد	۱۹۲۱ عورتیں	۱۹۱۱ مرد	۱۹۱۱ عورتیں	۱۹۰۱ مرد	۱۹۰۱ عورتیں	۱۸۹۱ مرد	۱۸۹۱ عورتیں
۰ تا ۱۰ سال	۲۸۰۲	۲۸۸۹	۲۶۷۳	۲۸۱۰	۲۷۱۰	۲۸۱۶	۲۶۴۸	۲۷۲۱	۲۸۳۷	۲۹۲۳
۱۰ تا ۲۰ سال	۲۰۸۹	۲۰۹۲	۲۰۸۷	۱۸۹۶	۲۰۱۳	۱۸۲۳	۲۱۳۰	۱۹۱۷	۱۹۷۴	۱۷۵۸
۲۰ تا ۳۰ سال	۱۷۶۸	۱۸۵۶	۱۶۴۰	۱۷۶۶	۱۷۱۸	۱۸۳۹	۱۶۶۶	۱۷۸۷	۱۶۷۴	۱۸۰۱
۳۰ تا ۴۰ سال	۱۴۳۱	۱۳۵۱	۱۴۶۱	۱۳۹۸	۱۴۵۱	۱۳۹۱	۱۴۵۷	۱۴۰۸	۱۶۷۸	۱۴۰۱
۴۰ تا ۵۰ سال	۹۶۸	۸۹۱	۱۰۱۳	۹۶۷	۱۰۱۴	۹۶۹	۱۰۱۹	۹۹۱	۱۴۵۵	۹۴۹
۵۰ تا ۶۰ سال	۵۶۱	۵۴۵	۶۱۹	۶۰۶	۶۰۹	۶۰۷	۶۱۴	۶۲۱	۱۰۰۴	۵۹۶
۶۰ تا ۷۰ سال	۲۶۸	۲۸۱	۳۴۷	۳۷۷	۳۴۰	۳۸۰	۴۶۶	۵۵۵	۴۶۲	۵۷۳
۷۰ اور اس سے زاید	۱۱۵	۱۲۵	۱۶۰	۱۸۰	۱۴۵	۱۷۵				
اوسط عمر	۲۳٫۲	۲۲٫۸	۲۴٫۸	۲۴٫۷	۲۴٫۷	۲۴٫۷	۲۴٫۷	۲۵٫۱	۲۴٫۴	۲۴٫۹

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مجبور ہو جاتی ہے" تاہم یہ توجیہ اس عام استدلال کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ ہندوستان کی نسوانی محنت کی مجموعی "مقدار" مغربی ممالک کے مقابلے میں نسبتاً بہت قلیل ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج اور تعصب اکثر پیشوں کا دروازہ عورتوں کے لیے مسدود کر دیتے ہیں جس کے باعث نسوانی محنت کی بڑی مقدار ضایع جاتی ہے اور قومی مقسوم کی مقدار اس سے کم ہوتی ہے جتنی کہ ہونی چاہئے۔ مزدور پیشہ عورتوں کی تعداد تو بڑی ہے؛ لیکن ان میں سے اکثر چونکہ دن کے کچھ حصے میں اور گاہے ماہے کام کرتی ہیں اس لیے اجرتی محنت کے مجموعے میں ان کی محنت کے حصے کی مقدار مرد مزدوروں کے حصے کے مقابلے میں حقیر اور نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ علاوہ ازیں یہاں عورتوں کے لیے جن پیشوں کے دروازے بند ہیں ان کی تعداد مغرب کے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

باب۳ ترکیب آبادی بلحاظ عمر میں معاشی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مجموعی آبادی سے مزدوروں یا (موثر آبادی) کا کیا تناسب ہے۔ ہر ملک کی آبادی کی تقسیم بہ لحاظ عمر کو مخروطی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کم عمر والے گروہ، آبادی کے سب سے بڑے حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہی بظاہر اس مخروط کا قاعدہ ترتیب دیتے ہیں؛ جوں جوں ہم زیادہ عمر والے گروہوں پر پہنچیں گے مخروط تنگ اور چھوٹا ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ وہ چھوٹا ہوتے ہوتے آخر میں نقطے پر ختم ہوگا، اس لیے کہ ایک مقررہ عمر کے بعد لوگ زندہ ہی نہ رہینگے کہ ان کی تعداد کا اندراج کیا جائے۔ مجموعی آبادی میں مختلف عمر والے گروہوں کے تناسب کے مطابق مخروط کی شکل بھی مختلف ہوگی۔ چنانچہ ہندوستان کی حد تک عمر کے مخروط کا قاعدہ دنیا کے سب ممالک کے عمر کے مخروطوں کے قاعدوں سے زیادہ چوڑا ہے، جس کا باعث یہ ہے کہ یہاں شرح ولادت بہت اعلیٰ ہے۔ ہندوستان میں دس سال سے کم عمر والے بچوں کا تناسب سب ممالک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ علیٰ ہذا مخروط کا بالائی حصہ بھی دوسرے تمام ملکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تنگ اور گاؤدم ہو کر اوپر کے نقطے پر پہنچتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی عمریں بہت کم طویل ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہاں ایسے لوگ بہت کم تعداد میں ہیں جو پچاس سال سے زیادہ زندہ رہتے ہوں؛ چنانچہ مندرجہ ذیل جدول سے اس کا 56
حال معلوم ہوگا جس میں عمر کی تقسیم فی ہزار آبادی کے لحاظ سے بتائی گئی ہے:۔

	جرمنی	فرانس	انگلستان و ویلز	ریاستہائے متحدہ	جاپان	برطانوی ہند	
	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
دس سال سے کم	۲۳۴	۱۷۱	۲۰۹	۲۲۲	۲۴۴	۲۷۶	۲۷۴
۱۰ تا ۲۰ سال	۲۰۳	۱۶۶	۱۹۰	۱۹۸	۱۹۸	۱۹۲	۱۹۸
۲۰ تا ۳۰ سال	۱۶۴	۱۵۸	۱۷۳	۱۸۷	۱۵۴	۱۷۸	۱۷۰
۳۰ تا ۴۰ سال	۱۳۹	۱۴۸	۱۵۲	۱۴۶	۱۳۸	۱۴۲	۱۴۳

	جرمنی	فرانس	انگلستان و ویلز	ریاستہائے متحدہ	جاپان	برطانوی ہند	
	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
۴۰ تا ۵۰ سال	۱۹۵	۱۲۷	۱۱۵	۱۰۶	۱۰۱	۹۹	۹۴
۵۰ تا ۶۰ سال	۷۶	۱۰۴	۸۰	۷۲	۷۷	۶۱	۶۱
۶۰ تا ۷۰ سال	۵۱	۷۷	۵۱	۴۳	۵۷	۳۶	۳۶
۷۰ اور اس سے زاید سال	۲۴	۴۹	۳۰	۲۶[۱]	۳۱	۱۶	۱۷

اوپر کی جدول سے واضح ہوگا کہ پہلے اور دوسرے گروہ کی تعداد کا درمیانی فرق ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح بہت بڑی ہے۔ اسی طریقے سے ۵۰ سال اور اس سے زیادہ عمر والوں کی نمایندگی کرنے والے آخری تین گروہوں میں ہندوستان میں اشخاص کی تعداد کمترین ہے۔

یورپ میں مزدور پیشہ یا پیداآور آبادی کی عمروں کے عام طور پر مسلمہ حدود ۱۵ اور ۶۰ یا ۶۵ سال کے درمیان ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں عمر کی بالائی حد لازمی طور پر کمتر ہے، اس لیے کہ کبر سنی اور عدم قابلیت کار یورپ کے مقابلے میں بہت پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں عمر کی مسلمہ حد ۱۵ اور ۴۰ کے مابین ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کی موثر یا محنت کرنیوالی آبادی کا تناسب مجموعی آبادی سے صرف ۴۰ فی صد ہے۔ اس کے برخلاف اگر فرانس اور انگلستان میں پیداآور آبادی کے لیے عمر کے حدود ۱۵ تا ۶۰ مانے جائیں تو، ان دونوں ملکوں میں یہ تناسب علی الترتیب ۵۳ فی صد اور ۶۰ فی صد ہے[۲]۔ اس طرح مزدوروں کی موجودہ تعداد کے مدنظر، ہندوستان کی حالت تشویش ناک ہے۔ لہذا ایسی تدبیروں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کا مقصد صحت عامہ کے معیار کی

[۱] اس میں دو اشخاص ایسے بھی شامل ہیں جن کی عمریں غیر معلوم ہیں۔ دیکھو برج نرائن کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۲۷ تا ۲۸

[۲] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "دولت ہند" (Wealth of India) صفحہ ۶۰ از پی۔ اے واڈیا و جی۔ این جوشی

باب ۳
57

اصلاح کرنا اور عوام کی عمروں کے اوسط کو اس غرض سے بڑھانا ہو کہ محنت کرنیوالی آبادی کی تعداد میں اضافہ ہو اور وہ دوسرے ملکوں کی سطح پر آجائے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے شرح اموات میں کمی کا میلان رونما ہوا ہے۔ جس کا باعث غالباً یہ ہے کہ محکمہ جات صحت عامہ کی تنظیم جدید ہوئی ہے اور وہ اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے مختلف صوبوں میں زیادہ کام کر رہے ہیں۔

یہ بتانے کی بہ مشکل ضرورت ہے کہ ایک ہی مقررہ ملک کی آبادی کی تقسیم بہ لحاظ عمر وقتاً فوقتاً متغیر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ معمولی شرح ولادت اور شرح اموات میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں جنگ، قحط اور متعدی امراض بھی عمر کی تقسیم میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ جنگ، بالغوں کی آبادی کے تناسب کو گھٹا سکتی ہے۔ قحط اور متعدی امراض کا اثر مختلف عمروں کے گروہوں پر مختلف ہوتا ہے۔ قحط، بالغوں کے مقابلے میں بچوں پر زیادہ شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے؛ برخلاف اس کے متعدی امراض معکوس اثر ڈالتے ہیں لے کافی طویل مدت کے لیے ظاہر ہے کہ بچوں میں کثرت اموات کا یہ اثر ظاہر ہوگا کہ کم و بیش پندرہ سال کے بعد بالغوں کی تعداد میں کمی ہو جائے گی۔ علیٰ ہذا اگر بالغوں کی کثیر تعداد تاہل کے زمانے میں امراض کا شکار ہو جائے تو رفتار زمانہ کے ساتھ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ شرح ولادت میں کمی ہو جائے گی اور اس کے نتیجے کے طور پر بچوں کے تناسب میں کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں انفلوئنزا کی وبا کے شائع ہونے کی وجہ سے جو کثیر اموات واقع ہوئیں اس کی بنا پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ مجموعی آبادی میں مزدور پیشہ آبادی کا تناسب معمول سے زیادہ ناموافق ہو گیا ہو۔ گو سب حلقوں کے لوگ کم و بیش مبتلا ہوئے تاہم بالغوں میں غالباً سب سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔

مندرجۂ ذیل جدول میں بہ حساب ملین یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۱ء کی

لے۔ دیکھو برج نرائن کی محولۂ بالا تصنیف۔

باب ۳

مردم شماری میں آبادی کی تقسیم بلحاظ عمر و صنف کیا تھی :-

عمر	مجموعی آبادی			عمر	مجموعی آبادی		
	اشخاص	مرد	عورتیں		اشخاص	مرد	عورتیں
۰ تا ۵	۳۹،۶۵	۱۹،۴۸	۲۰،۱۷	۳۵ تا ۴۰	۱۸،۹۶	۱۰،۳۰	۸،۶۶
۵ تا ۱۰	۴۶،۷۴	۲۳،۸۴	۲۲،۹۰	۴۰ تا ۴۵	۱۹،۵۸	۱۰،۰۷	۹،۵۱
۱۰ تا ۱۵	۳۶،۷۴	۲۰،۱۷	۱۶،۵۷	۴۵ تا ۵۰	۱۱،۶۴	۶،۳۴	۵،۳۰
۱۵ تا ۲۰	۲۶،۱۴	۱۳،۶۵	۱۲،۴۹	۵۰ تا ۵۵	۱۳،۷۴	۷،۰۳	۶،۷۱
۲۰ تا ۲۵	۲۶،۰۶	۱۲،۵۶	۱۳،۵۰	۵۵ تا ۶۰	۵،۵۷	۲،۱۹	۲،۵۸
۲۵ تا ۳۰	۲۷،۵۹	۱۴،۰۲	۱۳،۵۷	۶۰ تا ۶۵	۸،۸۸	۴،۳۱	۴،۵۷
۳۰ تا ۳۵	۲۶،۱۳	۱۳،۳۷	۱۲،۷۶	۶۵ تا ۷۰	۲،۵۱	۱،۳۰	۱،۲۱
				۷۰ اور اس سے زاید	۵،۳۴	۲،۵۸	۲،۷۶
غیر مشخص عمر[۱]					۲۴[۲]	۲۴[۳]	......
میزان					۳۱۵،۳۵	۱۶۲،۰۸	۱۵۳،۲۷

۱۰۔ ہندوستان میں ولادت اور اموات کی شرح

ہندوستان کی آبادی کی تعداد کا تعین تقریباً کل کا کل شرح ولادت و شرح اموات کے ذریعے سے ہوتا ہے؛ اور ترک وطن داخلی و ترک وطن خارجی دونوں عامل نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ شرح اموات اور

[۱] ۔ یہ تعداد ملین میں ظاہر نہیں کی گئی ہے۔
[۲] ۔ " " " " " "
[۳] ۔ " " " " " "

باب ۳

شرحِ ولادت، دونوں کی حد تک، ہندوستان دنیا کے مہذب ممالک میں ایک ناقابلِ رشک لیکن نمایاں حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ جیسا کہ ۱۹۱۱ء میں مختلف صوبوں کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے اوسط شرحِ ولادت اور شرحِ اموات علی الترتیب ۳۴٫۴۳ اور ۹٫۴۲ تھی۔ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں شرحِ ولادت اور شرحِ اموات دونوں میں ترقی پذیر کمی کا میلان قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ مثلاً انگلستان اور ویلز میں ۱۸۹۱ء تا ۱۸۹۵ء میں ولادتوں اور اموات کی تعداد فی ہزار نفوس علی الترتیب ۳۰٫۵ اور ۱۸٫۷۱ تھی۔ اس کے بالمقابل ۱۹۲۲ء میں یہ اعداد ۲۳٫۱۵ اور ۱۲٫۰ تھے۔

ہندوستان میں شرحِ ولادت و شرحِ اموات میں اس قسم کی کوئی نمایاں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ بعض زمانوں میں دونوں میں اضافہ رونما ہوا، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے واضح ہوگا۔[1]

زمانہ	ولادتوں کا اوسط فی ہزار نفوس	اموات کا اوسط فی ہزار نفوس
۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۰ء	۳۵٫۸۳	۲۷٫۴۴
۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۰ء	۳۵٫۴۳	۳۱٫۳۱
۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۰ء	۳۸٫۱۸	۳۳٫۹۴
۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۷ء	۳۸٫۶۸	۳۰٫۳۱
۱۹۱۸ء	۳۵٫۳۵	۶۲٫۴۶
۱۹۱۹ء	۳۰٫۲۴	۳۵٫۸۷
۱۹۲۰ء	۳۲٫۹۸	۳۰٫۸۴
۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۰ء کا اوسط	۳۶٫۹۳	۳۴٫۱۳
۱۹۲۱ء	۳۲٫۲۰	۳۰٫۵۹
۱۹۲۲ء	۳۱٫۸۵	۲۴٫۰۲
۱۹۲۳ء	۳۵٫۰۹	۲۵٫۰۰

[1] ۱۸۸۵ء تا ۱۹۲۰ء کے اعداد برج نرائن کی محولہ کتاب سے ماخوذ ہیں۔

باب۳

زمانہ	ولادتوں کا اوسط فی ہزار نفوس	اموات کا اوسط فی ہزار نفوس
سنہ ۱۹۲۴ء	۳۴٫۴۴	۲۸٫۴۹
سنہ ۱۹۲۶ء	۳۴٫۷۷	۲۷٫۷۶
سنہ ۱۹۲۷ء	۳۵٫۲۷	۲۴٫۸۹
سنہ ۱۹۲۸ء	۳۶٫۷۹	۲۵٫۵۹
سنہ ۱۹۲۹ء	۳۵٫۴۷	۲۵٫۹۵
سنہ ۱۹۳۰ء	۳۵٫۹۹	۲۶٫۸۵
سنہ ۱۹۳۱ء[۱]	۳۴٫۳۸	۲۴٫۸۹

۱۱۔ شرح اموات جہاں شرح ولادت اعلیٰ اور بے روک ہوگی وہاں شرح اموات بھی اعلیٰ ہوگی۔ ہندوستان میں اعلیٰ شرح اموات کا باعث آخر میں عام افلاس ہے، جس کی وجہ سے لوگ ملیریا، طاعون اور انفلوئنزا جیسے امراض کی مقاومت کی طاقت نہیں رکھتے۔ اہل ہند میں طاقت و توانائی کی
کمی ہی اس واقعے کی توجیہ کرتی ہے کہ اکثر عمروں میں زندہ رہنے کی توقع یورپین 59
ملکوں کے مقابلے میں کمتر ہوتی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوگا۔[۲]

ملک	بزمانۂ ولادت	۱۰	۲۰	۳۰	۶۰	۸۰
	مرد					
ہندوستان	۲۲٫۵۹	۳۳٫۳۶	۲۷٫۴۶	۲۲٫۴۵	۱۰٫۰۰	۳٫۰۶
جرمنی	۴۷٫۴۱	۵۲٫۰۱	۴۳٫۴۳	۳۵٫۲۹	۱۳٫۱۸	۴٫۴۱

۱؎ سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے اندازوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح ولادت ۳۴ اور شرح اموات ۲۲ ہے۔

۲؎ دیکھو برج نرائن کی محولہ کتاب صفحہ ۴۴؛ نیز دیکھو وڈل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۸۰ تا ۸۴۔

باب ۳

ملک	بزمانۂ ولادت	۱۰	۲۰	۳۰	۶۰	۸۰
ڈنمارک	۵۴٫۹۰	۵۵٫۱۰	۴۶٫۳۰	۳۸٫۰۰	۱۵٫۲۰	۵٫۱۰
انگلستان و ویلز	۵۱٫۵۰	۵۳٫۰۸	۴۴٫۲۱	۳۵٫۸۱	۱۳٫۷۸	۴٫۹۶
فرانس	۴۵٫۷۴	۴۹٫۷۵	۴۱٫۵۳	۳۴٫۳۵	۱۳٫۸۱	۴٫۸۷
عورتیں						
ہندوستان	۲۳٫۳۱	۳۳٫۷۴	۲۷٫۹۶	۲۲٫۹۹	۱۰٫۱۱	۳٫۰۶
جرمنی	۵۰٫۶۸	۵۴٫۹۹	۴۵٫۳۵	۳۷٫۳۰	۱۴٫۱۷	۴٫۵۲
ڈنمارک	۵۷٫۹۰	۵۶٫۷۰	۴۸٫۰۰	۴۰٫۱۰	۱۶٫۵۰	۵٫۵۰
انگلستان و ویلز	۵۵٫۳۵	۵۵٫۵۱	۴۷٫۱۰	۳۸٫۵۴	۱۵٫۴۸	۵٫۵۹
فرانس	۴۹٫۱۳	۵۲٫۰۳	۴۴٫۰۲	۳۶٫۹۳	۱۵٫۰۸	۵٫۳۸

"مرد کی عمر کا اوسط انگلستان میں ۵۵٫۶۲ سال ہے؛ ہندوستان میں اس کے نصف سے بھی کم یا صرف ۲۶٫۹۱ ہے۔ عورتوں کی بابتہ ہندوستان کا اوسط ۲۶٫۵۶ اور انگلستان کا اوسط ۵۹٫۵۸ ہے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں مردوں کی عمر کا اوسط انگلستان میں ۴۴٫۱۳ سال اور ہندوستان میں ۲۵٫۵۴ سال تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۲ء میں انگلستان کا عدد ۵۵٫۶۲ تک بڑھ گیا، اور ہندوستانی عدد، سنہ ۱۹۰۱ء میں ۲۳٫۹۶ تک اور سنہ ۱۹۱۱ء میں ۲۲٫۳۲ تک گھٹ جانے کے بعد، سنہ ۱۹۳۱ء میں بھی صرف ۲۶٫۵۶ تھا۔ دوسرے الفاظ میں، جہاں انگریز نے ۳۰ سال کی مدت میں اپنی عمر میں ½ ۱۱ سال کا اضافہ کیا، ہندوستانی نے ۴۰ سال کی زیادہ طویل مدت میں صرف ایک سال کا اضافہ کیا[۱]"

[۱] دیکھو ڈنّل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۷۱ تا ۷۲۔

ممالک یورپ میں حیات کا طول عام طور پر قطعی ترقی ظاہر کر رہا ہے اور اس کا باعث وہاں کے بہتر حالات زندگی اور موت کو روکنے والے اسباب پر بدرجہا زیادہ قابو ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان، معاشی حیثیت سے بالکل جمود کی حالت میں ہے، اور ممالک یورپ میں جس ترقی کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ثابت کرنے کے لیے اچھا خاصا مقدمہ ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ یہاں انحطاط قطعی طور پر شروع ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں عمر کے اوسط طول کی کمی کے معنی یہ ہیں کہ صاحب فراست و تجربہ کار لوگ دنیا سے ایسے زمانے میں کوچ کر جاتے ہیں جبکہ ان میں قوم کے لیے اپنے آپ کو کارآمد ثابت کرنے کی قوت و صلاحیت عروج پر ہوتی ہے۔

ہندوستان کی شرح اموات کی دو نمایاں خصوصیات یہ ہیں:- 60

(۱) بچوں میں اموات کی کثرت، اور (۲) عورتوں میں شباب و تاہل کی عمروں میں کثرت اموات۔ مہذب ممالک کے مقابلے میں یہاں بچوں میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ اموات واقع ہوتی ہیں۔ نومولود بچوں میں سے تقریباً ۱/۵ حصہ ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پیشتر ہی فوت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بچوں کی شرح اموات تمام عمروں کی مجموعی شرح اموات کے ۱/۵ کے برابر ہے۔ ہندوستانی شہروں کے انتہائی غیر صحت بخش حالات کے باعث شہروں ہی میں بچوں کی اموات خاص طور سے زیادہ ہوتی ہیں؛ مثلاً لندن کی شرح اموات ۶۶ فی ہزار کے مقابلے میں بمبئی کی شرح ۴۷۲ فی ہزار ہے۔ کسی زمانے میں بچوں کی اموات کی حد تک یورپ کے ملکوں کی بھی وہی حالت تھی جو آج ہندوستان کی ہے؛ لیکن موجودہ صدی میں بہت نمایاں کمی واقع ہوئی ہے جیسا کہ انگلستان و ویلز کے متعلق مندرجۂ ذیل جدول سے ظاہر ہوگا

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت	سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت
سنہ ۱۸۵۰ء تا سنہ ۱۸۵۵ء	۱۵۶	سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۵ء	۱۱۰

باب ۳

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت	سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار اموات
سنہ ۱۸۷۰ء تا سنہ ۱۸۷۵ء	۱۵۳	سنہ ۱۹۱۶ء	۸۰
سنہ ۱۸۹۱ء تا سنہ ۱۸۹۵ء	۱۵۱	سنہ ۱۹۲۴ء	۷۵
سنہ ۱۸۹۶ء تا سنہ ۱۹۰۰ء	۱۵۶	سنہ ۱۹۲۵ء	۷۵
سنہ ۱۹۰۲ء تا سنہ ۱۹۰۵ء	۱۳۸	سنہ ۱۹۲۶ء	۷۰
سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۱۰ء	۱۱۷	سنہ ۱۹۳۲ء	۶۰

ہندوستان میں بچوں کی اموات کے اعداد سے اس کے برعکس نہایت تکلیف دہ صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔

سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت		سال	اموات ایک سال کے اندر بحساب فی ہزار ولادت	
	مرد	عورتیں		مرد	عورتیں
سنہ ۱۹۱۱ء	۲۱۴	۱۹۶	سنہ ۱۹۱۸ء	۲۷۴	۲۶۰
سنہ ۱۹۱۲ء	۲۱۶	۱۹۹	سنہ ۱۹۱۹ء	۲۲۸	۲۲۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۱۹۳	۱۹۷	سنہ ۱۹۲۰ء	۲۰۱	۱۸۸
سنہ ۱۹۱۴ء	۲۱۹	۲۰۴	سنہ ۱۹۲۲ء	۱۸۳	۱۶۶
سنہ ۱۹۱۵ء	۲۰۸	۱۹۵	سنہ ۱۹۲۵ء	۱۸۱	۱۶۷
سنہ ۱۹۱۶ء	۲۰۹	۱۹۵	سنہ ۱۹۲۸ء	۱۸۱	۱۶۴
سنہ ۱۹۱۷ء	۲۱۲	۱۹۸	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۸۸	۱۷۰

بچوں کی اموات کی اس عظیم شرح میں کسی قابل لحاظ کمی کی کوئی علامت

باب ۳

اس کمی کے مقابلے میں نہیں ہے جو مغربی یورپ میں واقع ہوئی ہے۔ اس کا باعث ایک حد تک اوائل عمر کے بیاہ کے رواج کو قرار دیا جا سکتا ہے، جو نہ صرف بچے کی توانائی اور اس کے نشو و نما کو متاثر کرتا ہے، بلکہ ماں کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں جب ماں کام کے لیے وقت نکالنا اور بچے سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہے تو اس کو افیون کھلا دیتی ہے اور عمدہ دودھ کثیر مقدار میں حاصل کرنے کی راہ میں بھی مشکلات ہیں؛ یہ دونوں عامل، خاص طور سے 61
شدید صورت میں بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں، اگرچہ دیہات میں بھی وہ کلیتہً مفقود نہیں ہیں؛ اور شرح اموات کی زیادتی کے اہم اسباب ہیں۔ لیکن ان سب اسباب سے بڑا سبب جو ان کی بڑی حد تک توجیہ بھی کرتا ہے عوام کے ہلاکت آفرین افلاس کا اثر ہے۔ ہندوستانی شرح اموات کے سلسلے میں دوسری خصوصیت استقرار حمل کی عمر کی عورتوں میں اموات کی کثرت ہے۔ چونکہ ہم اس واقعے کے اسباب پر مفصل بحث کر چکے ہیں یہاں مزید رائے زنی کی ضرورت نہیں۔

۱۲ - آبادی کا اضافہ -

اگر ہم گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے زمانے پر جس میں مردم شماری کے اعداد دستیاب ہوتے ہیں غور کریں تو، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی آبادی کے حقیقی اضافے کی رفتار ایک عشرے سے دوسرے عشرے تک بہت سست رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گو شرح ولادت اعلیٰ ہے، لیکن شرح اموات بھی اس کے قریب قریب مساوی ہے۔ اس لحاظ سے باقی رہنے والے نفوس کی شرح یورپ سے بدرجہا کم ہے۔ چنانچہ یورپ میں گو شرح ولادت بہت ادنیٰ ہے، تاہم شرح اموات اس سے بھی کم ہے۔ سنہ ۱۸۷۲ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے مابین ہندوستان کی آبادی میں صرف ۲۰ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں آبادی ۳۱۵و۱۵۶و۳۹۶ تھی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں بڑھ کر صرف ۳۱۸و۹۴۲و۴۸۰ ہوئی؛ گویا ۱ء۲ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں بارش کی عام کمی اور اسی کے ساتھ ساتھ بڑے انفلوئینزا کی وبا کی تباہ کاری نے آبادی کے گزشتہ سات سالہ فطری اضافے کا صفایا کر دیا، اور سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۲۱ء میں

باب ۳

غیر معمولی طور پر ادنیٰ شرح اضافہ کی یہی ذمہ دار تھی؛ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ انفلوئنزا سے ۱۴ ملین جانیں تلف ہوئیں۔ مندرجۂ ذیل جدول سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک دہے سے دوسرے دہے تک آبادی میں کس قدر بے قاعدہ تغیرات واقع ہوئے۔

ظاہری اضافہ		فی صد تغیر سابقہ مردم شماری کے بعد سے
مردم شماری بابتہ	آبادی بحساب ملین	
۱۸۷۲	۲۰۶٫۱۶	—
۱۸۸۱	۲۵۳٫۸۹	+ ۲۳٫۲
۱۸۹۱	۲۸۷٫۳۱	+ ۱۳٫۲
۱۹۰۱	۲۹۴٫۳۶	+ ۲٫۵
۱۹۱۱	۳۱۵٫۱۵	+ ۷٫۱
۱۹۲۱	۳۱۸٫۱۴	+ ۱٫۲
۱۹۳۱	۳۵۲٫۸	+ ۱۰٫۶

62 لیکن مردم شماری کے موقع پر رقبے اور آبادی کے اضافے کا لحاظ کرنے کے بعد نیز اس واقعے کو ملحوظ رکھنے کے بعد کہ مردم شماری کے طریقے بہت زیادہ صحیح ہو گئے ہیں، آبادی کے حقیقی اضافے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان ہی امور کا مناسب لحاظ کرنے کے بعد ہم ذیل کے نتیجے پر پہنچتے ہیں جو حقیقی اضافے کو ظاہر کرتا ہے[1]۔

ہندوستان میں سنہ ۱۸۷۲ء اور سنہ ۱۹۱۱ء کے مابین آبادی کا فی صد اضافہ تقریباً

---

[1] ۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۲۱ء جلد اول صفحہ ۷؛ اور ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۱۴۶۔

باب ۳

سال	اضافہ بوجہ شمول علاقہ جات جدید (ملین)	اضافہ بوجہ اصلاح طریق مردم شماری (ملین)	آبادی کا حقیقی اضافہ (ملین)	میزان (ملین)	آبادی کے اضافے کی فی صد شرح
۱۸۷۲ء تا ۱۸۸۱ء	۳۳ء۰	۱۲ء۰	۳ء۰	۴۸ء۰	۱ء۵
۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۱ء	۵ء۷	۳ء۵	۲۴ء۳	۳۳ء۵	۹ء۶
۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۱ء	۲ء۷	۰ء۲	۴ء۱	۷ء۰	۱ء۴
۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء	۱ء۸	—	۱۸ء۷	۲۰ء۵	۶ء۴
۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۱ء	۰ء۱	—	۳ء۷	۳ء۸	۱ء۲
۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء	۰ء۰	—	۳۴ء۰	۳۴ء۰	۱۰ء۶
میزان	۴۳ء۳	۱۵ء۷	۸۷ء۸	۱۴۶ء۸	۳۰ء۷

۲۰ تھا، اس کے برخلاف انگلستان اور ویلز میں ۵۸ء۲، ڈنمارک میں ۵۳ء۲ اور روس کو مستثنیٰ کر کے کل یورپ میں ۴۵ تھا[۱]۔ روس کو شامل کر کے یورپ کی آبادی ۳۰۵ ملین سے ۴۴۸ ملین تک بڑھ گئی، یا تقریباً ۴۷ فی صد اضافہ ہوا[۲]۔

ہندوستان میں جن سالوں میں غیر معمولی طور پر ادنیٰ[۱] شرح اضافہ ظاہر ہوتی ہے ان میں قحط اور طاعون جیسی آفتوں کا خاص طور پر ظہور رہا ہے جو فطری اضافے کو بڑی حد تک زائل کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جنوبی ہند میں ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء میں سخت قحط پڑا، اور ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۰ء میں قحط اور طاعون نے ملکر اضافے کو روک دیا۔

۱؎ دیکھو برج نرائن کی محولہ کتاب صفحہ ۱۱۔

۲؎ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ Grundriss Der Sazialokonomik شائع شدہ ۱۹۲۳ء جلد دوم باب (۱) صفحہ ۹۷ پر عنوان Wirts chaft und Natur

باب

سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۱ء کے زمانے کو "معتدل زرعی خوشحالی" کا دور کہا جاتا ہے؛ اور اگر طاعون اور ملیریا وبا کی شکل میں رونما نہ ہوتے تو آبادی میں بہت معقول اضافہ ہوتا؛ چنانچہ پنجاب اور یوپی میں جانوں کی کثیر تعداد ان وباؤں کی نذر ہوئی۔ سنہ ۱۸۸۱ء تا سنہ ۱۸۹۱ء کا عشرہ ہی صرف ایسا زمانہ تھا جو کسی غیر معمولی تباہی سے بچا رہا۔ اس لحاظ سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ۹،۶ فی صد کی شرح کو غیر معمولی شرح تصور کرنا چاہئے، اور اگر ہم آبادی کے معمولی اضافے کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ منہائی کرنی پڑے گی۔ معمولی اضافے کے مفہوم میں ہم اس اضافے کو شامل کرتے ہیں جو ایسے حالات کا نتیجہ ہو جو نہ تو غیر معمولی طور پر موافق ہوں اور نہ غیر معمولی طور پر ناموافق۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے ناظم یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ
63 "ہندوستان کی آبادی کے ممکنہ فطری اضافے کی حد، ترقی کی موجودہ حالت میں اور غیر معمولی آفتوں سے قطع نظر کر کے، دس سال کی مدت میں ۷ اور ۸ فی صد ہے[1]؛ لیکن ان کا یہ اندازہ بہت ہی کم ہے۔ کل ہندوستان میں سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے مابین بقدر ۶،۱۰ فی صد حقیقی اضافہ ہوا اور یہ بھی سنہ ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کے باوجود جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس وبا سے زیادہ تر تولیدی قوت رکھنے والی آبادی متاثر ہوئی تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۱ء کے دور کے برخلاف سنہ ۱۹۳۱ء سے پیشتر کے دس سال آبادی کے اضافے کے لیے خاص طور سے موافق تھے؛ چنانچہ آبادی حقیقی طور پر ۳۴ ملین تک بڑھ گئی۔ اس دہے میں کوئی سخت قحط نمودار نہیں ہوا، اور ہیضہ، طاعون اور کالا آزار جیسے متعدی امراض کو دفع کرنے کے طریقوں میں استقلال کے ساتھ اصلاح و ترقی ہو رہی ہے[2]۔

[1] دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴۸۔

[2] سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۱ء کے دہے میں کالا آزار کے علاج کا جو جدید طریقہ نکلا اور جس میں نامیاتی کھلی مرکبات کا استعمال کیا جاتا ہے، مرض کو دس دن میں یا اس سے بھی کم مدت میں دفع کر دیتا ہے۔

باب ۲

۱۳۔ مفرط آبادی کا مسئلہ:۔ یورپ اور ہندوستان میں بحث مباحثہ

عام خیال تو یہ ہے کہ دنیا کی آبادی تہذیب و تمدن کے طلوع سے مسلسل اور مستقل طور پر بڑھ رہی ہے، لیکن تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف عام حالت یہ رہی ہے کہ طویل مدت یعنے صدیوں تک آبادی ایک ہی حالت پر قایم رہی ہے، اور اس کی تعداد میں سریع اضافہ صرف بہت ہی حال کے زمانے میں رونما ہوا ہے۔ تقریباً گزشتہ ایک سو سال کے دوران میں دنیا کی آبادی ۹۱۰ ملین سے بڑھ کر کم و بیش ۱۹۰۰ ملین تک پہنچی ہے۔ اس نادر اضافے کا باعث انیسویں اور بیسویں صدیوں کی نئی نئی کلوں کی عہد آفریں ایجادیں، نئے عملوں اور طریقوں کی دریافت اور سائنس کے عظیم انکشافات ہیں، جن کی بدولت انسانوں کی بہت بڑی تعداد پہلے سے زیادہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کرتی ہے۔ موجودہ زمانے کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ جو دنیا کے معاشیات دانوں اور جریدہ نگاروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہا ہے یہ ہے کہ آیا آبادی کے اضافے کی موجودہ شرح، سائنسی ترقی کو اس کے قدم بہ قدم رکھ کر برقرار رکھی جا سکتی ہے یا نہیں، یا ہم کو بقول کینس یہ خیال کرنا چاہئے کہ ''انیسویں صدی کی شاندار درمیانی داستان ختم ہو چکی''[لہ] اور یہ کہ سائنس کے حیرت انگیز کارناموں اور کمالات کے جو مفید اثرات انسانی خوشحالی پر پڑے ان کو برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کو ارادی طور پر روکا جائے۔ گزشتہ چند سال سے یہ خیال بتدریج تقویت حاصل کر رہا ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی آبادی کے حد اعتدال سے متجاوز ہو جانے کا خطرہ پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اس سوال پر بہت کچھ بحث مباحثہ ہوا ہے کہ آیا ہندوستان کے افلاس کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب غیر محدود اضافہ ہے یا نہیں۔ سرکاری رائے اس نظرئے کی تائید میں رہی ہے کہ ہندوستان کی ناداری کا ایک قوی سبب 64

لہ۔ دیکھو جے، ام، کینس کی تصنیف۔

باب۳

مفرط آبادی نہ ہے؛ اس کے برخلاف سیاسی گروہ اس نظریئے کا اس لیے عام طور پر مخالف ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے سے حکومت تمام الزامات سے یا اہل ہند کے ناقابل انکار افلاس کی ذمہ داری سے بظاہر بری اور سبکدوش ہو جاتی ہے۔

۴ا۔ مفرط آبادی کا مفہوم۔

آبادی کی افراط کو یا تو ایک حالت تصور کیا جا سکتا ہے یا ایک میلان، اور اس کو انتہائی یا متوازن آبادی کے تخیل سے وابستہ کرنا بہترین ہے۔ چنانچہ کینن نے اس کی حسب ذیل تشریح کی ہے:۔ "کسی مقررہ وقت میں، یا دوسرے الفاظ میں، معلومات اور حالات مساوی و مقررہ رہنے کی صورت میں، وہ چیز موجود ہوتی ہے جس کو اعظم یا بیش ترین ماحصل کا مقام کہہ سکتے ہیں؛ اور اس وقت محنت کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ اس میں اضافہ اور تخفیف، دونوں، متناسب ماحصل میں کمی کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہر ایک صنعت میں اعظم یا بیش ترین ماحصل کا ایک مقام ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح تمام صنعتوں میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مقررہ مقام ہونا ضروری ہے۔ اگر آبادی اتنی کافی بڑی نہ ہو جو صنعت کو اس مقام پر لا سکے تو ماحصل جتنا وصول ہو سکتا ہے اس سے کم وصول ہوگا، اور اس کا علاج آبادی کا اضافہ ہے۔ اگر اس کے برخلاف آبادی اتنی بڑی ہو کہ اس مقام سے متجاوز ہو جائے تو، اس صورت میں بھی ماحصل اس سے کم وصول ہوگا جتنا کہ ہو سکتا ہے اور اس کا علاج آبادی کی کمی ہے[۱]"۔ مفرط آبادی کا مفہوم یہ ہے کہ آبادی متوازن تعداد سے تجاوز کر جائے۔

آبادی کی کثرت کے معنی مزدوروں کی تعداد کی زیادتی کے ہیں، اور ان کی زاید محنت کا نتیجہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مجموعی دولت میں اضافہ ہوتا ہے؛ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ آیا یہ اضافہ، آبادی کی زیادتی کے متناسب ہوتا ہے یا نہیں، تاکہ فی کس حصہ کم از کم سابق کی طرح مقررہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ خدا نے ہر منہ کے ساتھ دو ہاتھ بھی دیئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا زاید آبادی اپنے ہاتھوں کی

[۱]۔ دیکھو کینین کی کتاب موسوم بہ "دولت" صفحہ ۶۸ تا ۶۹۔

باب۳

مدد سے اپنے بل بوتے پر پوری طرح کھڑی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ جب ایک مقررہ آبادی
میں اضافے کے آثار اس طور پر ظاہر ہوں جس سے فی کس آمدنی میں کمی کی توقع ہو تو
اس کو ہم "مفرط آبادی کا میلان" کہیں گے۔ اور جب یہ توقع کرنے کے اسباب
موجود ہوں کہ اگر موجودہ تعداد میں کچھ کمی واقع ہو تو اس کی وجہ سے فی کس آمدنی میں
اضافہ ہو جائے گا تو ہم اس کو "مفرط آبادی کی حالت" سے تعبیر کریں گے[1]۔ یہ بھی کوئی
غیر معمولی بات نہیں کہ میلان اور حالت دونوں ساتھ ساتھ موجود رہیں؛ چنانچہ
اکثر لوگوں کے خیال میں آج کل ہندوستان کی یہی حالت ہے، یعنے دونوں ساتھ ساتھ
پائے جاتے ہیں۔ حالیہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مالتھس کا نظریہ آبادی،
متعدد اعتباروں سے ناقص ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں صداقت کا ایک
اہم عنصر موجود ہے۔ مالتھس نے، انسان کی بڑھنے کی قوت کا بالکل صحیح اندازہ کیا تھا،
اور وہ یہ خیال قائم کرنے میں بھی حق بجانب تھا کہ اگر انسان کو اپنی تولیدی قوت
سے پوری طرح کام لینے کا موقع ملے تو ذرائع معاش غیر معمولی طور سے موافق حالات 65
کے بغیر، اضافۂ آبادی کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ عورت
مرد کا ایک جوڑا، اضافے کی موجودہ شرح سے، ۱۷۵ سال میں اولاد در اولاد اتنے
انسان پیدا کر سکتا ہے جن کی تعداد دنیا کی موجودہ آبادی کے مساوی ہوگی؛ گو
یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ موجودہ شرح اعلیٰ ترین ممکنہ شرح نہیں ہے بلکہ
ایجابی و انسدادی مانعات کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ کمی ہو گئی ہے۔
انسان کی تولیدی قوت کا یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح کارفرما ہونے کی
صورت میں پیدائش دولت کے صنائع و فنون کی ممکنہ ترقی پر بآسانی سبقت
لے جائے گی۔ اس لحاظ سے اگر کسی ملک کے متعلق بے روک ولادتوں کا واقعہ تسلیم
کر لیا جائے تو اس کو اس بات کی قوی قیاسی شہادت جو تقریباً قطعی ثبوت کے
مساوی ہے ماننا پڑے گا کہ متعلقہ ملک میں آبادی کی افراط ہے۔ چنانچہ مفرط
آبادی کے آثار و علائم، اعلیٰ شرح ولادت اور اعلیٰ شرح اموات، خاص کر

[1] مقابلے کے لیے دیکھو پی، یس، فلورنس کی کتاب موسوم بہ "مفرط آبادی" صفحہ ۱۱۔

باب ۲

بچوں کے اموات کی کثرت ہیں۔

۱۵۔ ہندوستان کی صورت حال[۱] مذکورۂ بالا بحث کی روشنی میں ہم اب اس سوال پر غور کرنے کے قابل ہیں کہ آیا موجودہ زمانے میں ہندوستان سے مفرط آبادی کی ''حالت'' یا ''میلان'' یا ''دونوں کی ساتھ ساتھ موجودگی'' کو منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اہم ترین قابل غور معاملہ یہ ہے کہ آیا اضافۂ آبادی کے انسدادی مانعات میں سے کوئی مانع ہندوستان میں موثر طریقے پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ انسدادی مانعات موجود نہیں ہیں یا یہ کہ ان کا اثر نظر انداز کرنے کے قابل ہے، اور یہ کہ آبادی کی روک زیادہ تر ایجابی مانعات مثلاً وبا قحط وغیرہ کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آبادی کی افراط کو ملک کی موجودہ خرابی ثابت کرنے کے لیے ہم نے زوردار مقدمہ تیار کر لیا۔

۱۶۔ انسدادی مانعات آبادی کے متعدد انسدادی مانعات[۲] کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔ (۱) بیاہ کو ملتوی کر کے شرح ازدواج کو کم کرنا یا تجرد کی زندگی بسر کرنا۔ (۲) شادی کے بعد کم اولاد پیدا ہونا۔ (ا) قدرتی طور پر، مثلاً قوت تولید کم ہونا۔ (ب) اتفاقی طور پر، مثلاً شوہر کے دور یا غائب رہنے کی وجہ سے اولاد کم پیدا ہونا۔ (ج) ارادی طور پر تولید سے اجتناب کرنا، ضبط سے کام لینا، مانع حمل طریقے استعمال کرنا، اور عمداً اسقاط حمل کرنا، وغیرہ۔ (۳) بعض معاشری حالات و رسوم مثلاً زمانۂ رضاعت کو طول دینا، اونچی ذات میں بیاہ کرنا وغیرہ۔ (۴) طفل کشی (۵) افلاس، امراض وغیرہ وغیرہ۔

[۱]۔ ہندوستان کی مفرط آبادی کے مسئلے پر عمدہ بحث کے لیے قاری کو سی، جے ہیملٹن کے اس مضمون کا حوالہ دیا جاتا ہے جو انھوں نے انڈین اکنامک کانفرنس کے ساتویں اجلاس (۱۹۲۴ء) میں بمقام بمبئی پڑھا تھا۔ چنانچہ ہم نے پروفیسر ہیملٹن کے عام طریق استدلال ہی کو اختیار کیا ہے، گو اس میں بہت کچھ تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔

[۲]۔ دیکھو پی، کیس فلورنس کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۱۰۔

باب ۳

اب ہم اس مسئلے پر بحث کریں گے کہ آیا ان انسدادی طریقوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ ہندوستان میں رائج ہیں یا نہیں اور آیا ان طریقوں کا عمل اس قدرتی میلان کو زائل کرنے میں کہ آبادی کا اضافہ ذرائع معاش سے متجاوز ہو جاتا ہے موثر ہے یا نہیں۔

66

۱۷۔ ہندوستان میں ازدواج کی شرح۔

اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر امر یہ ہے کہ ہندوستان میں ازدواجی حالت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ مغرب میں مذہب عام طور پر تجرد کی تاکید کرتا ہے، لیکن ہندوستان میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ "ہر ہندو پر بیاہ کرنا اور اولاد پیدا کرنا مذہباً واجب ہے؛ اگر لڑکے پیدا ہوں تو بہت اچھا ہے، تاکہ باپ کے کریا کرم کی رسوم ادا کر سکیں؛ ورنہ باپ کی آتما زمین کے خلاؤں میں تکلیف و بے چینی کے ساتھ بھٹکتی پھرے گی"[۱] سماج کی بدگوئی سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو سن بلوغ کو پہنچنے سے پیشتر بیاہ دینا ضروری ہے[۲]۔ مسلمانوں اور مظاہر پرستوں میں اگرچہ اوائل عمر کے بیاہ کو مذہبی فرض قرار نہیں دیا گیا ہے، پھر بھی ان میں بچپن کی شادیاں مساوی طور پر عام ہیں۔ اشتراک خاندان کا رواج اس کی مزید ہمت افزائی کرتا ہے۔ چونکہ خاندان کی آمدنی نئے شادی شدہ جوڑے کی کفالت کے لیے غیر معین مدت کے لیے مہیا رہتی ہے، اس لیے ایسے عاقلانہ و عاقبت اندیشانہ ملحوظات، جیسے کہ یورپ میں ہیں اور عام طور پر بیاہ کے التوا پر مجبور کرتے ہیں، ہندوستان میں بہ مشکل اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف معاشی ملحوظات عوام میں بیاہ کو روکنے کے بجائے اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں؛ اس لیے کہ بیوی گھر کے سازوسامان کی حیثیت سے

۱۔ دیکھو پی کے وٹل کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں مسئلہ آبادی" صفحہ ۲۳

۲۔ "اگر اونچی ذات کی ہندو عورت بالغ ہونے پر بھی ان بیاہی رہے، تو صرف وہ اور اس کا خاندان ہی ملعون خلائق نہ بنے گا بلکہ مذہبی کتابوں کی بعض عبارتوں کی تفسیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اسلاف کی تین پشتیں بھی لعنت ملامت کا نشانہ بنیں گی۔" دیکھو ہیج رس لے کی کتاب موسوم بہ "اقوام ہند" صفحہ ۱۵۴۔ (People of India)

باب۳

ضروری ہے، اور وہ شوہر کو گھر سے باہر کام کرنے میں بھی عام طور پر مدد دیتی ہے۔ رہے بچے تو، وہ بھی چھوٹی سی چھوٹی قابل عمل عمر سے کسی نہ کسی کام پر لگائے جاتے ہیں اور بہ عجلت ممکنہ اپنے مصارف کو پورا کرنے کے لیے آمدنی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ خاندان پر ان کا کوئی بار اس لیے محسوس نہیں کیا جاتا کہ مروجہ معیار زندگی قوت لایموت کے لحاظ سے، ادنیٰ ترین ہے؛ اور یہ معیار بچوں کے لیے طویل مدت کی تربیت نہیں چاہتا جس کی مدد سے وہ اس انتہائی ادنیٰ معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے قابل بنیں جس کے وہ عادی ہوں۔ قوم کے نونہالوں سے اس طرح قبل از وقت کام لینے سے معاشرے کو انجام کار جو مضرت پہنچتی ہے اس کا عام طور پر احساس نہیں ہے؛ اور اگر اس احساس میں موجودہ حالت کے مقابلے میں کچھ زیادتی ہو بھی جائے تب بھی انتہائی افلاس کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو طویل مدت تک تربیت دینے اور انھیں زندگی کی کشاکش کے لیے زیادہ موثر طریقے پر تیار کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں مجموعی آبادی ۳۵۲،۸۳۷،۷۷۸ تھی، جس کے منجملہ ۸۴،۲۰۸،۴۶۷ (یا ۴۷ فی صد) مرد اور ۸۳،۶۰۷،۲۲۳ (یا ۴۹ فی صد) عورتیں، شادی شدہ تھیں؛ اور ۸۶،۳۴۸،۰۰۱ (یا ۴۸ فی صد) مرد اور ۵۹،۶۹۸،۰۴۲ (یا ۳۵ فی صد) عورتیں ان بیاہی تھیں باقی رنڈوے اور بیوائیں تھیں[1]۔

67 دنیا کے تمام ملکوں میں ہندوستان ہی تنہا ایک ملک ہے جہاں دونوں صنفوں یعنے مردوں اور عورتوں کے ان بیاہوں کا تناسب کمترین ہے۔

---

[1] ان اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی شدہ مردوں کا تناسب شادی شدہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے؛ اس کے برخلاف پچھلی مردم شماریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں شادی شدہ عورتوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہٹن کا یہ خیال ہے کہ گزشتہ مردم شماری میں شادی شدہ عورتوں کی کثیر تعداد (قریب قریب ½ ملین) اس ڈر سے غیر شادی شدہ بتلائی گئی کہ کہیں شاردا ایکٹ کے تحت (جو یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کو نافذ کیا گیا) ان پر مقدمہ نہ چلایا جائے۔

البتہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی شادی کی عمر کسی قدر زیادہ ہے[1]۔ اگر انگلستان اور ویلز کے اعداد عام طور پر مغربی یورپ کے نمایندہ مان لیے جائیں تو ہندوستان میں شادیوں کی شرح، صوبہ وار تغیرات کے باوجود، یورپ کے مقابلے میں بہت اعلیٰ ہے۔ چنانچہ غیر شادی شدہ مردوں کی ۴۰ فی صد کی مجموعی آبادی کے منجملہ تین چوتھائی سے کچھ زیادہ (یا ۷۷ فی صد) ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں؛ اس کے برخلاف غیر شادی شدہ عورتوں کی مجموعی آبادی یعنی ۳۵ فیصد کے منجملہ ۱۹ فی صد کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ شباب و تاہل کا زمانہ یعنی ۱۵ تا ۴۰ کی عمر لی جائے تو غیر شادی شدہ عورتوں کی آبادی کا تناسب ۵ فی صد تک گھٹ جاتا ہے، اس کے برخلاف انگلستان اور ویلز میں یہ تناسب ۳۶ فی صد ہے[2]۔

بعض صورتوں میں شادی کی رسم اور رخصتی کے مابین بہت طویل مدت حائل ہوتی ہے، لیکن ایسی صورتیں بہت شاذ ہوتی ہیں؛ چنانچہ بحیثیت مجموعی ان کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

بیاہ کی عمومیت، اس واقعے سے کسی حد تک زائل ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں میں بیواؤں کی شادی بہت شاذ ہوتی ہے، گو اس کے خلاف میلان بتدریج رفع ہو رہا ہے۔

کچھ سال ادھر سے مردوں اور عورتوں، دونوں، میں شادی کی عمر کو بڑھا دینے کی موافقت میں میلان رونما ہوا ہے۔ لیکن یہ میلان صرف تعلیم یافتہ

---

[1] ھ۔ قانون ازدواج اطفال یا شاردا ایکٹ بابتہ ۱۹۲۹ء کی رو سے لڑکیوں کی شادی کی عمر ۱۴ سال قرار دی گئی ہے، گو یہ تدبیر، اصلاح کی ابتدا کے طور پر پسندیدہ ہے، پھر بھی اس کے نتائج و اثرات، تعداد کے نقطۂ نظر سے یقیناً بالکل نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ بدقسمتی سے یہ ایسی حالت بھی ہے جس میں قانون، رائے عامہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور آگے بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس قانون کی خلاف ورزی بھی بہت عام طور پر ہوتی ہے۔ اگر برطانوی ہند کے ساتھ دیسی ریاستیں بھی مل کر کام کریں اور اسی قسم کے آئین و قوانین وضع کریں تو، صورت حال کی اصلاح ہو جائے گی۔

[2] ھ۔ دیکھو، کے وٹل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۴۲۔

طبقوں تک محدود ہے جن کی تعداد حقیر ہے، اور عوام میں ابھی تک رونما نہیں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں شادی کو ملتوی کرنے کا میلان عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں زیادہ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن شادی کا التوا، آبادی کی روک کے نقطۂ نظر سے، اس وقت بدرجہا زیادہ موثر ہوگا جبکہ لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کے بارے میں اس پر زیادہ عمل ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نقطۂ نظر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شادی کی عمر کا التوا، تاوقتیکہ وہ قابل لحاظ حد تک نہ ہو، آخری نتیجے کے طور پر آبادی کو کم کرنے کی بجائے بڑھائے گا یا نہیں۔ بچپن کی شادی، شوہر اور زوجہ اور خاص کر زوجہ کی صحت و تندرستی پر مضر اثر ڈالتی اور بارآوری کو کم کرتی ہے؛ لہذا شادی کی عمر میں اضافہ کرنے سے بارآوری میں بھی اضافہ ہوگا۔ بچپن کی شادی سے ایک اور خرابی منسوب کی جاتی ہے اور وہ قبل بلوغ جماع ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ اس سے زیادہ عام ہے جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کم عمر بیوی کو
68 شدید جسمانی ضرر پہنچا کر بارآوری کو کم کرنے کا موجب بنتا ہے۔ گو بچپن کی شادی کے رواج کی تنسیخ، معاشی اصلاح کے کسی نظام نامے میں بھی اہم ترین مدوں میں سے ایک مد ہونی چاہئے؛ پھر بھی یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اس کا براہ راست نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آبادی میں زیادہ سرعت کے ساتھ اضافہ ہو؛ اور یہ نتیجہ، تاوقتیکہ شادی کی اوسط عمر خاص کر عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ نہ بڑھا دی جائے اور تاوقتیکہ دوسری قسم کے روک موثر نہ ہوں، لازماً رونما ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ، ہندوستان میں شادی سے اجتناب یا اس کے التوا کے ذریعے سے اضافۂ آبادی کی روک کم و بیش مفقود ہے، اور حیوانی جبلت کو نیم مذہبی جواز سے مستحکم کرکے اپنا فعل زبوں انجام دینے کے لیے آزاد چھوڑا گیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستانی شرح ولادت، دنیا کی اعلیٰ ترین شرحوں میں سے ہے۔

۱۸۔ ادنیٰ بارآوری۔

(۱) قدرتی۔ لیکن ہندوستان میں، بدرجہا اعلیٰ شرح ولادت کے باوجود آبادی کا موثر اضافہ یورپ کے ملکوں کے مقابلے میں بدرجہا کم ہے؛ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

باب ۳

شرح اموات بہت اعلیٰ ہے۔ تاہم عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نتیجے کا باعث ایک حد تک ہندوستانیوں کی ادنیٰ قوت تولید ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عمر کی شادی شدہ ہندوستانی عورتوں میں بارآوری فی ہزار ۱۲۰ ہے؛ اس کے برخلاف انگلستان میں یہ اوسط ۱۹۶ فی ہزار ہے[۱]؛ اور یہ اعداد اس نظریے کی تائید میں بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں کہ تولیدی قوت کی زیادتی تہذیب و تمدن کی ترقی سے وابستہ ہوتی ہے[۲]۔ لیکن ''بارآوری'' اور ''قوت تولید'' میں احتیاط کے ساتھ تمیز و تفریق کرنا ضروری ہے۔ ''قوت تولید'' کا لفظ ''بچہ کشی کی قوت'' کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اور ''بارآوری'' کے معنی ''بچہ کشی کا حقیقی درجہ'' لیے گئے ہیں۔

۱۔ دیکھو کارسانڈرس کی محولۂ کتاب صفحہ ۶۷۔

۲۔ قوت تولید اور بارآوری کے درمیان احتیاط کے ساتھ تمیز و تفریق نہ کرنے کے باعث عام طور پر کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں قوتِ تولید زیادہ ہے تو اس کا مطلب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ لیکن محض اس سے مسلمانوں کی قوتِ تولید کی زیادتی کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ دوسرے متعدد عاملین مسلمانوں کی تعداد کے اضافے کی اعلیٰ شرح کی کافی توجیہ کرتے ہیں، مثلاً اولاً یہ کہ اوائل عمر کی شادی کا رواج جو صحت کے لیے مضر ہے اور بارآوری کو کم کرتا ہے، مسلمانوں میں نسبتاً کم ہے؛ دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں بیواؤں کی مکرر شادی کا رواج ہے؛ اور تیسرے اونچی ذات میں بیاہ کرنے کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ اسلامی آبادی کے اضافے کی اعلیٰ شرح یکے بعد دیگرے متعدد مردم شماریوں سے ظاہر ہو رہی ہے جس کی وجہ ایک حد تک یہ بھی ہے کہ ہندو تبدیل مذہب کر کے مسلمان ہو جاتے ہیں (اس تحریک کا پوری طرح ازالہ شدھی سے نہیں ہو رہا ہے جس میں مسلمان مرتد کر کے ہندو بنا لیے جاتے ہیں چنانچہ ان کی تعداد نو مسلموں کی تعداد سے زائد نہیں ہے)؛ اور دوسری وجہ یہ واقعہ ہے کہ عیسائیت جیسے مذاہب مسلمانوں کے مقابلے میں ذات پات کے جھگڑوں میں مبتلا ہندوؤں سے مذہب تبدیل کرانے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

باب ۳

اس بیان کا کہ ہندوستانیوں کی تولیدی قوت ادنیٰ ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان میں ہر سال مجموعی آبادی کے مقابلے میں کم تناسب سے بچے پیدا
69 ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ یہ علانیہ طور پر غیر صحیح ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، ایک ہندوستانی عورت، بچہ جننے کی عمر میں، انگریز عورت کے مقابلے میں، کم بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں، تولیدی قوت کو پوری طرح کام میں نہیں لایا جاتا اس لیے کہ وہاں تجرد کی زندگی اور بیاہ کا التوا ہندوستان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ عام ہے۔ غرض ہندوستان کی اعلیٰ شرح ولادت کا واقعہ اس نظریے کے خلاف نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کی قوتِ تولید کمتر اور گھٹیا ہے۔

یہ استدلال کیا گیا ہے کہ بار آوری کے اس فرق کی توجیہ ہندوستان کی شادیوں کے رواج سے کلیتہً نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ گو وہ بلاشبہ بار آوری کو کم کرنے والے اہم اسباب میں سے ایک ہے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس اعتبار سے یورپ میں انسدادی مانعات کا وسیع استعمال بدرجہا زیادہ کارگر اور موثر ہے، اور اس لحاظ سے یورپی اقوام کے مقابلے میں ہندوستان کی ادنیٰ بار آوری کا باعث ہندوستانیوں کی کمتر اور گھٹیا قدرتی تولیدی قوت کو قرار دینا چاہئے۔ تاہم ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ جس میں قوت تولید کی زیادتی کو تہذیب و تمدن کی ترقی سے منسوب کیا گیا ہے، محض ایک مفروضے کی نوعیت رکھتا ہے جس کی پوری پوری تصدیق ناقابل اعتراض شہادت سے ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ یہ نظریہ، اس عام طور پر مسلمہ خیال کے بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے کہ "تولیدی قوت، عقلی و ذہنی نشو و نما اور مادی بہبودی و ترقی کے ساتھ ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔"

۵ے۔ ہم یقیناً ایک شادی شدہ ہندوستانی عورت کے جنے ہوئے بچوں کی تعداد کا مقابلہ ایک شادی شدہ یورپین عورت کے پیدا کردہ بچوں کی تعداد سے کر رہے ہیں۔ یہ بتانے کی بمشکل ضرورت ہے کہ مجموعی آبادی میں شادی شدہ عورتوں کا تناسب یورپ کے مقابلے میں یہاں بہت بڑھیا اور اعلیٰ ہے، چنانچہ یہاں اسی کے باعث شرح ولادت بھی مقابلتہً اعلیٰ ہے۔

باب ۳

(۲) اتفاقی۔ بعض اوقات یہ ممکن ہے کہ میاں اپنی بیوی سے طویل مدت تک جدا رہے؛ مثلاً قلت باراں کے باعث میاں اپنا گھر بار چھوڑ کر دور دراز مقام کو چلا جائے اور ممکن ہے کہ مہینوں اپنے گھر سے دور رہے۔ لیکن اس قسم کے واقعات گاہ گاہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، چنانچہ بارآوری کے کم کرنے میں اس کے اثر پر غور کرنے کے لیے ہمیں توقف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) ارادی۔ مالتھس کے مفہوم کے لحاظ سے اخلاقی اجتناب کے طریقے پر کسی بڑی حد تک یقیناً عمل نہیں کیا جاتا اور یہی بات جدید مالتھسی طریقوں کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ یہ خیال کرنے کی وجہ ہے کہ یہ طریقے بتدریج مقبول ہوتے جا رہے ہیں، اور آئندہ بھی ان کے زیادہ عام ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن سردست ان کا اثر ہندوستان میں شرح ولادت کو کم کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ارادی اسقاط حمل کے طریقے پر ابھی تک کسی حد تک عمل کیا جاتا ہے، لیکن قانون نے اس طریقے کو نہایت مناسب طور پر بڑا جرم قرار دیا ہے؛ چنانچہ موجودہ حالت میں آبادی کے اعظم ترین اضافے کو روکنے کے سلسلے میں اس طریقے کا اثر سرعت کے ساتھ گھٹ رہا ہے۔[۱]

70 **۱۹۔ معاشری رسم و رواج: رضاعت کا طویل زمانہ**

ہندوستان میں بچوں کو زمانۂ دراز تک دودھ پلانے کا طریقہ عام ہے اور عوام کا خیال یہ ہے کہ طبی رائے اس طریقے کی تائید میں ہے۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حمل کم قرار پاتا ہے۔ یورپی ماں خوبصورتی کو قایم و برقرار رکھنے کے خیالات کے زیر اثر بعض اوقات بچے کو اپنی چھاتی کا دودھ ہی نہیں پلاتی، یا اگر پلاتی بھی ہے تو بچہ ہندوستان کے مقابلے میں بہت جلد کمزور ہو جاتا ہے۔ طبی شہادت کے

---

[۱] اسقاط کا طریقہ جس حد تک اس کو اختیار کیا جاتا ہے، زیادہ تر جرم کو چھپانے اور ناجائز ولادتوں کو روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ وہ رائے عامہ کے کسی بڑے حصے کے نزدیک جائز ولادتوں کو روکنے کا پوری طرح مسلمہ طریقہ ہے۔

باب ۳

مطابق، نو ماہ یا ایک سال سے زیادہ رضاعت کے زمانے کو طول دینا ماں اور بچے دونوں کے لیے مضر ہے؛ چنانچہ یورپی ماؤں کے دودھ نہ پلانے کی ایک اور وجہ یہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس طریقے کے عام رواج کے متعلق یہ خیال کرنا ضروری ہے کہ وہ اضافۂ آبادی کو روکنے والا ایک اہم عامل ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ازدواجی زندگی میں کثرت اولاد کو روکنے کے خیال سے ارادی طور پر مباشرت سے پرہیز کرنے کا طریقہ ہندوستان میں قریب قریب مفقود ہے۔ البتہ بعض مذہبی ہدایات کے مطابق بعض زمانوں میں لازمی طور پر اجتناب کرنا پڑتا ہے، مثلاً منو کی یہ تاکید ہے کہ ماہ ہلالی کے ابتدائی اور درمیانی زمانے میں شوہر اپنی بیوی سے الگ رہے۔ لیکن اس کے باوجود متعدد جدید اثرات کے تحت اس قسم کے قواعد کی سختی کے ساتھ پابندی میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ قواعد طویل مدت تک اجتناب کو ضروری ہی نہیں قرار دیتے اور ان کا عملی اثر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

اونچی ذات میں بیاہ کرنے کا رواج اب بھی ہندوستان کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مشرقی بنگال میں یہ ایک حد تک لازمی طور پر آبادی کے اضافے کو روکتا ہے۔ یہ رواج لڑکی کو ایسے مرد سے شادی کرنے سے باز رکھتا ہے جو معاشری رتبے میں لڑکی کے مساوی یا اس سے کم ہو، اور اس کو اونچی ذات اور مرتبے والے مرد سے شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اونچے طبقوں کے دولہاؤں کی تعداد محدود ہے، اس لیے ان سے رشتہ جوڑنے کے واسطے بہت سرگرمی کے ساتھ مسابقت ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے جہیز اور ڈھینٹ تعدد ازدواج وغیرہ جیسی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔[1]

[1] میں دو کلینوں کو جانتا ہوں جن میں سے ایک کی ساٹھ اور دوسرے کی سو سے زائد بیویاں تھیں۔ ان دونوں مردوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک کتاب تھی جس میں وہ اپنی بیاہی بیویوں کے باپوں کے نام تحریر کر لیتا تھا۔ ہر مرد آغاز موسم سرما میں یادداشت کی کتاب اپنے ساتھ لے کر اپنی اپنی بیویوں کے پاس دورے کو نکلتا تھا اور ہر بیوی سے مل کر اور اس کے باپ کی حیثیت کے مطابق روپیہ وصول کر کے

باب ۔

۲۰۔ طفل کشی

بعض انتہائی صورتوں میں، لڑکی کو مقررہ طریقوں پر بیاہ دینے کی دقت و دشواری کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مار ڈالی جاتی ہے۔ بلوغ سے پیشتر لڑکی کو بیاہ دینے کا جو معاشری و مذہبی لزوم ہے اس کی بنا پر لڑکیوں کی ولادت عام طور پر نامبارک خیال کی جاتی ہے؛ چنانچہ لڑکیوں سے بے اعتنائی برتنے کے اسباب کے منجملہ ایک سبب یہی ہے اور اونچے طبقوں میں لڑکیوں کا بیاہ کرنے کا رواج جہاں کہیں پایا جاتا ہے وہاں انکی
71 حالت اور بھی بدتر ہوجاتی ہے۔ لیکن حقیقی دختر کشی کا باقاعدہ رواج[1]، ارادی اسقاط حمل کے مثل بہت کم ہوگیا ہے، اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ قانون اور رائے عامہ کی متحدہ قوت، عنقریب اس کے باقیماندہ نشانات کو بھی بالکل مٹادے گی۔

۲۱۔ افلاس اور امراض[2]

ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ افلاس جسمانی قوت و توانائی کو گھٹا کر اور اس طرح شرح ولادت کی تحدید کرکے، کیا کیا ممکنہ اثرات ڈال سکتا ہے۔ چنانچہ افلاس ہی کو پرورش اطفال میں بے پروائی،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: موسم گرما شروع ہونے تک گھر لوٹ آتا تھا، تاکہ سال کا باقی حصہ اپنے قریہ میں گزارے ....، ماخوذ از کتاب بابو آبھیا چندر داس، جس کا حوالہ رسؔ لے نے اپنی محولۂ بالا تصنیف میں صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۷ پر دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں کلینی طریقہ اس قدر شدید اور زبون شکل میں تو رائج نہیں ہے لیکن بالکل مفقود بھی نہیں ہے۔ چنانچہ رسؔ لے آگے چل کر لکھتا ہے کہ "لڑکیوں کا بیاہ اونچے طبقوں میں کرنے کا اصول ایک نئی شکل میں رونما ہوا ہے اور وہ یوں کہ اب بنگال کے بیاہ کے بازار میں گریجویٹ (طیلسانی) شوہروں کی مانگ ہے۔"

[1] "پنجاب میں بیس سال پیشتر کے مقابلے میں اب حالات غالباً بہتر ہیں لیکن پھر بھی ایسے جاٹ اور راجپوت موجود ہیں جو اپنی لڑکیوں کی شادی اپنے سے کم درجے والوں میں کرنے کے بجائے لڑکیوں کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" دیکھو ام، آل ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ "پنجابی کسان خوش حالی اور قرضداری میں" صفحہ ۵۶
(The Punjab Peasent in Prosperity and Debt)

[2] یوں تو عام طور پر افلاس اور امراض کو ایجابی مانعات کے تحت شمار کیا جاتا ہے، لیکن یہاں ان کو انسدادی مانعات کے تحت اس لیے شمار کیا گیا ہے کہ ہم یہ غور نہیں کررہے ہیں کہ موجودہ آبادی کو کم کرنے میں ان کے

باب ۳

بے احتیاطی اور کوتاہ اندیشی کا ایک سبب قرار دیا جاتا ہے، گو شادی کے حق میں وہ یوں حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے کہ ضروری مصارف کو پورا کرنے کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے شادی بادل ناخواستہ ملتوی کر دی جاتی ہے۔ لیکن ادھر مالی حالت کی اصلاح و ترقی ہوئی اور ادھر ملتوی شدہ بیاہ کی رسم بموقع اول رچائی جاتی ہے۔

ملیریا بخار، جس سے ہندوستان کا کوئی گوشہ بہ مشکل کلیتہً بچا ہوا ہے، بارآوری کے حق میں سخت مضر ہے، اور بچہ پیدا کرنے کے قابل عمروں میں عورتوں کے، ملیریا میں مبتلا ہونے کا خاص طور سے قرینہ ہوتا ہے۔

۲۲ نتیجہ یوں تو ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ مختلف قسم کے انسدادی مانعات، خواہ وہ ارادی ہوں یا غیر ارادی، موجودہ زمانے میں ہندوستان میں کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ شرح ولادت، صاف طور پر بتلاتی ہے کہ ان سب مانعات کا متحدہ اثر بہت ہی حقیر ہے۔ ان میں سے بعض، مثلاً طفل کشی اور اسقاط حمل، بتدریج معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ رہے دوسرے مانعات، مثلاً بچپن کی شادی، لڑکیوں کو اونچے درجوں میں بیاہنے کا رواج اور بیواؤں کی شادی کی ممانعت، تو اصلاح معاشرت اور تہذیب و شائستگی کی توسیع و ترقی کی بدولت ان کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔ پس ظاہر ہے کہ انسدادی مانعات کا ارتفاع یا ان کی کمزوری، تاوقتیکہ نئے مانعات سے متوازن نہ ہو، اس میلان کو تقویت پہنچائے گی کہ آبادی ذرائع معاش پر بار بن جائے۔

ایجابی مانعات اور انسدادی مانعات کے درمیان نسبت معکوس پائی جاتی ہے؛ چنانچہ آبادی کو ذرائع معاش کے مساوی و مطابق رکھنے کے عاقلانہ طریقوں کی عدم موجودگی میں، تکلیف دہ طریقوں پر عملدرآمد کرنا پڑے گا۔ اس میں بہ مشکل کوئی کلام ہو سکتا ہے کہ ہندوستان بے روک ولادتوں کا جرمانہ ادا کر رہا ہے اور اٹل قانون قدرت کو بے مہری کے ساتھ اس گتھی کو سلجھانے کا موقع دے رہا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کیا اثرات ہیں بلکہ یہ کہ موجودہ آبادی میں مزید اضافے کو روکنے میں ان کے کیا اثرات ہیں۔

باب ۳

"نتیجہ یہ کہ لاکھوں انسان تھکی ماندی زمین سے اپنا شکم پر نہیں کر سکتے اور خود نذر زمین ہو کر اس کے شکم کو پُر کر دیتے ہیں۔" اس سے انکار نہیں کہ اعلیٰ شرح اموات کا باعث ایک حد تک صحت و صفائی عامہ کا ناکافی انتظام اور تندرستی کے قواعد سے عام
72 ناواقفیت ہے، لیکن ان کا سبب بھی آخر میں چل کر افلاس ہی قرار پاتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ انگریز قوم مسلمہ طور پر دنیا کی متمول ترین قوموں میں سے ایک ہے، لیکن اس کے باوجود دس فی صد انگریز خوش حالی سے محروم بلکہ مفلس پیدا ہوتے ہیں، اور نہایت متمول اشخاص کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مفلسوں کا فی صد تناسب بدرجہا زیادہ ہے۔ چنانچہ ہمارے خیال میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اہل ہند میں سے ۹۰ فی صد قریب قریب ہمیشہ فاقوں بسر کرتے ہیں۔ بہرحال اطفال اور بالغوں میں کثرت اموات کا بڑا سبب بلاشبہ یہی انتہائی افلاس ہے۔ بچوں کی بڑی تعداد محض اس وجہ سے مر جاتی ہے کہ ان کو مناسب غذا کافی مقدار میں نہیں ملتی۔ رہے بالغ تو مسلسل طور پر کم اور گھٹیا قسم کی غذا اور اس کے نتیجے کے طور پر کم طاقتی انھیں امراض کا بہت جلد شکار بنا دیتی ہے۔ چنانچہ انفلوئنزا کی وبا (۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء) کے زمانے میں نہایت کثرت سے اموات واقع ہوئیں اور ان کا باعث ہندوستانی آبادی کی ادنیٰ قوت مقاومت تھی جو بجائے خود افلاس کا نتیجہ تھی۔

اگر نئی ہستیاں عالم وجود میں بے روک آتی رہیں، اور موجودہ ممکنہ ذرائع ان کے قیام و سربراہی کی اجازت نہ دیں تو یہ آبادی کی افراط کی شہادت و علامت ہے؛ چنانچہ ہندوستان میں عام طور پر یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ شرح اموات کی زیادتی جو زیادہ تر افلاس سے منسوب کی جا سکتی ہے کثرت آبادی کا قطعی ثبوت خیال کی جا سکتی ہے۔ موثر قسم کے انسدادی مانعات کی عدم موجودگی اور ساتھ ہی تولید انسانی کی عظیم قوت کی موجودگی اس امر کو بہت اغلب بلکہ یقینی بنا دیتی ہے کہ ہندوستان میں مفرط آبادی، نہ صرف حالت بلکہ میلان کی حیثیت سے بھی، پائی جاتی ہے۔ موجودہ حالات نیز مستقبل قریب میں ترقی کے امکانات کا لحاظ کرتے ہوئے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اہل ہند کی شرح ولادت کمتر ہو تو ہندوستان

باب ۳ ان کی بود و باش کے لیے موجودہ حالت سے زیادہ بہتر ملک ہو سکتا ہے۔[۱]

۲۳۔ مفرط آبادی اور قومی آمدنی

مفرط آبادی کے مسئلے کی پیچیدگیوں کے منجملہ ایک یہ ہے کہ اس ملک میں قومی آمدنی کے متعلق وقتاً فوقتاً مرتب کئے ہوئے اندازوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی کس آمدنی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آبادی بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی قومی آمدنی میں بھی کم از کم اسی مقررہ شرح سے اضافہ ہو رہا ہے تو پھر "آبادی" کو "مفرط" کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ اس مشکل کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس ملک میں آمدنی کے بارے میں
73 قائم کئے ہوئے متعدد اندازوں کی صحت پر دلیرانہ اعتراض کیا جائے۔[۲] سچ پوچھو تو ہمارے اندازے، صحیح مواد کی عدم موجودگی کے باعث کم و بیش قیاسی ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ پر تو یہ سوءظن نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی حکمرانی کے خلاف اس کو کوئی شکوہ یا تعصب ہے، تاہم زیادہ سے زیادہ تعریفی الفاظ جو ان کے قلم سے نکلتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل ہند کی حالت میں صرف بعض اعتبارات سے اصلاح ہوئی ہے اور اکثر اعتبارات سے حالت بد سے بدتر

---

[۱] اس عام نتیجے کی صحت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم وسعت اور اس کے اقوام، قدرتی ذرائع اور آب و ہوا کے لاتناہی انواع و اقسام پر نظر کرتے ہوئے کثرت آبادی کے پیچیدہ مسئلے کی تحقیق اگر چھوٹے پیمانے پر ضلع واری یا صوبہ واری کی جائے تو اس سے مسئلے پر زیادہ بہتر روشنی پڑے گی۔ علاوہ ازیں ذات پات کے طریق اور ہندوستانی معاشرے کی دوسری خصوصیات کی وجہ سے غیر مساوی جماعتیں غیر معمولی طور پر کثیر تعداد میں موجود ہیں، چنانچہ ہر جداگانہ جماعت، گروہ، ذات یا پیشے کو فرداً فرداً جانچنے پر کثرت آبادی کی نوعیت و وسعت کا اس سے زیادہ قابل قدر اور مفصل حال معلوم ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک ہمہ گیر اور عام مساحت سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں تو صرف موخر الذکر طریقہ اختیار کرنا ممکن ہوا۔

[۲] دیکھو باب ۴ جلد دوم۔

باب ۴

ہوگئی ہے؛ گویا بحیثیت مجموعی شہنشاہ اکبر کے زمانے کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں کچھ ہی بہتر حالات پائے جاتے ہیں[1]۔ جیسا کہ مورلینڈ نے کہا ہے کہ "کم و کیف کے لحاظ سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی ہے"[2]۔ لوگوں کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی اس قدر بدیہی واقعہ نہیں ہے کہ کوئی شخص سطحی اور سرسری طور پر اس کا اندازہ کر سکے۔ وہ شخص بھی جو عجلت میں نہ ہو اور وقت نکال کر نظر غائر سے حالات کا مطالعہ کرے اصلاح و ترقی کے بجائے عام طور پر انحطاط ہی پاتا ہے۔ اس کا معمولی سرکاری جواب یہ ہے کہ "اس امر کا الزام کہ اہل ہند افلاس میں ثابت قدمی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں خود ان ہی کے سر ہے، اس لیے کہ وہ اپنی آیندہ بہبود کا خیال کئے بغیر اپنی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ کئے جا رہے ہیں"۔ پھر بھی یہ جواب اس دعوے کو کہ گزشتہ پچاس سال میں لوگوں کی حالت بہتر نہیں ہوئی ہے، باطل نہیں کرتا بلکہ محض اس کی تاویل کرتا ہے۔

دوسری صورت مشکل کو حل کرنے کی یہ ہے کہ معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال کر لیا جائے کہ اگر آبادی قلیل ہوتی اور اگر متعدد ایجابی مانعات کے عمل کے بجائے ولادتوں کی ارادی روک کے ذریعے سے آبادی کی کثرت پر بندش قایم کی جاتی تو اس سے زیادہ اصلاح و ترقی رونما ہوتی۔ چنانچہ ہم یہ خیال کرنے کی جانب مائل ہیں کہ یہ نقطۂ خیال غالباً اصلی واقعات و حالات کے مطابق ہے۔

۴۲۔ ایجابی و انسدادی مانعات

ہمیں ناظرین کو یہاں یہ خیال قائم کرنے کے خلاف متنبہ کر دینا چاہیئے کہ اس امر کا نفس معاملہ پر اثر نہیں پڑتا کہ آبادی میں ایجابی مانع کے ذریعے سے کمی ہو یا انسدادی مانع کے ذریعے سے۔ اعلیٰ ترین معیار راحت و آرام کے حاصل کرنے کے لیے جس چیز کی

---

[1] دیکھو ونسنٹ اسمتھ کی کتاب موسوم بہ "اکبر مغل اعظم" صفحہ ۳۹۴ تا ۴۰۱ Akber the Great Mogul

[2] دیکھو ڈبلیو ایچ مورلینڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان بزمانہ وفات اکبر" صفحہ ۲۷۰۔ India at the Death of Akber

باب ۳

ضرورت ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ آبادی کو روک کر اس کو ایک مناسب و متوازن حد پر رکھا جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ پیدا آور قوت کو اسی معیار پر برقرار رکھا جائے جو متوازن و معیاری تعداد نفوس کے لیے مناسب ہو۔ قدرت کے کام کرنے کے طریقے عام طور پر بھدے ہوتے ہیں؛ اور ان مصائب عظیم کے قطع نظر کرتے ہوئے جو ان طریقوں کے باعث نازل ہوتے ہیں، یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ گو کوئی بڑی قدرتی آفت، روزافزوں آبادی کے انتہائی اضافے کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ باقی ماندہ اشخاص کو مضمحل و مخرب اخلاق حالت میں چھوڑے۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر رونما ہونے والی معاشرتی و معاشی افراتفری و بدنظمی اس قدر شدید ہو کہ جو معاشرہ اس آزمائش میں مبتلا ہوا اس کا دورِ ثانی قطعی طور پر دورِ اول سے بدتر ہو، اور اس طرح ممکن ہے کہ تعداد نفوس کی کمی کے ساتھ ساتھ افلاس 74
و خواری بھی بڑھ جائے۔ اسی وجہ سے معاشی نقطۂ نظر سے، کثرت آبادی کی خرابیوں کا علاج ہونے کی حیثیت سے ایجابی مانعات پر انسدادی مانعات کو ترجیح دینی چاہئے؛ چنانچہ واقعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایجابی مانعات اس مرض کا شاذ ہی علاج کر سکتے ہیں؛ بلکہ ممکن ہے کہ وہ مرض میں اور شدت پیدا کر دیں۔

یہ واقعہ کہ ہندوستان کی آبادی مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت دھیمی رفتار سے بڑھ رہی ہے[1] بعض اوقات اس نظرئے کی کاٹ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ ملک میں اس کی گنجائش سے زیادہ انسان آباد ہیں[2]۔

---

[1] دیکھو فصل (۱۱) جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔

[2] لیکن ناظم مردم شماری بابتہ سنہ ۱۹۳۱ء کی طرح موجودہ زمانے میں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ آبادی کے اضافے کی رفتار سست ہونے کی بجائے تیز ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے مابین اضافے کے اصلی اعداد کچھ کم ۳۴ ملین ہیں۔ یہ اضافہ، فرانس، یا اٹلی کی موجودہ مجموعی آبادی کے قریب قریب مساوی ہے؛ اور پولینڈ اور ہسپانیہ جیسے اہم دول کی آبادی کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اس وقت ہندوستان کی آبادی قریب ترین زمانے کے اندازے کے مطابق چین کی

لیکن حقیقی طور پر کم اضافہ اس بات کو لازمی طور پر ثابت نہیں کرتا کہ آبادی مفرط نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی ثابت کرنا چاہئے کہ دولت میں کم از کم اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہے اور یہ کہ اگر آبادی کے اضافے کی شرح اس سے کم ہوتی تو فی کس آمدنی اس سے کم ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ہمیں پھر اس کا اعادہ کرنا چاہئے کہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا سریع اضافۂ آبادی پر انسدادی مانعات کے ذریعے سے روک قایم ہو رہی ہے یا ایجابی مانعات کے ذریعے سے۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تک ہندوستان میں صرف موخر الذکر ہی کا کامل دور دورہ رہا ہے؛ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس کی وجہ سے آبادی کا سست رفتار اضافہ یا قطعی کمی، باشندوں کی معاشی حالت کے انحطاط کے بالکل ہم آہنگ و مطابق ہو جاتی ہے۔

۲۵۔ آبادی کے اضافے کی ارادی روک کے سوا دوسرے طریقے

اگر ہم یہ خیال ظاہر کریں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ملک کے ذرایع مناسب طریقے پر ترقی پانے کی صورت میں موجودہ تعداد سے زیادہ تعداد ملک میں نہیں رہ سکتی۔ یہ استدلال ترغیب دہ طریق پر کیا جا سکتا ہے کہ جہاں مغرب معاشی ترقیوں کے لحاظ سے بام عروج پر پہنچ چکا ہے وہاں ہندوستان ابھی تک پہلے ہی زینے پر ہے۔ یہاں صنعتی ترقی بمشکل شروع ہوئی ہے، اور صنعتوں میں تکثیر حاصل کا مقام ابھی اتنی دور ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں غیر معین مدت درکار ہوگی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریب قریب یہی بات نقل و حمل، جہازرانی وغیرہ کے بارے میں صادق آتی ہے۔ علیٰ ہذا زراعت میں بھی عمیق ترقی اور آب پاشی کے 75
امکانات سے استفادہ کی ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ علاوہ ازیں اگر پیدایش دولت میں

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ: آبادی پر بھی سبقت لے جا چکی ہے؛ یہاں تک کہ ہندوستان، باشندوں کی تعداد کے لحاظ سے، دنیا کے تمام ممالک کی فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ اگر موجودہ شرح اضافہ مان لی جائے تو بیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کی آبادی ۔ ۷ کروڑ ہو جائے گی۔

اضافہ نہ بھی کیا جائے تو بھی دولت کی بہتر تقسیم، ایک بڑی آبادی کو خوش حالی کے اسی اعلیٰ معیار پر برقرار رہنے کے قابل بنا سکتی ہے۔ خود آبادی کو بھی زیادہ مساوی طریقے پر تقسیم کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ گنجان آباد علاقوں کی زاید آبادی کو ان علاقوں میں منتقل کر دیا جائے جہاں مناسب ترقی کے لیے آبادی بہت قلیل ہے۔ سب سے آخر میں یہ کہ آبادی کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے ترک وطن خارجی کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۲۶۔ ان اصلاحی تدابیر کی راہ میں رکاوٹیں۔

تاہم ان سمتوں میں سے کسی سمت میں فوری اصلاح کے امکانات کو حد سے زیادہ بڑھا کر بیان نہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر عاجلانہ صنعتی ترقی کی انتہائی کوشش بھی کی گئی تب بھی ترقی کی رفتار حسب دلخواہ تیز نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان، صنعتی دوڑ میں بہت دیر سے شریک ہوا، اور اس کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ جب تک یہ رکاوٹیں دور نہ ہوں گی اس کی ترقی کی رفتار مغربی ممالک کے مقابلے میں لازمی طور پر سست رہے گی۔ ہندوستان میں طاقتور اغراض قائمہ موجود ہیں جو موجودہ حالت سے فایدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ ہر قسم کے تغیر کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی موجودہ معاشی پسماندگی کا باعث بڑی حد تک حکومت کی غفلت اور بے پروائی ہے۔ حکومت پر اس بارے میں کس حد تک الزام عاید کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے ہمیں براہ راست کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن اگر استدلال کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ حکومت کی بے پروائی اور بعض صورتوں میں مبینہ مخالفانہ روش ہندوستانی صنعتوں کی صبر آزما طریقے پر سست ترقی کی بڑی حد تک توجیہ کرتی ہے تو، جب تک یہ روش موجود ہے ہم کو دوسرے عناصر کے منجملہ اس عنصر سے بھی نبٹنا پڑے گا۔ اگر حکومت کی بے پروائی و غفلت کے عنصر کو، حکومت اختیاری جلد قایم کر کے، خارج کر دیا جائے تو بھی مالی رکاوٹیں اور دیگر مزاحمتوں کی وجہ سے صنعتی نشوونما لازمی طور پر سست ہوگی۔

باب ۳

یہ امر کہ سنگین رکاوٹیں موجود ہیں، اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ گو ممکن ہے کہ ان رکاوٹوں کا لحاظ کرنے کے بعد رجائیت کی گنجائش پھر بھی باقی رہے، لیکن یہ رجائیت اس رجائیت کے مقابلے میں بہت زیادہ معتدل ہو گی جو بعض لوگ قایم کرتے اور یہ ثابت کرنے کے خواہشمند ہیں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اگر ہم موجودہ رکاوٹوں سے چشم پوشی کر لیں اور یہ بھی مان لیں کہ سریع صنعتی ترقی یقینی ہے، تو بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمیوں کی جتنی تعداد اس وقت دستیاب ہو سکتی ہے اس سے زیادہ صنعتی ترقی کے لیے درکار ہو۔ ایسے مقررہ حالات کی موجودگی میں جن کے تحت اضافۂ آبادی پر کسی قسم کی ارادی روک نہ ہو، یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آبادی کی رسد، اس کی تمام ممکنہ طلب پر سبقت لے جائے گی۔ اضافۂ آبادی پر قدرت کے بے رحمانہ مانعات صرف اس وقت عمل نہ کریں گے جب کہ سب کی سب زاید آبادی بڑھنے والے معاشی ذرایع میں فوراً جذب ہوتی
76 جائے۔ لیکن ایسا واقعہ کبھی کبھی اور وہ بھی صرف ایک محدود زمانے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے[1]۔ تاہم ہندوستان نہ تو نو آباد ملک ہے اور نہ اس کے مواقع اور سہولتوں کا مقابلہ، خواہ ان پر کتنے ہی رجائی طریقے سے نظر ڈالی جائے، صنعتی انقلاب سے پیشتر کے انگلستان کے مواقع سے کیا جا سکتا ہے۔ زائد آبادی کو صنعتی کاروبار میں

[1] مندرجۂ ذیل اقتباس میں معاملے کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے:-

"میرا خیال یہ ہے کہ اصل کے بہت بڑے ذخائر جن کی بنا پر سائنٹیفک ایجادیں عمل میں لائی جا سکتی ہیں، بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے والی صنعتوں میں تکثیر پذیر ماحصل پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم عنصر رہے ہیں۔ لیکن اگر آدمیوں کی بڑی تعداد بھی ضروری ثابت ہو تو، ماہر اعداد و شمار کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آیا داخلی اور اکثر خارجی کفایات انفرادی کارخانوں، بازاروں یا شہروں میں آدمیوں کی کثیر تعداد کو کام پر لگانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ اگر یہی تکثیر حاصل کی اساسی شرط ہو تو، زرعی ماحصل کی تقلیل پذیری کو کل صنعت میں مزدوروں کی جماعت کا اوسط اضافہ زائل نہیں کرے گا بلکہ ہر صنعتی کارخانے، انجمن یا حلقے میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کا اوسط اضافہ زائل کرے گا۔ گویا اضافۂ آبادی کے معنی فی نفسہٖ کسی حال صنعت میں تکثیر حاصل کے نہ ہوں گے

باب۳

لگانا محض اس وقت ایک مستقل علاج ہو سکتا ہے جب کہ آبادی کی زیادتی نہ صرف قابل پیدائش غذا تک، بلکہ صنعتی محنت کی طلب کے نقطۂ سیری تک بھی محدود رہے۔

۲۷۔ محنت کی قلت، آبادی کی افراط کے خلاف دلیل کے طور پر۔

کثرت آبادی کے خلاف جو معمولی دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک محنت کی مبینہ قلت پر مبنی ہے جو زراعت اور صنعت دونوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ زراعت میں محنت کی قلت کا خیال اس واقعہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی طلب سال کے کچھ حصے میں اور وہ بھی قلیل مدت کے لیے مثلاً تخم بونے اور فصل کاٹنے کے زمانے میں خاص طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ سال کے باقی حصے میں وہ مجبوراً بے کاری کی حالت میں رہتی ہے۔ یوں تو یہ بات ہمیشہ سے محسوس کی جاتی رہی ہے کہ زرعی گرما گرمی کے موسم میں اضافی قلت رونما ہوتی ہے لیکن کچھ سال ادھر سے اس احساس کا اظہار زبان سے بہت زیادہ کیا جا رہا ہے، شہروں کے قرب وجوار کے زرعی رقبوں کا محنت کی روز افزوں قلت کی شکایت کرنا غالباً اسی وجہ سے حق بجانب ہے کہ شہروں میں دیہات سے جو محنت کھنچ کر جاتی ہے اس کے ایک جزو سے یہ رقبے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں یا یہ کہ یہ سب کی سب اس زمانے میں دستیاب نہیں ہوتی جب کہ زرعی کاروبار کے لیے اس کی ضرورت اور مانگ ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات ان دیہاتی رقبوں پر صادق نہیں آتی جو شہروں سے دور واقع ہیں۔ زرعی محنت کی عام قلت کے خیال کو اس عام طور پر مسلمہ نظریے کے مطابق وہ ہم آہنگ بنانا مشکل ہے کہ زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور یہ کہ جتنے اشخاص کو وہ باآسایش پرورش کر سکتی ہے اس سے زیادہ تعداد اس پر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دیکھو بی، کیس فلورنس کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۵۔

باب۳
۶۶

سکونت پذیر ہے[۱]۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے غور و خوض کے بعد اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "غالباً بجز آسام کے کسی صوبے میں بھی محنت کی کسی بڑی اور عام قلت کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی"[۲]۔ صنعتوں میں محنت کی قلت کی حد تک بھی بیان میں اصلیت اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ نہیں ہے کہ محنت دستیاب نہیں ہوتی بلکہ یہ کہ شہروں میں رہنے سہنے کی مشکلات اس قدر زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی صحت و صفائی کے عام حالات اس قدر غیر اطمینان بخش ہیں کہ وہ موثر موانع بن جاتے ہیں اور محنت کی امکانی رسد کے بڑے حصے کے حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگوں کی جہالت اور قدامت پرستی کو دور کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے، چنانچہ ان میں سے اکثر زمین ہی سے وابستہ رہ کر اپنا پیٹ پالتے اور مصیبت کی زندگی بسر کرتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے شہروں میں مستقل طور پر کام حاصل کر کے اپنی حالت کی اصلاح کرنے کے معقول مواقع موجود ہیں۔ علاوہ ازیں محنت کی طلب بڑی حد تک با مہارت محنت کے لیے ہے۔ لہٰذا علاج بظاہر اس بات میں ایک حد تک مضمر معلوم ہوتا ہے کہ جدید صنعتوں کے لیے مزدور کو تربیت دینے کی غرض سے ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ سب سے آخر میں یہ کہ، طلب کے معنی ہمیشہ کسی قیمت پر شئے کو طلب کرنے کے ہیں اور یہ

---

[۱] "اصلی وقت یہ ہے کہ زمین کے کسی مقررہ رقبے پر نفع بخش طریقوں سے کاشت کرنے کی صورت میں جتنے آدمی کام کر سکتے ہیں ان کی تعداد محدود ہو گی۔ گو یہ ممکن ہے کہ غذائی پیداوار اس تعداد سے بہت زیادہ کے لیے کافی ہو، لیکن آبادی میں بہت بڑی زیادتی ہو تو اس کی وجہ سے یا تو لازمی طور پر فرودہ رقبوں کی انتہائی ذیلی تقسیم رونما ہو گی اور اس طرح کھیتوں کے غیر نفع بخش اور غیر معاشی ہونے کی بنا پر پیداوار میں کمی ہو جائے گی یا بصورت دیگر آبادی بے کار و بے روزگار ہو جائے گی جو نہ تو زراعت میں مصروف ہو گی اور نہ پیدا کنندوں سے اپنی ضرورت کی غذا حاصل کرنے کے لیے اپنے پاس کوئی چیز رکھتی ہو گی"۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۳۱

[۲] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۶-۵)۔

ممکن ہے کہ مزدور کو اس کی شے یعنی محنت کے لیے جو قیمت پیش کی جاتی ہے وہ کافی کشش نہ رکھتی ہو۔ حال حال تک یہ صورت تھی کہ اجرت میں تناسب اضافہ ہوئے بغیر اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یوں تو یہ میلان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ اجرت دوڑ میں قیمت کا ساتھ نہیں دیتی، لیکن ہندوستان میں رسم و رواج اس میلان کو مزید تقویت پہنچاتا ہے، چنانچہ اب بھی رسم و رواج کی قوت کو خاص کر دیہات میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیہات میں رواجی اجرت، قیمتوں کے تغیرات کا ساتھ بہت رک رک کر دیتی ہے؛ اور شہروں میں بھی اعلیٰ مصارف زندگی اور بیش خرچ بود و باش کا لحاظ کرتے ہوئے اجرت کی سطح کافی بلند نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زراعت و صنعت دونوں میں محنت کی رسد و طلب کے باہمی تعلق میں بڑی حد تک بدنظمی پائی جاتی ہے، لیکن یہ بات بہت زیادہ مشتبہ ہے کہ آیا اس کا علاج آبادی کا سریع اضافہ ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ مزدوروں کی تعداد کی زیادتی ہی ان کو اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ اجرت کے ایسے شرائط کے تحت کام قبول کر لیں جو ان کو ناگوار ہیں اور جن کو وہ بحیثیت مجموعی سردست مسترد کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ صورت حال آجر کے لیے مفید ہو سکتی ہے، لیکن مزدور کا اس میں سراسر نقصان ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کے کسی محدود و مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچے، لیکن قوم بحیثیت مجموعی گھاٹے میں رہے گی۔

۲۸۔ زرعی ترقی

گو زراعت بہت بڑے امکانات رکھتی ہے، لیکن یہ غیر محدود نہیں ہیں، اور نہ ان سے کامل استفادہ کرنا آسان ہے۔[1] غیر ترقی یافتہ خطے اب بھی موجود ہیں جو ہل چلائے جانے کے 78

[1] "ہندوستان بہت بڑی حد تک ایک زرعی ملک ہے جس میں آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۹۵ اشخاص فی مربع میل ہے۔ براعظم یورپ میں جو صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہے آبادی کی گنجانی کا اوسط ۱۲۷ نفوس فی مربع میل ہے اور ریاستہائے متحدہ امریکا میں صرف ۴۱ ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان بحساب فی مربع میل زیادہ بڑی آبادی کا کفیل ہے۔" دیکھو پی، کے وٹل کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۱۰۔

باب ۳

منتظر ہیں۔ لیکن زرخیز زمینیں بہت بڑی حد تک قبضے میں آچکی ہیں اور جو زمینیں اب تک قبضے میں نہیں آئی ہیں وہ مقابلتہً کم زرخیز ہیں۔ بہر صورت ان پر معمولی طور پر سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے جو اوسط درجے کے کسان کی دسترس سے باہر ہے۔ کاشت عمیق کے امکانات کو تقسیم و انتشار اراضی، ہندوستانی کسان کی قرضداری اور سرمائے کے ذرایع کا فقدان جیسی رکاوٹیں گھٹا دیتی ہیں۔ لیکن ان سب خرابیوں کو فوراً دور نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں زراعت میں جدید ترین طریقوں کو صرف رفتہ رفتہ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جدید طریقوں کو استعمال کرنے کے بعد بھی یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ قانون تقلیل حاصل کا جلدی یا دیر سے عملدرآمد ہوگا، اس لیے کہ اس وقت تک ہمارا تجربہ پورے وثوق کے ساتھ یہ توقع کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ طریق کاشت میں عہد آفرین اصلاح و ترقی یکے بعد دیگرے مسلسل رونما ہوگی اور وہ تقلیل حاصل کے رجحان کو ایک غیر معین مدت تک روک رکھے گی[۱]۔ زراعت کی ترقی آب پاشی سے وابستہ ہے اور چونکہ ملک کے بڑے بڑے خطے آب پاشی کے لیے ناقابل حل مشکلات پیش کرتے ہیں، اسی لیے ان خطوں کو کم یا زیادہ بارش پر قناعت کے ساتھ انحصار کرنا پڑتا ہے، اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مستقبل قریب میں ان کی زرعی حالت میں کوئی نمایاں اصلاح و ترقی ہوگی۔

[۱] گو سابق میں قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد کے متعلق عام اتفاق تھا؛ لیکن بعد میں چل کر بعض معاشیین نے یہ پختہ خیال قائم کر لیا کہ اگر سائنس موجودہ زمانے میں تقلیل حاصل کی دقتوں کو حل نہیں کرے تو مستقبل قریب میں ایسا کرنے کے قابل ہو جائے گی، یا دوسرے الفاظ میں کیمیا دان کوئی ایسا عمل ایجاد کرے گا جس کے ذریعے سے زمین مجبور ہو جائے گی کہ قلیل سرمایہ لگانے پر یکساں حاصل پیدا کرے۔ اگر ایسا کوئی عمل کبھی کامیاب ثابت ہو تو اس صورت میں بیشک قانون تقلیل حاصل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن گزشتہ ساٹھ سال میں اختلافات کی کثرت کے باوجود اس کی کوئی علامت نہیں پائی گئی کہ کاشت کے طریقوں میں کوئی انقلاب رونما ہوا۔" دیکھو جے، اے، وین کی کتاب موسوم بہ "اصول معاشیات زرعی" صفحہ ۳۷، جس کا حوالہ ہیملٹن نے دیا ہے۔

۲۹۔ دولت کی بہتر تقسیم

اس میں شک نہیں کہ دولت کی زیادہ معقول طریق پر تقسیم ایک حد تک سود مند ہوگی۔ لیکن دولت کی زیادہ معقول تقسیم اس کے ذرائع کو زائل کئے بغیر کس طرح عمل میں لائی جائے؟ یہ ان مشکل ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جو جدید تہذیب یافتہ قوموں کے لیے حل طلب ہے، اور ابھی تک اس کے اطمینان بخش طریقے پر حل ہونے کی توقع نہیں دکھائی دیتی۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں سب سے بڑی کمی جو محسوس کی جا رہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دولت کی زیادہ مساوی تقسیم کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہاں انتہائی طور پر بڑی آمدنیاں بہت کم لوگوں کو مل رہی ہیں؛ بلکہ اس وقت اس سے زیادہ اشد ضروری یہ ہے کہ دولت کی مجموعی مقدار میں اور فی کس پیدائش دولت میں اضافہ ہو۔

۳۰۔ آبادی کو ایک صوبے سے دوسرے میں منتقل کر کے بار کس حد تک ہلکا کیا جا سکتا ہے؟

جہاں تک مختلف صوبوں میں آبادی کی زیادہ مساویانہ تقسیم کے امکانات کا تعلق ہے وہاں تک، اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ موجودہ زمانے کے کم آبادی رکھنے والے خطوں کے متعلق مبالغہ آمیز اندازے قایم کئے جاتے ہیں کہ ان میں زیادہ آبادی کی کھپت ہو سکتی ہے، آبادی کو گنجان آباد علاقوں سے کم آباد علاقوں میں منتقل کرنے کی دقت اتنی 79 زیادہ ہے کہ اس کو معمولی سمجھ کر با آسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زبان، خیالات، طرز بود و باش اور آب و ہوا، مختلف صوبوں میں اس قدر مختلف ہے کہ کسی بڑی تعداد میں آبادی کی نقل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وطن، گھر بار اور ماحول کی فطری محبت کے علاوہ جہالت، قدامت پرستی اور پست ہمتی بھی باہر نکلنے سے باز رکھتی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ برما اور آسام میں توسیع کی ابھی خاصی گنجایش ہے تو بھی یہ صوبے زاید آبادی کے صرف ایک قلیل جزو کو جذب کر سکتے ہیں۔ زاید آبادی زیادہ تر اس خطۂ زمین میں

---

[1] دیکھو آیندہ صفحات میں فصل (۳۷) توطن خارجی کے بارے میں۔

باب ۳

پائی جاتی ہے جو احاطۂ مدراس سے شروع ہو کر مشرق اور شمال میں بنگال، بہار اور صوبۂ متحدہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے بار کو ہلکا کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔[۱]

۳۱۔ توطن خارجی کے ذریعے سے کس حد تک بار ہلکا کیا جا سکتا ہے

یہ توقع کرنا کہ غیر ممالک میں آبادی کو منتقل کر کے آبادی کے دباؤ کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے، گویا ہندوستانیوں کے توطن خارجی کے مسئلے کی بابتہ برطانوی نوآبادیات کی پالسی اور قومی خود کفالت جیسے زمانۂ حال کے میلانات و تحریکات کی نسبت ناقابل معافی ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی مزدوروں نے نوآبادیات میں نئی قدر و قیمت پیدا کر دی ہے اور سلطنت برطانیہ کے سب علاقوں کو ایک نفع بخش اثاثہ بنا دیا ہے، لیکن اس کے باوجود آج کل ہندوستانیوں کا نوآبادیات میں آنا بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نوآبادیات کی یہ حالت و روش اور ہندوستان کی سیاسی بے بسی، صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی معاشی نجات کا سامان خود اپنے ہی ملک کے اندر کرنا چاہئیے۔

۳۲۔ آبادی اور غذا کی رسد

ہندوستان کی مفرط آبادی کے مسئلے کے متعلق جملہ سوالات میں ملک میں غذا کی رسد کا سوال عام طور پر بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر دنیا کو بحیثیت مجموعی لیا جائے تو، غذا اور آبادی میں توازن ہونا ضروری ہے، لیکن کسی خاص ملک کے لیے ایسا توازن ضروری نہیں ہے۔ مثلاً انگلستان کو جتنی غذا کی ضرورت ہے وہ خود تیار نہیں کرتا بلکہ اس کو زیادہ مفید خیال کرتا ہے کہ دوسرے ممالک سے غذا طلب کرے اور اس کے معاوضے و مبادلے میں اپنی اعلیٰ درجے کی ماہر آبادی کے تیار کردہ مصنوعات انھیں بھیجے۔ لیکن ہندوستان، اشیائے خوردنی کی رسد کے لیے غیر ممالک کا محتاج نہیں ہے، اور ملک میں جو اشیائے خوردنی

[۱] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۵۰۶)

باب ۳

پیدا ہوتی ہیں ان کی مقدار کا تغیر بدیہی طور سے اس امر پر اثر انداز ہوتا ہے کہ ذرایع معاش پر آبادی کا کس حد تک دباؤ پڑ رہا ہے۔ اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ غذا کی رسد کم از کم اضافۂ آبادی کی نسبت سے بڑھ رہی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ آبادی کی کثرت کم از کم انتہائی صورت میں نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں 80 اعدادی شہادت متناقض نوعیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کے، ال، دت نے اپنی "رپورٹ تحقیقات قیمت"[1] میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۹۴ء تا ۱۹۱۲ء میں زیر کاشت رقبہ اور خاص کر وہ خطہ جس پر اشیائے خوردنی کاشت ہوتی تھیں آبادی کے مقابلے میں پیچھے رہا۔ حکومت ہند نے اس نتیجے کو اس بنا پر تسلیم نہیں کیا کہ دت کا پیش کیا ہوا مواد زیادہ تر قیاسی اور غیر یقینی تھا۔ حکومت کا یہ استدلال تھا کہ آب پاشی کی توسیع کی بدولت زیر کاشت رقبہ اور خوردنی اشیا کی رسد دونوں آبادی کے قدم بہ قدم گامزن تھے۔ ڈوبے ۱۹۲۰ء میں استدلال کرتے ہوئے بعض اعداد پیش کرتا ہے جس سے اس کا مطلب یہ بات ثابت کرنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ۹ تا ۱۰ ملین ٹن غذا کا گھاٹا ہے، یا اگر برآمد کی سالانہ مقدار کو شامل کر لیا جائے تو یہ گھاٹا تقریباً ۵ ملین ٹن رہ جاتا ہے۔ اس سے گو رسد کی موجودہ قلت اور اس لحاظ سے کثرت آبادی کا حال تو معلوم ہوتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ سابقہ سالوں کے مقابلے میں صورت حال بہتر ہے یا بدتر۔ دوسری طرف، یہ شکایت کہ زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے جس کو اکثر لوگ حق بجانب سمجھتے ہیں یہ معنیٰ پیدا کرتی ہے کہ زرعی زمین کی پیداوار، اضافۂ آبادی کے تناسب سے کم بڑھ رہی ہے۔

ڈاکٹر پی، جے، تامس[2] اس مسئلے پر "آبادی اور پیدائش دولت" کے باہمی تعلق کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہیں۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ۱۹۲۰-۲۱ء تا ۱۹۲۱-۲۲ء اور ۱۹۳۰-۳۱ء تا ۱۹۳۱-۳۲ء کی دو سالہ میعادوں میں جہاں آبادی ۱۰٫۴

---

[1] Prices Inquiry Report -

[2] - دیکھو انڈین جرنل آف اکنامکس "کانفرنس نمبر" (اپریل ۱۹۳۵ء) صفحہ ۳۷، تا ۴۷۔

فی صد بڑھی، وہیں زرعی پیداوار میں قریب قریب ۱۶ فی صد اور صنعتی پیداوار میں ۱۵ فی صد اضافہ ہوا۔ اس سے زیادہ طویل مدت یعنی سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۳۰ء کی تیس سال کی مدت کو لیتے ہوئے بھی وہ قریب قریب اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اس تیس سالہ مدت میں آبادی میں ۱۹ فی صد اضافہ ہوا، لیکن اگر ابتدائی پانچ سالوں (سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۵ء) کا مقابلہ آخری پانچ سالوں (سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۳۰ء) سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آبادی میں تو ۱۳٫۵ فی صد اضافہ ہوا، اور زرعی پیداوار ۲۹ فی صد بڑھی، اور صنعتی پیداوار کا اضافہ اس سے بہت زیادہ سریع یعنی ۱۸۹ فی صد تھا۔ غرض یہ کہ خواہ کوئی مدت بھی لی جائے، اس کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی کہ آبادی، پیداوار پر سبقت لے گئی۔ ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ ہے کہ ان کی اعدادی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیداوار، آبادی کے قدم بقدم چل رہی ہے، اور بعض شعبوں مثلاً گرنی کی صنعت اور تجارتی کاشت وغیرہ میں تو پیداوار، آبادی سے بہت زیادہ رفتار کے ساتھ بڑھی۔ یہ سب ترقی، عالمی کساد بازاری کے زمانے میں بھی برقرار رہی؛ اور یہ ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اگر عوام کی حالت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تو اس کا باعث لازمی طور پر یہ ہوگا کہ تقسیم دولت میں کچھ نہ کچھ عدم مساوات ہے۔

اس خصوص میں کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے
81 کہ ہندوستان میں پیداوار کی بابت صحیح، اور بھروسے کے قابل اعداد دستیاب نہیں ہوتے[1]۔ یہ بات خاص طور پر فصلوں کی پیداوار کے سرکاری تخمینوں پر صادق آتی ہے جو فصلوں کے پیش اندازوں پر مبنی رہیں۔ چنانچہ زرعی پیداوار کا اندازہ یا تو حقیقی مقدار سے زیادہ یا کم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تامس کے خیال میں اندازہ حقیقی مقدار سے زیادہ کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر تامس نے غذا کی رسد کا کوئی علٰحدہ اندازہ نہیں قایم کیا ہے کہ آبادی کی زیادتی کی نسبت سے

---

[1] دیکھو باب ۴، جلد دوم۔

کتنی غذا تیار ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو بیشک مانتے ہیں کہ چاول کی کاشت کی توسیع کی محدود گنجایش کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا امکان ہے کہ ہندوستان کو آیندہ درآمدہ چاول پر روزافزوں انحصار کرنا پڑے گا، لیکن وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ صنعتی پیداوار کی تدریجی ترقی سے اس کمی کی بہت بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی۔ بہرحال ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ چونکہ ڈاکٹر تامس کے اعداد کے مطابق، زرعی پیداوار آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھ رہی ہے، اور چونکہ غذائی اشیا، ہندوستان کی کل زرعی پیداوار کے بڑے حصے پر مشتمل ہیں، لہذا غذائی اشیا کی رسد میں بحیثیت مجموعی آبادی سے زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان میں مفرط آبادی اپنی سب سے بھدی اور بدیہی شکل میں نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر صاحب خود تسلیم کرتے ہیں، یہ استدلال کہ ہندوستان کی آبادی متوازن حد سے زیادہ ہے، ڈاکٹر تامس کے اعداد سے غلط ثابت نہیں ہوتا؛ بلکہ جو خیال ہمارے کل استدلال کے دوران میں ذہن نشین ہوا وہ پھر بھی قایم رہتا ہے یعنی یہ کہ اگر اضافۂ آبادی کی رفتار زیادہ دھیمی ہوتی تو لوگوں کی خوش حالی زیادہ نمایاں اور کمتر مشتبہ ہوتی۔

۳۲۔ دولت کی زیادتی ایک بالواسطہ مگر طاقت بخش مداوا ہے۔

مفرط آبادی کو میلان اور واقعے کے طور پر مان لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معاشی اصلاح و ترقی کی ساری کوششیں بے سود ہیں۔ اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا انتہائی طور پر غیر صحیح اور مضر ہے۔ ممکن ہے کہ دولت کی زیادتی جس کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ زرعی و صنعتی ترقی کے لیے زیادہ گرم جوشانہ پالیسی اختیار کرنے سے رونما ہوگی اپنے آپ کو اضافۂ آبادی کی شکل میں ظاہر کرے؛ اور اسی کا نتیجہ کسی حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معیار زندگی بلند ہو جائے۔ ایک مرتبہ معیار زندگی بلند ہو جانے کے بعد اس کو آبادی کی ارادی تحدید کے ذریعے برقرار رکھنے کا ارادہ اور صلاحیت بھی عام طور پر بڑھ جاتی ہے۔[۱] چنانچہ

[۱] شرح ولادت کی ارادی روک سے قطع نظر کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو شرح اموات کو

باب۔

مغربی ممالک میں ترقی کی رفتار ایسی ہی رہی ہے، اور ہم معقولیت کے ساتھ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس کے مماثل اسباب ہندوستان میں بھی اسی کے مماثل نتائج پیدا کریں گے۔ جس وقت لوگوں کی معاشی حالت میں قابل لحاظ ترقی ہوگی اس وقت 82
ان کو یہ محسوس ہوگا کہ تعداد نفوس کو بقول مل "عاقلانہ پیش بینی کی ارادی رہنمائی" کے تحت لانا ضروری ہے اور یہ احساس پیدا کرنے والی شے معاشی ترقی سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے مسئلۂ کثرت آبادی کا سب سے زیادہ امید افزا حل یہ ہوگا کہ عوام اور حکومت، ملک میں ہر ممکنہ سمت میں معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کثرت آبادی، افلاس کے اسباب میں سے ایک سبب ہے تو، یہ بھی مساوی طور پر صحیح ہے کہ افلاس، بے احتیاطی اور بے پروائی کی ترغیب دے کر کثرت آبادی کی خرابی میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سابق میں حکومت کی پالیسی اپنے ایجابی اور سلبی پہلوؤں میں معاشی ترقی میں مزاحم رہی ہے تو حکومت، عوام کے افلاس کے الزام سے محض اس واقعے کی طرف اشارہ کر کے بری الذمہ نہیں ہو سکتی کہ یہاں کے لوگ آبادی کی زیادتی پر ارادی طور پر روک قایم کرنے کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ لیکن حکومت اپنی کامل مدافعت صرف یہ ثابت کر کے کر سکتی ہے کہ اس کا مقصد واحد ہمیشہ سے ملک کے اغراض کی حفاظت و فلاح رہا ہے اور عوام کے افلاس کو دور کرنے میں اس نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ کم کرتی ہے کسی نہ کسی ناقابل توجیہ طریقے سے شرح ولادت کی کمی بھی پیدا کرتی ہے۔ دولت کی زیادتی اور دماغی دلچسپیوں کی کثرت کے ساتھ ساتھ "بار آوری" میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ صحت عامہ کے متعلق ترقی یافتہ تدابیر اختیار کرنا، معیار زندگی کی اصلاح و ترقی کرنا، تعلیم کی توسیع کرنا، آزادیٔ نسواں کو ترقی دینا اور عورتوں کو بیاہ اور خانہ داری کے فرائض کے علاوہ خدمت اور جد وجہد کے دوسرے میدانوں میں داخل کرنا، اصلاح کی یہ سب مدیں مناسب اور پسندیدہ ہیں، نہ صرف بجائے خود بلکہ اس لیے بھی کہ یہ آبادی کے ناواجب طور پر عاجلانہ اضافے کو روکنے کے مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھو مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) صفحہ ۴۳۔

باب ۳

اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، نیز یہ کہ اس کی پالسی شروع سے آخر تک نہ صرف دیانتدارانہ اور پُرجوش بلکہ درست اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اختیار کی ہوئی ہے۔

۳۴۔ ارادی روک کی اہمیت

اس کے ساتھ ہی اگر لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ خوش حالی کا معیار بلند رکھنے کے لیے آبادی کے ناواجب اضافے کو روکنا اور قابل فراہمی ذرایع اور آبادی کے درمیان مناسب تعلق کو برقرار رکھنا کتنا ضروری ہے تو اس سے ایک مفید اور نہایت پسندیدہ تبدیلی پیدا ہوگی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ملک ایسے عظیم الشان ذرایع کا مالک ہے جن کا ابھی تک استحصال نہیں ہوا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ان ذرایع کی موجودگی، آبادی کی زیادتی پر کوئی عاقلانہ اور دور اندیشانہ روک قایم نہ کرنے کو پوری طرح حق بجانب قرار دیتی ہے، وہ امکان کو حقیقت سے خلط ملط کرتے ہیں۔ فی الجملہ اس عام کہاوت میں کہ "آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے" صداقت موجود ہے۔ اس امر کا تعین کرنے کی غرض سے کہ کسی مقررہ وقت میں آبادی کی مناسب تعداد کیا ہونی چاہئے "موجود" یا "پیش نظر" ذرایع کو معیار قرار دینا چاہئے نہ کہ ان ذرایع میں عظیم الشان اضافہ کرنے کے بعید امکانات کو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سائنس دانوں کے خواب روزمرہ کے حقائق بن جائیں اور آفتاب اور موجوں کے مد و جزر کی غیر محدود قوت پر انسان کو پوری طرح قابو حاصل ہو جائے تو کرۂ ارض موجودہ حالت کے مقابلے میں بہت زیادہ کثیر آبادی کی کفیل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے اخلاف مسئلۂ آبادی کے بارے میں ہمارے اضطراب و ہراس کا مضحکہ اڑائیں۔ بہر حال اس طرح عمل کرنا کہ گویا یہ خواب ایک تکمیل یافتہ واقعہ ہے، بے وقوفی ہے۔ تشکی کی یہ روش کہ وہ آیندہ ترقی کے امکان ہی کو نہیں مانتا یقیناً لایق مذمت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں حد سے زیادہ خود اعتمادی سے کام لینے والے اس اصول پرست کی غلطی سے بھی بچنا چاہئے جو یہ فراموش کر دیتا ہے کہ ترقی کی راہ میں مشکلات حائل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشین

83

باب ۳

رکھنا چاہیئے کہ سب سے زیادہ سریع ترقی بھی جو ہم تصور کر سکتے ہیں، زاید آبادی کے صرف ایک قلیل جزو کو جو حسابی طور پر ممکن ہے جذب کر سکتی ہے۔ اگر انسان کی تولیدی قوت کو کارفرمائی کا پورا موقع دیا جائے تو اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مذموم قوتیں مثلاً جنگ، وبائیں، قحط وغیرہ جو "ایجابی مانعات" کی تعریف میں داخل ہیں، میدان میں آجائیں گی۔ معاشی ترقی کو کثرت آبادی کی خرابیوں کے حق میں ایک عارضی مسکّن خیال کرنا چاہیئے نہ کہ مستقل علاج، اور معاشی ترقی یہ چاہتی ہے کہ اس کو اپنی تمام حالتوں میں "عاقلانہ روک کے عملدرآمد سے، جو حیوان ناطق یعنے تعقل رکھنے والے انسان کو معمولی جانوروں مثلاً خرگوش سے ممیز کرتی ہے، کم وبیش تقویت پہنچتی رہے"۔

۳۵۔ تحدید خاندان: اس کا مالہ و ماعلیہ

اکثر لوگ اس امر کو بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنے ذرایع کے لحاظ سے اپنے خاندان کی تحدید کرنی چاہیئے، تاکہ اس کے بچوں کو زندگی سے اسی قدر لطف اٹھانے کا موقع ملے جتنا کہ خود اس کو ملا تھا۔ جس طرح عمدہ پودے اگانے کے لیے ان کے تخموں کو بڑی مقدار میں ایک دوسرے کے قریب نہ بونا چاہیئے اسی طرح ایک خاندان میں بچوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہ ہونی چاہیئے، تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی نشو ونما کے معقول مواقع سے متمتع ہونے کے قابل ہو۔ کثرت ولادت سے عام طور پر ضعف قوت لازم آجاتی ہے، اور اسی سبب سے بچوں میں اموات کی شرح زیادہ ہوتی ہے بنامناسب نگرانی اور غذا نہ ملنے کی وجہ سے جو بچے آخرکار مرجاتے ہیں ان کی پرورش کی محنت گویا بالکل ضایع جاتی ہے؛ اور ان بچوں کی چندروزہ حیات نہ صرف والدین کو بلکہ دوسرے بچوں کو بھی جو کسی نہ کسی طرح زندہ بچ رہتے ہیں بے فائدہ رنج وتکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر سے تو یہی زیادہ مناسب ہے کہ انسان اولاد پیدا کرنے سے خود کو اس وقت تک روکے جب تک کہ ان کی پرورش کے انتظام کا اس کو معقول یقین نہ ہو۔ فرد واحد کے لیے جو چیز مفید ہوگی وہی بحیثیت مجموعی معاشرے کے لیے بھی مفید ہوگی۔ اس لیے

باب ۳

کہ اگر افراد کی بہت بڑی تعداد کسی قسم کی دوراندیشی کے بغیر بے روک تولید جاری رکھے تو زندگی کا عام معیار لازمی طور پر گھٹ جائے گا۔[۱]

لیکن بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کی روک کے نقائص کا پلہ فوائد سے بھاری ہے۔ چنانچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر بچے یکے بعد دیگرے جلد جلد پیدا ہوں تو وہ ایسے بچوں کے مقابلے میں جو زیادہ فصل کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، کردار و خصائل کو درست کرنے کا زیادہ بہتر موقع پاتے ہیں؛ برخلاف اس کے زیادہ فصل سے پیدا ہونے والے بچوں کو اس کا موقع نہیں ملتا، اور نہ باہمی دباؤ، اصلاح اور صحبت کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑے خاندان خود والدین پر اس لحاظ سے بیش قیمت تعلیمی اثر ڈالتے 84 ہیں کہ وہ صبر، حلم اور نفس کشی کی تعلیم و تربیت میں مدد دیتے ہیں، اور شریفانہ خصائل و عادات پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ بچے کی نگہداشت کم از کم اس کی زندگی کے چند ابتدائی سالوں میں زیادہ بیش خرچ نہیں ہوتی، لیکن محدود خاندان کے حامی اس واقعے کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان سب استدلالوں کی تہ میں کچھ نہ کچھ صداقت مضمر ہے۔ لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ اکثر خاندانوں کے مصائب و تکالیف کا باعث براہ راست "بچوں کا تباہ کن سیلاب" ہے۔ ممکن ہے کہ دوراندیشی اور احتیاط دراصل حد سے بہت زیادہ کام میں لائی جائے، جیسا کہ فرانس میں ہو رہا ہے لیکن اس کے مقابلے میں بے احتیاطی کی خرابی بھی مساوی شدید ہے، چنانچہ اس کے نتائج موجودہ زمانے کے ہندوستانی معاشرے میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

فرانس کا تذکرہ ہمیں ایک اور عام استدلال کی جانب لے جاتا ہے جو ضبط تولید کے خلاف پیش کیا جاتا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ آبادی کی تحدید اتنی وسیع حد تک عمل میں لائی جائے جو فوجی نقطۂ نظر سے

۱۔ دیکھو ہیرولڈ کاکس کی کتاب موسوم بہ "مسئلۂ آبادی" صفحہ ۱۱۰۔

خطرناک ثابت ہو۔[1] چنانچہ اس کی مشہور قدیم مثال فرانس ہے، جہاں آبادی کے نہ بڑھنے یا کافی تیزی سے نہ بڑھنے سے حکومت خائف ہے، اور لوگوں کو کثیر الاطفال بننے کی ترغیب دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ مبادا روایتی دشمن یعنی جرمنی اپنی کثیر آبادی کی قوت سے آیندہ ناگزیر جنگ میں فرانس کا خاتمہ کردے۔ لیکن ہندوستان کی حد تک یہ بالکل واضح ہے کہ اس کو نری تعداد کے اضافے کی کوئی خاص تمنا نہیں ہے۔ فوجی کارکردگی کے لیے کثرت تعداد سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ جسمانی صحت، دماغی و عقلی مستعدی، ضبط، تنظیم، مدافعتی و جارحانہ جنگ کے لیے جدید ترین ساز و سامان اور قوم کو متحد کرنے والا قوی احساس ہے۔

۳۶۔ آبادی کی تحدید کے طریقے

(۱) اخلاقی اجتناب۔ ان لوگوں میں بھی جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ولادتوں کی تحدید مناسب ہے اس امر پر اتفاق نہیں ہے کہ اس غرض کو پورا کرنے کے بہترین ذرایع کیا ہیں۔ بعضے "اخلاقی اجتناب" پر زور دیتے ہیں کہ یہی واحد محفوظ علاج ہے۔ گو یورپ میں اوسط طبقے کے خاندان "اخلاقی اجتناب" سے در اصل جس حد تک کام لیتے ہیں اس کا

---

[1] تاہم بقول کاکس "بے روک اضافہ فی نفسہ جنگ کے قوی ترین اسباب میں سے ایک سبب ہے، اس لیے کہ وہ مختلف قوموں کے درمیان کشاکش حیات میں شدت پیدا کرتا ہے، گو عام طور پر اس کی تائید اس لحاظ سے بھی کی جاتی ہے کہ وہ بلا اشتعال حملہ سے محفوظ رکھنے کا ایک موثر اور کارگر طریقہ ہے۔ جوں ہی کسی ملک میں آبادی بڑھ جاتی ہے تو، قاید یہ کہتے ہیں کہ "ہماری تعداد میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ ہمیں ملک کی توسیع کے لیے لڑنا چاہیئے"۔ جوں ہی لڑائی واقع ہوتی ہے تو یہی قائد اپنے استدلال کو بدل کر یہ کہتے ہیں کہ "دوسری لڑائی کی تیاری کے لیے ہمیں اپنی آبادی میں اضافہ کرنا چاہیئے" آخر یہ اینچا تانی کس طرح ختم ہوگی؟ جس وقت تک دنیا کی سب قومیں متفقہ طور پر یہ تسلیم نہ کرلیں گی کہ کثرت آبادی جنگ کا لازمی سبب ہے اور اس لحاظ سے ہر قوم کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اپنے ہمسایوں سے لڑنے بھڑنے سے بچنے کے لیے اپنی تعداد کو محدود رکھے، اس وقت تک یہ کشاکش ختم نہیں ہو سکتی"۔ دیکھو ہیرولڈ کاکس کی کتاب موسوم بہ "مسئلۂ آبادی" صفحہ ۳۵۔

باب ۳

گھٹا کر اندازہ کیا جاتا ہے، پھر بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس کو اتنی کافی عمومیت
85 کے ساتھ سب طبقے ہرگز کام میں نہ لائیں گے کہ وہ آبادی کی کثیر زیادتی کو روکنے کے لیے مفید ثابت ہو۔ بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کثرت آبادی کے علاج کے طور پر بیاہے ہوئے جوڑے کو طویل عرصے تک اجتناب کرنے کا سبق پڑھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ بھوک کا علاج کرنے کے لیے معدہ کو الگ کرنے کی رائے دینا۔ دونوں طریقے اس کا قریب قریب مساوی موقع رکھتے ہیں کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ خود مالتھس نے بھی اس کو پوری طرح محسوس کیا تھا، اور اسی وجہ سے اس کی تحریریں قنوطی رنگ کی رہیں۔ علاوہ ازیں اہل الرائے اطبا کا ایک طبقہ بظاہر اس امر کی تائید کرتا ہے کہ طویل مدت تک مسلسل نفس کشی بحیثیت مجموعی ایسا علاج ہے جو اصل مرض سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ اس کا مفرد عمل شادی شدہ جوڑے کے دماغ اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ لہ

(ب) مانعات حمل۔ اسقاط، طفل کشی وغیرہ کے قدیم طریقوں کو قانون اور رائے عامہ دونوں بجا طور پر مذموم قرار دیتے ہیں اور کوئی ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتا کہ ان کے خلاف عمل کرنے کا مشورہ دے۔ ان کا ترک کیا جانا اخلاقی معیار کی بلندی اور ترقی کی خوشگوار علامت ہے۔ صرف ایک طریق بدل باقی رہ جاتا ہے اور وہ مانع حمل طریقوں کا استعمال ہے؛ چنانچہ آج کل اکثر یورپی ممالک کی خصوصیت خاصہ شرح ولادت کی کمی ہے جس کا باعث یقینی طور پر ضبط تولید کے مصنوعی طریقوں کا وسیع اور بکثرت استعمال ہے۔

مغربی ممالک میں شرح ولادت کی تخفیف اور ضبط ولادت کا پروپگنڈا، ان دونوں کا آغاز حیرت انگیز طریقے پر ساتھ ساتھ ہوا۔ چنانچہ انگلستان میں شرح ولادت کی تخفیف اور مقدمۂ بریڈلا کا زمانہ ایک ہی ہے جب کہ

لہ۔ "اخلاقی روک" کے بارے میں اہم اعتراضات کے بیان کے لیے دیکھو لیونرڈ ڈارون کی کتاب موسومہ بہ "علم اصلاح نسل کیا ہے؟" صفحہ ۲۶۔

باب ۳

مسز بیسنٹ اور چارلس بریڈلا پر ۱۸۷۷ء میں اس لیے نالش کی گئی کہ انھوں نے مصنوعی طریقوں سے ضبط ولادت کی تائید میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ اس مقدمے سے عوام کو غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس کی وجہ سے ضمناً ضبط ولادت کے متعلق معلومات کی اشاعت بھی ہوئی، چنانچہ بظاہر لوگوں کی بڑی تعداد نے ان سے عملی فایدہ اٹھانا شروع بھی کردیا۔[1]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں "نومالتھسیت"[2] کے بارے میں ہماری کیا روش ہونی چاہیئے؟ ہم اس عام اعتراض کو نظر انداز کرسکتے ہیں کہ یہ غیر فطری طریقہ ہے۔ کپڑوں، پکی ہوئی غذا اور دوائیوں کا استعمال، اور دوسری بے شمار چیزیں جو متمدن زندگی سے وابستہ ہیں، یہ سب بھی تو غیر فطری ہیں۔ لیکن ہمیں دوسرے زیادہ اہم اعتراضات پر غور کرنا چاہیئے، جن کے منجملہ ایک یہ ہے کہ مانعات حمل کے متعلق معلومات کی اشاعت، صنفی بداخلاقی سے باز رکھنے والی طاقت ور ترین مزاحمتوں میں سے ایک کو ہٹا دے گی۔ اس کا یہ جواب کہ وہ اخلاق جس کی پابندی محض عواقب ونتائج کے خوف سے کی جائے بمشکل لائق عمل ہے، اطمینان بخش نہیں ہے، اس لیے کہ بے قاعدہ تعلقات کا انسداد، خواہ وہ کسی قسم کے محرکات کی بنا پر رونما ہوئے ہوں، معاشری حیثیت سے مناسب اور پسندیدہ ہے۔[3] یہ بات بے چون وچرا 86

---

[1] دیکھو پی ایس فلورنس کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۳۱ تا ۴۲۔

[2] Neo-malthasiamism.

[3] کاکس یہ استدلال کرتا ہے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے کہ مانع حمل ذرایع کے متعلق معلومات زناکاری یا بے قاعدہ تعلقات میں اضافہ کردے گی۔ اس کے برخلاف بعض بے قاعدہ تعلقات کا باعث یہ امر ہوتا ہے کہ اکثر لوگ غیر ضروری بچوں کی ولادت کے خوف سے پاک ازدواجی زندگی میں داخل ہونے سے باز رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بچوں کی ولادت کو روکنے کے طریقوں کی معلومات بعجلت بیاہ کرنے کی جانب مائل کرے گی اور اس حد تک بے قاعدہ تعلقات کی خرابیوں کو کم کردیگی دیکھو کاکس کی کتاب موسوم بہ "مسئلۂ آبادی" صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۸۔

باب۵

تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں کو حرام کاری کی ترغیب ہوتی ہے ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو افشا یا ناجائز ولادت کے خوف سے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ لیکن اس ملک میں اسقاط حمل کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کا محرک جرم کو پوشیدہ رکھنے کا خیال ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ممکن ہے کہ مانعات حمل کی معلومات کی اشاعت لوگوں کو اسقاط کی بجائے کسی حد تک ان مانعات کو اختیار کرنے پر مایل کردے۔ خواہ ایسا ہو یا نہ ہو، بہر حال اس بحث کے سلسلے میں یہ سوال معقول و موزوں ہوگا کہ اگر معاشرہ اس اصول پر غیر متناقض طور پر عمل کرے کہ ہر اس طریقے کو ترک کر دیا جائے جس کے متعلق یہ قرینہ ہو کہ عوام کا ایک طبقہ اس کو بیجا اور غلط استعمال کرے گا تو اس اصول کا تہذیب و تمدن پر کیا اثر مترتب ہوگا؟ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ مانعات حمل کے متعلق معلومات کی اشاعت میں خطرات مضمر ہیں، تو بھی خطرے کو کم کرنا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ اس قسم کی معلومات کی بلا امتیاز نشر کے خلاف حکومت تدابیر اختیار کرے اور صرف ان اشخاص کے لیے اس کی بہم رسانی کا انتظام کرے جو اخلاقی و معاشی حیثیت سے اس کی ضرورت معقول و درست وجوہ کی بنا پر محسوس کرتے ہیں۔[1]

ممکن ہے کہ ضبط ولادت کے طریقوں کی تائید میں بلا امتیاز اور عام پروپگنڈا کا نتیجہ بظاہر یہ ہو کہ صنفی بد اخلاقی میں اضافہ ہو۔ تاہم زیر بحث سوال یہ ہے کہ آیا یہ مناسب نہیں ہے کہ سب خطرات سر پر لیے جائیں اور اس قسم کے پروپگنڈے پر مناسب سرکاری نگرانی قائم کر کے ان خطرات کو کم کرنے کی کوشش

---

[1] انگلستان میں ڈاکٹر میری اسٹوپس نے لندن میں ایک سریریات گاہ یا مطب قایم کیا ہے جس میں مانعات حمل کی بابت خانگی مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی لندن کے مفلسوں کے محلوں میں چند دوسرے نظامات موجود ہیں جو اسی قسم کا کام انجام دیتے ہیں۔"

دیکھو سی پی بلیکر کی کتاب موسوم بہ "ضبط تولید اور حکومت" صفحہ ۹۲ -

Birth-control and the state

باب۳

کی جائے، تاکہ "مفرط آبادی" کی زیادہ شدید خرابی کا سد باب ہو جائے۔
مانعات حمل کے استعمال کے ذریعے سے ضبط ولادت کرنے کے بارے میں ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ اس امر پر مبنی ہے کہ اس کا قرینہ ہے کہ غریبوں کے مقابلے میں آبادی کے زیادہ خوش حال و ذہین طبقے اس کو زیادہ استعمال کریں۔ گو غریب لوگوں کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے لیکن وہ اپنے افلاس کے باعث نہایت بے احتیاطی اور ناعاقبت اندیشی سے کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں غریب طبقے میں عورتیں زیادہ ادنیٰ حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ انھیں عام طور پر اپنی مرضی کے خلاف حمل کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی معاشری زینے کے اس سرے پر بڑھتی ہے کہ جہاں اس کی ضرورت نہیں ہے، اور اس لحاظ سے ضبط ولادت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے اوصاف میں بتدریج کمی واقع ہوگی۔ اس خیال کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ اس کا قرینہ ہے کہ امیر آدمی کے مقابلے میں غریب آدمی کے بچے خداداد جسمانی و دماغی قابلیت کے لحاظ سے ادنیٰ اور کمتر ہوں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد ہی اس امر کو مشکل بنادیتی ہے کہ ان کی اس طرح پرورش کی جائے 87
کہ ان میں بہترین اوصاف رونما ہوں۔ اگر افلاس اور اس کے نتیجے یعنی بے احتیاطی کی روش سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تب بھی ضبط ولادت کے بارے میں جدید معلومات سے فایدہ حاصل کرنے سے ادنیٰ طبقے کے قاصر رہنے کے اسباب کے منجملہ ایک سبب یہ ہے کہ یہ معلومات اکثر و بیشتر ان کو حاصل ہی نہیں ہوتیں، اور اس کا علاج بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دسترس ایسی معلومات پر بڑھائی جائے۔ ضبط ولادت پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادنیٰ طبقے ضبط ولادت کے مقابلتہً بے ضرر طریقوں پر عمل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور اس لحاظ سے وہ آخری چارۂ کار کے طور پر مسلمہ طور سے ضرررساں طریقے استعمال کرتے ہیں، اور یہ کہ یہ نہایت ہی تشویشناک صورت ہے، اس لیے کہ اس طریقے سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں وہ کثرت آبادی کی خرابی سے زیادہ شدید ہیں۔ چنانچہ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آیا کوئی اور خرابی مفرط آبادی کی خرابی سے زیادہ شدید ہوسکتی ہے۔ یہ خیال کرنا بھی مشکل ہے کہ ایک بچے کی

باب ۳

مناسب طریقے پر پرورش کرنے کے مصارف، ان اخراجات سے کم ہو سکتے ہیں جو ضبط ولادت کے طریقوں کے استعمال سے لاحق ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب میں یہ شکایت عام طور پر سنی جاتی ہے کہ اعلیٰ طبقے ضبط ولادت کے طریقوں پر اس حد تک عمل کرتے ہیں جو معاشری حیثیت سے ضرر رساں ہے، اور بچوں کی معتدل تعداد کی پرورش کرنے کے بار اور اس کی مسرت پر غیر ضروری طور پر اعلیٰ بلکہ حد سے زیادہ بڑھیا معیار زندگی کو مرجح خیال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہر قسم کا دباؤ ان پر ڈالا جائے اور ہر قسم کی ترغیب و تحریص دلائی جائے تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ اخلاقی حیثیت سے ان پر لازم ہے کہ وہ حکومت کو تاحد امکان زیادہ سے زیادہ تندرست، طاقت ور اور عمدہ تعلیم یافتہ شہری حوالے کریں۔ "ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ جہاں کہیں جملہ وجوہ کی بنا پر ضبط تولید کی ضرورت ہو وہاں اس کے لیے سہولتیں مہیا کریں اور دوسری جانب جہاں محض خود غرضانہ محرکات کی بنا پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس کو بلا کم و کاست مذموم قرار دیں۔ ضبط ولادت کے موافق و مخالف دوہری مہم کی ضرورت ہے"[1] لیکن موجودہ زمانے میں ہندوستان میں آبادی کے جملہ طبقے بلالحاظ مذہب و ملت آبادی کو کم کرنے کی بجائے بڑھانے کی جانب مائل ہیں۔ لہٰذا آبادی کی ارادی روک کی ترغیب دینے کے لیے منظم سعی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۳۷۔ ضبط تولید، ہندوستان کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے۔

مسئلۂ ضبط تولید سنجیدہ غور و توجہ کا مستحق ہے لیکن ہندوستان میں اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے اور ایک مدت دراز سے اس پر سطحی اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی رہی ہے۔ ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسئلہ کم از کم "غور و تامل کے لائق" ہے؛ اور ملک کی معاشی ترقی کے "غیر محدود امکانات" کے متعلق مبہم تعمیمات سے کام لے کر اور مسئلۂ آبادی کے اہم عناصر ہی کو سمجھنے سے مستقلاً انکار کر کے ضبط ولادت کے مسئلے کو سرسری طور پر خارج نہیں کیا جا سکتا۔

[1] دیکھو لیونرڈ ڈاروِن کی محولۂ بالا کتاب، صفحہ ۳۰۔

باب ۳ 88

لوگوں کے انتہائی افلاس اور اس کے نتیجے کے طور پر دور اندیشانہ محرک کی کمزوری کے باعث ضبط ولادت کے طریقے بلاشبہ بہت مدت میں جاکر رواج پائیں گے۔ علاوہ ازیں تعصب وجہالت کے دیو سے بھی جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ خیال بتدریج ترقی کر رہا ہے کہ معاملات کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی پالسی ناکام ثابت ہوگی[1]

۳۸۔ نقل وطن: (۱) ملک کے اندر آبادی کی نقل و حرکت[2]

آدم اسمتھ کا مقولہ کہ "جملہ سامانوں میں انسان ہی ایک ایسا سامان ہے جس کی نقل وحمل سب سے زیادہ دشوار ہے" ہندوستان پر خاص طور پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مقام پیدایش اور سکونت کے لحاظ سے مجموعی آبادی کا اندازہ قریب قریب ۳۲۵ ½ ملین کیا گیا تھا۔ اس کے منجملہ ایک ملین سے بھی کم آبادی ایسی تھی جو مقیم ایک جگہ تھی اور پیدا دوسری جگہ ہوئی تھی۔ ہندوستانی گھر بار سے انتہائی محبت کرتے ہیں۔ ان کی

---

[1] "ارادی ضبط ولادت کے طریقوں کی تائید صرف متعدد وطنی مصنف ہی نہیں کرتے بلکہ اہل ہند اب یہ فخر کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں "نومالتھسی لیگ" موجود ہے جس کے سرگرم موید دو مہاراجہ، عدالت العالیہ کے تین جج اور چار یا پانچ مشاہیر قوم ہیں۔ یہ واقعہ اہمیت سے خالی نہیں کہ حکومت ہند نے ملک کے چار بڑے سرکاری شفاخانوں میں ضبط تولید کے سرپرستیات گاہیں قایم کرنے کی منظوری دے دی۔" دیکھو ایک کتاب موسوم "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں" صفحہ ۱۵۳۔ حال کی اہم ترین ترقیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی خواتین نے ضبط تولید کے مسئلے میں سرگرمجوشانہ دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ضبط تولید کی تائید میں رزولیوشن پاس کرنا خواتین کی کانفرنس کی عام خصوصیت بن گئی ہے۔

[2] دیکھو رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۳۱ء جلد اول باب (۳)؛ رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۲۱ء جلد اول صفحہ ۸۲ تا ۹۸؛ رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۹۱۱ء جلد اول باب (۳)؛ رپورٹ مردم شماری ۱۹۰۱ء جلد اول صفحہ ۸۸ تا ۹۵؛ اور زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۵۸۱ تا ۵۸۵۔

باب ۲

یہ خصوصیت خاصہ معاشی و معاشری اسباب اور اس امر کا نتیجہ ہے کہ غیر نقل پذیر زرعی آبادی زمین سے وابستہ ہے؛ ذات پات، زبان اور معاشری رسم و رواج کی بندشوں اور قیود میں جکڑی ہوئی ہے اور ہر قسم کی تبدیلی کو فطری طور پر خوف کی نظر سے دیکھتی ہے۔ معاشری سبب جو زیادہ تر ہندوؤں کو متاثر کرتا ہے، ذات پات کا طریق ہے جو ایک ایسے شخص کی زندگی کو عذاب جان بنا دیتا ہے جو اپنے معاشرے کے دائرے سے الگ تھلگ رہتا ہو۔ چنانچہ وہ عام طور پر نہ تو بیاہ کر سکتا ہے اور نہ دوسرے فرقوں کے ارکان کے ساتھ کھا پی سکتا ہے؛ علاوہ ازیں طویل عرصے تک اس کی معاشرے سے علیحدگی ممکن ہے کہ اس کے بارے میں یہ بدگمانی پیدا کر دے کہ اس نے ذات کے قواعد توڑ دیئے ہیں، اور اس کی واپسی پر اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔

نقل وطن کی راہ میں معاشی مزاحمت اس واقعے میں مضمر پائی جاتی ہے کہ اہل ہند کا زیادہ تر انحصار صرف ایک ہی پیشے یعنے زراعت پر ہے۔ ایک خطۂ زمین کی ملکیت یا اس سے دلچسپی اور وابستگی لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ وہ ایک مقررہ اگرچہ غیر اطمینان بخش ذریعۂ معاش کو دوسری جگہ یا دوسرے طریقے پر روزی تلاش کرنے کی خاطر ترک کریں۔ علاوہ ازیں ملیریا اور خطافیہ (Hook worm) وغیرہ جیسے امراض کہنہ کا بھی مضر اثر پڑتا ہے، جو انسان کی مستعدی اور قوت اختراع کو سلب کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر دیہاتی، مہاجن کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں، جو اپنے قرضداروں کے دیہات چھوڑنے کی راہ میں ہر ممکنہ مزاحمت پیدا کرتا ہے۔

آخری امر یہ ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آبادی کی اکائی جتنی چھوٹی ہوگی
اتنا ہی ان اشخاص کا تناسب زیادہ ہوگا جو دوسری جگہ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر 89
یہ بات صحیح ہو تو، یہ توقع کرنی چاہئے کہ ہندوستان جیسے ملک کے اندر جس میں دنیا کی کل آبادی کا قریب قریب $\frac{1}{5}$ حصہ بود و باش رکھتا ہے، نقل وطن کرنے والوں کے متناسب اعداد کم ہوں گے۔ لیکن آبادی کے عام طور پر غیر نقل پذیر ہونے کے باوجود، ملک کے اندر نقل وطن کی بعض معین لہریں موجود ہیں جن کا اجمالی طور پر

باب ۳

ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔[۱]

۱۔ مردم شماری بابتہ ۱۹۱۱ء میں مختلف قسموں کے نقل وطن کو حسب ذیل بیان کیا گیا ہے۔

(۱) اتفاقی یا خفیف نقل وطن ہمسایہ دیہات کے مابین۔ "اس قسم کی خفیف نقل وطن کا بڑا سبب یہ رواج ہے جو ہندوؤں میں عام ہے کہ والدین اپنے لڑکوں کے لیے اپنے گاؤں سے الگ دوسرے گاؤں میں بیویاں تلاش کرتے ہیں؛ اور دوسرے یہ واقعہ کہ بعض علاقوں میں نوجوان بیوی وضع حمل کے لیے اور خاص کر پہلی زچگی کے لیے اپنے میکے واپس جاتی ہے۔"

(ب)۔ عارضی۔ جو زیادہ تر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ نئی نہروں اور ریلوں میں محنت کی طلب کو پورا کرنے کے لیے قلی نقل مقام کرتے ہیں، یا کاروبار، مقدس مقاموں کی زیارت یا شادی بیاہ کی رسوم کے سلسلے میں نقل مقام کیا جاتا ہے۔

(ج) میعادی۔ یعنے محنت کی موسمی طلب کو پورا کرنے کے لیے؛ مثلاً فصل کی کٹائی کے موسم میں سندر بن، برما، اور شمالی ہند کے گیہوں پیدا کرنے والے علاقوں کو مزدور سالانہ منتقل ہوتے ہیں؛ اور موسم سرما میں بہار اور صوبۂ متحدہ سے سڑکوں پر کام کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر نقل و حرکت عمل میں آتی ہے۔

(د)۔ نیم مستقل۔ ایک مقام کے باشندے دوسرے مقام میں جاکر کسب معاش کرتے ہیں، لیکن اپنے قدیم وطن سے جہاں ان کے بیوی بچے رہتے ہیں اپنے تعلقات برقرار رکھتے ہیں اور خود بھی انجام کار یہیں لوٹ آتے ہیں؛ مثلاً بڑے شہروں کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے اکثر مزدور، سرکاری دفاتر کے ملازم اور خانگی خدمت گار، نیز ہر جائی مارواڑی تاجر اور مہاجن۔

(ہ)۔ مستقل۔ اس قسم کی نقل نوآبادکاری کی نوعیت رکھتی ہے، اور بالعموم اس صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ آب پاشی یا ذرائع نقل و حمل کی ترقی و توسیع یا تبدلہ سیاسی حالات کے باعث نئی زمینیں قبضے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ اس قسم کی نقل کی مثالیں یہ ہیں (۱) شمالی برما کے الحاق کے بعد سے اس علاقے سے جنوبی برما میں وسیع پیمانے پر آبادکاری؛ (۲) پنجاب میں کارہائے آب پاشی کی تکمیل کے بعد گنجان علاقوں سے آبادی کی نہری نوآبادیات میں یورش۔

باب ۳

(ل) آسام آسام کی آبادی بہت قلیل اور دور دور پھیلی ہوئی ہے،
اور چونکہ وہاں قابل زراعت زمین وافر مقدار میں
دستیاب ہوتی ہے اس لیے وہاں کے باشندے اجرت پر کام کرنے کو غیر ضروری
خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ چائے کے باغوں کے لیے مزدوروں کی رسد دوسرے
صوبوں سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ وادی برہم پتر میں جو قابلِ زراعت لیکن
افتادہ زمین ہے وہ بھی دوسرے صوبوں سے نقل مقام کرکے آنے والوں کی ٹری
تعداد کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

چائے کی باغبانی کی صنعت میں کام کرنے والے مزدور دوسرے صوبوں
مثلاً بہار و اوڑیسہ، صوبہ جات متوسط و متحدہ اور مدراس سے آتے ہیں،
اس کے برخلاف وادی برہم پتر کے آبادکار زیادہ تر مشرقی بنگال سے آتے ہیں۔
آسام میں تیسری قسم کی درآمد نیپالیوں کی ہے جن کی محنت زیادہ تر گلہ بانی کی
نوعیت رکھتی ہے۔ غرض آسام میں دوسرے مقامات سے آکر بسنے والوں کی 90
تعداد خاصی بڑی ہے؛ جیسا کہ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ صوبے کی
قریب قریب ایک چوتھائی آبادی غیر ملکی یا خارجی نژاد ہے۔ آسام میں اب بھی
زمین کا بہت بڑا رقبہ زراعت کے لیے دستیاب ہو سکتا ہے لیکن دوسرے
علاقوں کی آبادی جس سرعت کے ساتھ اس وقت یہاں جذب ہو رہی ہے
اس سے زیادہ سرعت کی راہ میں ”کالا آزار“ اور دوسرے امراض کا شیوع،
اطمینان بخش ذرایع نقل وحمل کی کمی اور ادنیٰ شرح اجرت مزاحمت پیدا
کرتی ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے تغیرات و ترقیات رونما ہوئے ہیں، خاص کر
ان صوبوں سے آبادی کی نقل وحرکت میں جو پہلے چائے کے باغوں کے لیے
مزدوروں کی رسد فراہم کیا کرتے تھے۔ مدراس ہی تنہا ایک صوبہ ہے جہاں
آسام کو نقل مقام کرنے والوں میں اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ بہار اور اوڑیسہ کے
مزدوروں کی بھرتی میں سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے بہت تیزی کے ساتھ کمی ہوگئی جس کا
باعث زیادہ تر یہ امر تھا کہ ترک موالات (نان کوآپریشن) کے حامیوں نے

اس بھرتی کے خلاف مہم کا ارادۃً آغاز کر دیا تھا۔ لیکن جب چھوٹی مدت کی بھرتی کا طریقہ مقبول ہو گیا تو بھرتی کا کام از سر نو شروع ہوا۔ دوسری طرف' آسام' مقامی مزدوروں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے کا سبق بھی سیکھ رہا ہے۔

(ب) بنگال بنگال میں نقل مقام کر کے آنے والوں میں ۶۰ فی صد سے زاید حصہ بہار اور اوڑیسہ سے آتا ہے' اور باقی حصہ صوبۂ متحدہ (۱۸ فی صد)' نیپال (۵ فی صد)' آسام (۴ فی صد)' صوبۂ متوسط (۳ فی صد) وغیرہ سے آتا ہے۔ یہاں توطن اختیار کرنے والوں کی اہم ترین لہریں حسب ذیل علاقوں سے آتی ہیں:-

(۱) بہار اوڑیسہ اور صوبۂ متحدہ کے مشرقی علاقوں سے کلکتے کے نواحی علاقوں میں؛ (۲) سنتل پرگنوں سے بیر بھوم' مالدہ' دیناج پور اور شمالی بنگال کے علاقوں میں؛ (۳) نیپال اور چھوٹا ناگپور سے دارجیلنگ اور جل پگوری کے چائے کے باغوں میں؛ اور (۴) آسام سے ریاست تری پورا میں۔

بنگال میں آبادی کی درآمد کا باعث یہ ہے کہ یہاں کی زمین مقابلۃً زیادہ زرخیز ہے' صنعتیں خاص کر کلکتہ کے نواح میں مقابلۃً زیادہ ترقی یافتہ ہیں' اور بنگالی دستی پیشوں سے نفرت کرتے ہیں جو ان کی خصوصیت خاصہ ہے۔ نہ صرف دستی مزدور بلکہ محابس کے پولیس کے آدمی اور چوکی دار' زمین داروں کے چپراسی وغیرہ بھی زیادہ تر دوسرے صوبوں ہی سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ بنگال میں آبادی کی اندرونی نقل کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وسطی علاقے کے لوگ ایک طرف تو کلکتے کے گرد و نواح میں منتقل ہو رہے ہیں اور دوسری طرف شمالی بنگال اور وادئ آسام کی جانب نقل پذیر ہیں۔

(ج) بمبئی بمبئی پریسیڈنسی میں دوسرے صوبوں سے آنے والی آبادی کی نقل مقام کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ بمبئی' کراچی اور شولاپور جیسے بڑے بڑے تجارتی و صنعتی شہروں میں بیرونی اشخاص کا انجذاب روز افزوں ہے' یہ لوگ زیادہ تر بلوچستان' شمال مغربی سرحدی صوبہ' پنجاب اور صوبۂ متحدہ' راجپوتانہ' حیدرآباد دکن اور مدراس سے آتے ہیں۔ ال' جی' سچوک مہتمم مردم شماری 91

باب ۳

(سنہ ۱۹۲۱ء) بمبئی رقم طراز ہیں کہ "بمبئی میں دو ذرایع سے آبادی کی درآمد ہوتی ہے' ایک تو شمال مغربی ہندوستان سے جس کی نمایندگی بلوچستان' شمال مغربی سرحدی صوبہ' پنجاب' صوبۂ متحدہ اور راجپوتانہ کے وسیع علاقے کرتے ہیں؛ اور دوسرے جنوب مشرق سے یعنی حیدرآباد اور مدراس سے۔ شمالی لہر بمبئی اور کراچی کے ادنیٰ طبقوں اور مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے؛ اور حیدرآبادی موج کا رُخ شولاپور کی گرنیوں کی طرف ہے۔ ......" "صنعتی حیثیت سے' بنگال کے مقابلے میں' بمبئی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ گو بنگال کی طرح اس کی آبادی گنجان نہیں ہے' اس لیے کہ بمبئی کی زمین بدرجہا کم زرخیز ہے؛ لیکن یہاں مقامی محنت کی بدرجہا زیادہ رسد دستیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی طلب کے بہت ہی چھوٹے حصے کو صوبے کے باہر سے پورا کیا جاتا ہے۔

شمال مغربی ہندوستان سے خالص درآمد کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ باہر سے آنے والوں کا قریب قریب ایک تہائی حصہ صوبۂ متحدہ سے' ½ راجپوتانہ سے' اور باقی پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان سے آتا ہے' اگرچہ بلوچستان کے باشندے زیادہ تر سندھ جاتے ہیں۔ صوبے میں داخلی نقل مقام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آبادی صوبے کے طول و عرض سے صنعتی شہروں میں منتقل ہوتی ہے۔ دکن ایک خشک علاقہ ہے جو ہمیشہ سے زرعی خشک سالی کا مرکز بنا رہا ہے' لہذا اس کی زاید اور بے کار آبادی بمبئی پریزیڈنسی کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ چنانچہ سارے صوبے کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اس علاقے کے باشندے شہر بمبئی کو منتقل ہوتے ہیں۔

(د) برما[1] آسام کے مثل برما کی آبادی بھی کم گنجان ہے' اور اس میں قابل زراعت افتادہ زمین کا بہت بڑا رقبہ موجود ہے۔

[1] قانون حکومت ہند بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء کی رو سے برما برطانوی ہند سے الگ ہو جانے والا ہے۔ جب برما الگ ہو جائے گا تو "برما کو نقل مقام" کہنے کے بجائے "برما میں توطن خارجی" کہا جائے گا۔

باب ۳

ان ہی اسباب کی بنا پر جو آسام کے چائے کے باغوں کے بارے میں پائے جاتے ہیں، برما کی چاول اور تیل کی گرنیوں کے لیے بھی مزدور باہر سے خاص کر مدراس سے، بلانے پڑتے ہیں۔ چٹگانگ سے قلیوں کی بہت بڑی تعداد اکیاب کی چاول کی فصلوں اور رنگون کی چاول کی گرنیوں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ برما میں باہر سے آئے ہوئے اشخاص کی مجموعی تعداد ۰۰۰،۷۰،۷ ہے، جن کے منجملہ ۰۰۰،۳۰،۵ ہندوستانی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماریوں کی درمیانی مدت میں ہندوستانی توطن گزینوں کی تعداد میں ۱۶ فی صد اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں سنہ ۱۹۲۱ء کے اعداد پر ۰۰۰،۱۲ کا اضافہ رونما ہوا۔ اس نقل و حرکت کی غیر مستقلانہ نوعیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ توطن اختیار کرنے والوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں بہت ہی کم ہیں۔ ہندوستانی تارکان وطن کی سب سے زیادہ تعداد مدراس سے جاتی ہے، اس کے بعد بنگال، صوبۂ متحدہ اور پنجاب کا نمبر ہے۔ ہندوستانی تارک وطن موجودہ زمانے میں زیادہ تر شہری صنعتوں میں کام کرتا ہے اور وہ سب کٹھن دستی کام کرتا ہے جس سے برمی کوئی ذوق نہیں رکھتا۔

پھر بھی برمیوں کی روز افزوں خود داری کے سبب سے (جس کا اظہار 93
بعض اوقات مخالف ہندوستانی بلووں سے ہوتا ہے) اور دیسی آبادی کے بڑھنے اور معاشی دباؤ کے روز افزوں ہونے کی وجہ سے، برطانوی ہند کے گنجان علاقوں کی آبادی کے لیے برما میں نقل اور توطن پذیری زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتی جارہی ہے۔

۳۸۔ نقل وطن:
(۲) توطن خارجی

اس وقت قریب قریب ½ ۲ ملین ہندوستانی غیر ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ ان میں سے قریب قریب سب کے سب سلطنت برطانیہ کے دوسرے علاقوں میں قیام پذیر ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں صرف دس لاکھ اشخاص نے ترک وطن کیا۔ سلطنت کے مختلف علاقوں میں ان کی تقسیم کم و بیش حسب ذیل ہے:-

سیلون	(۷۷۹،۰۰۰)

باب ۳

برطانوی ملایا	(۶۲۴،۰۰۰)
موریشس	(۲۶۹،۰۰۰)
جنوبی آفریقہ	(۱۶۵،۰۰۰)
ٹرینی ڈاڈ	(۱۳۹،۰۰۰)
برطانوی گیانا	(۱۳۰،۰۰۰)
جزائر فی جی	(۷۵،۰۰۰)
کینیا	(۲۷،۰۰۰)
ٹنگانیکا	(۲۳،۰۰۰)
جمائیکا	(۱۷،۰۰۰)
زنزبار	(۱۵،۰۰۰)
اوگانڈا	(۱۲،۰۰۰)

سلطنت برطانیہ سے باہر غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں کی تعداد بہت کم ہے؛ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سب ملا کر ایک لاکھ چار ہزار سے زائد نہ ہوگی۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی توطن خارجی کے دو اہم ترین ملک ملایا اور سیلون ہیں۔ اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں ملایا کے لیے ہندوستانی مزدوروں کی بھرتی روک دی گئی جس کا باعث یہ تھا کہ ٹن اور ربر کی قیمتیں گھٹ گئی تھیں، اور سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۱ء میں انھیں بڑے پیمانے پر وطن لوٹایا گیا۔ رہا سیلون تو، ربر کے کھیتوں میں کاشت کے لیے ہندوستانی مزدوروں کی بھرتی سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۱ء میں موقوف کردی گئی، اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۱ ہزار ہندوستانی وطن لوٹا دیے گئے۔ لیکن دوسرے طریقوں سے یہاں توطن خارجی کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیلون میں ہندوستانی مزدوروں کا انجذاب قریب قریب نقطۂ سیری تک پہنچ گیا ہے[1]۔ ہندوستانی توطن خارجی عام طور پر دو قسم کا رہا ہے۔

۱؎۔ مندرجۂ بالا گوشوارے میں سنہ ۱۹۳۱ء کی صورت حال بتلائی گئی ہے اور یہ اعداد ملایا اور سیلون سے مزدوروں کی وطن کو واپسی کے بعد کے ہیں۔

باب

ایک تو میثاقی طریقے کے تحت غیر ماہر مزدوروں کا ترک وطن کرنا مثلاً فی جی، موریشس، نیٹال اور جزائر غرب الہند میں؛ یا کسی خاص بھرتی کے طریقے کے تحت، جیسا کہ سیلون اور ملایا میں اختیار کیا گیا۔ دوسرے، پیشہ ور، تجارتی اور دستکار پیشوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی ازخود نقل پذیری۔ اول الذکر قسم کی نقل پذیری کے مقابلے میں موخر الذکر قسم کی نقل پذیری زیادہ وسیع رہی ہے، اور اس کے تحت ایسے مقامات تک بھی لوگ پہنچے ہیں جو امدادی توطن خارجی کے کسی طریقے کے تحت کبھی نہیں آئے۔ چنانچہ یہ بات جنوبی آفریقہ اور بعض شاہی نو آبادیات کو مستثنیٰ کرکے خود حکمراں مقبوضات پر اور خاص کر مشرقی آفریقہ کے علاقوں پر بھی صادق آتی ہے۔

اکثر ہندوستانی، ملک سے باہر جاکر زرعی مزدوروں کے طور پر ربڑ، چائے، قہوہ وغیرہ کے باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کا میثاقی طریقے کے تحت توطن خارجی مارچ ۱۹۱۷ء میں مسدود کردیا گیا، اور اس کے نتیجے کے طور پر توطن خارجی میں بہت بڑی حد تک کمی ہوگئی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی شہنشاہی کانفرنس کی قرارداد نے اس اصول کی مزید توثیق کردی کہ جماہیر برطانیہ کی ہر رکن 93
قوم کو اپنی آبادی کی ترکیب پر کامل اختیار ہونا چاہئے، تاکہ وہ دوسری قوموں میں سے کسی قوم کے افراد کی درآمد کو روک سکے۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ میں جو ملک داخل ہیں ان میں سے اکثروں نے اپنے حدود کے اندر بیرونی آبادی کی درآمد کی تحدید و تنظیم کے حق و اختیار کو، ہندوستانیوں کا داخلہ پوری طرح بند کرنے کے خیال سے نہیں تو کم ازکم ان کی حوصلہ شکنی کی نیت سے استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے اسباب سیاسی ہوں یا قومی یا خالصتاً معاشی؛ لیکن جہاں تک ہندوستانی آبادی کا تعلق ہے اس ناخوشگوار واقعے کا مقابلہ کرنا چاہئے کہ ملک کے اندر آبادی کی گنجانی کا بار ہلکا کرنے کے علاج کے طور پر آبادی کی بیرونی نقل یا توطن خارجی قریب قریب غیر ممکن ہے۔[1] مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۹۲۱ء میں بتلایا گیا ہے

[1] توطن خارجی کے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی کے متعدد پہلوؤں پر مفصل بحث کرنا غیر ضروری ہے۔

باب ۳

کہ پچھلے دہے میں آبادی میں بہت زیادہ اور سریع اضافہ ہونے کے باوجود، سابقہ دوروں کے مقابلے میں توطن خارجی کے ذریعے سے آبادی کے بار کو بہت کم ہلکا کیا گیا۔

مذکورۂ بالا متعدد قیود کے باعث ہندوستان کے حدود سے باہر اہل ہند کا توطن خارجی کچھ سال ادھر غیر اہم رہا ہے۔ توطن خارجی کے امکانات سلطنت برطانیہ کے ان علاقوں تک محدود ہیں جو منطقۂ حارہ اور تحتانی منطقہ حارہ میں واقع ہیں۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ برطانوی ملایا اور سیلون کچھ زمانے تک ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ تقریباً ۱۴۰۰۰۰، اشخاص سالانہ جذب کریں گے۔ لیکن اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی امید ہے کہ مستقبل میں برطانوی گیانا میں کافی تعداد میں توطن اختیار کیا جائے گا جہاں اب بھی زراعت کی توسیع کے لیے بہت بڑا میدان موجود ہے۔ برطانوی گیانا کی موجودہ آبادی کم و بیش ۳۰۴۰۰۰ نفوس ہے، لیکن ملک اس سے دس گونہ تعداد کی کفالت کی بھی قابلیت رکھتا ہے اور ہندوستانیوں کی بود و باش کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ قانون توطن خارجی بابتہ ۱۹۲۲ء کے تحت اس نو آبادی میں ہندوستانیوں کے توطن خارجی کی ایک تجویز منظور کی گئی ہے، لیکن اس پر اب تک عملدرآمد اس لیے نہیں ہوا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: موجودہ زمانے میں ایسی نقل پذیری کرنے والوں کی تعداد بہت ہی غیر اہم ہے چنانچہ یہ مسئلہ، اس ملک کے معاشی حالات میں سکون پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے کسی معنی میں بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۲۲ء کے قانون توطن خارجی (the Emgration Act of (1922)) کی رو سے غیر ماہر مزدوروں کا امدادی توطن خارجی خلاف قانون اور ناجائز قرار دیا گیا۔ بجز اس صورت کے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کسی شخص کو کسی خاص ملک میں خاص حالات و شرائط کے تحت جانے کی اجازت دیں۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مجلس قانون ساز کی ایک مجلس قائمہ توطن خارجی بھی ہے جو حکومت کو توطن خارجی کے تمام بڑے مسائل مثلاً تارک وطن غیر ماہر مزدوروں کی اجرت کا معیار مقرر کرنے اور ہندوستانی آبادکاروں کی بود و باش کے شرائط معین کرنے کے بارے میں مشورہ دیتی ہے۔

باب ۳

کسان شرائط کو غیر منفعت بخش خیال کرتے ہیں۔ زرعی کمیشن نے پر زور سفارش کی ہے کہ یہ تجویز مزید تحقیق کی مستحق ہے،" اس لیے کہ ہندوستانی آبادی دگنی ہو جانے کے امکان کو حقیر یا موہوم تصور نہیں کیا جا سکتا۔" (دیکھو رپورٹ پیراگراف ۵۱۰)۔

۲۹۔ نسل انسانی کی اصلاح انسان، پیدائش دولت کا اہم ترین آلہ ہے؛ اس لحاظ سے جو چیز بھی نوع انسانی کی جسمانی صحت و قوت، عقل و ذہانت اور کردار و خصائل کی اصلاح کرتی ہے وہی اس کی معاشی قوت اور کارکردگی میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ کچھ سال ادھر اس امر کی بہت کچھ تحقیق کی گئی ہے کہ معاشی 94 قدر و قیمت رکھنے والے حیوانات و نباتات کی اصلاح و ترقی پر توارث کا کیا اثر پڑتا ہے، اور اس بارے میں اہم علمی نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان، نباتات اور گھریلو جانوروں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو کچھ کر سکا ہے وہ اپنے لیے کبھی نہ کر سکا۔ لیکن انسانوں کے بارے میں توارث کا مطالعہ کرنے اور اس کے قوانین کا نسل انسانی کی اصلاح کی غرض سے اطلاق کرنے میں دشواری یہ ہے کہ انسان پر وسیع حدود کے اندر تجربہ کرنا یا جوڑ لگانے میں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا جو حیوانات اور نباتات کے ساتھ کیا جاتا ہے غیر ممکن ہے۔

تاہم نسل انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے یہ امر نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ نسل کے قیام و دوام کا انحصار تا حد امکان ان افراد پر ہو جو قوم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کا میلان یہ ہے کہ ان عاملین میں سے بعض کو نابود کر دیا جائے جو جسمانی و دماغی حیثیت سے کمزور افراد کی ہلاکت کا سبب بن گئے ہیں۔ قدیم زمانے کے حالات کے تحت کمزور اور نحیف لوگوں کو کشاکش حیات میں باقی رہنے یا اپنی نسل کو بڑھانے کا بہت کم موقع حاصل تھا۔ مثلاً جو لوگ غیر معمولی طور پر جری اور طباع ہوتے تھے وہ کمزور افراد کے مقابلے میں زیادہ بیویاں حاصل کر سکتے تھے اور اس لحاظ سے زیادہ اولاد پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں حفظ صحت و صفائی کی اصلاح و ترقی

باب۳

طبابت وجراحی کی ترقی، اور انسانی ہمدردی کے جذبے کی ترقی کی بدولت فطری انتخاب کا عمل رک گیا ہے[1] جسمانی حیثیت سے غیر موزوں ونا کارہ لوگوں پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے، اور فاترالعقل اور بگڑے ہوئے اخلاق کے لوگ جو موروثی امراض کے تخم اپنے اندر رکھتے ہیں، بیاہ کے ذریعے سے اپنی نسل کو قایم ودائم رکھتے ہیں۔ سائنٹیفک مشاہدے اور تجربے کی مشکلات کے باعث علم اصلاح النسل کی ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہے، اور ہماری معلومات، قوانین توارث کے بارے میں، جس حد تک کہ ان کا اطلاق انسانی خصائل کی توریث پر ہوتا ہے، ابھی تک بہت ہی معمولی ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے میں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ نوع انسان کے بارے میں چند نتائج ان قواعد واصول سے اخذ کر لیں جن کی پابندی جانوروں کی پرورش کرنے والا مفید پاتا ہے۔ علم اصلاح النسل کی ہر عملی تجویز، ایجابی وسلبی، دونوں پہلو رکھتی ہے؛ یعنی اس کا مقصد خاص طور پر موزوں اشخاص کی نسل کو بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرنا اور خاص طور پر غیر موزوں اشخاص کی افزائش نسل کی حوصلہ شکنی
95 کرنا ہے۔ ہندوستان میں بیاہ کا رشتہ جوڑنے میں چند قواعد کی پابندی کی جاتی ہے جو اصلاح نسل کے لیے مفید ہیں؛ مثلاً رشتہ داری کی بعض صورتوں میں بیاہ ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں ذاتوں کو بعض "برون تزواجی"[2] طبقوں یا برادریوں (گوتروں) میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان کے ارکان کا ناتہ اس قدر قریب کا

[1] ۔ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ قدیم حالات کے تحت فطری انتخاب نے بقائے اصلح کا نتیجہ لازمی طور پر نہیں پیدا کیا۔ چنانچہ یہ بات بجا طور پر کہی گئی ہے کہ فطری انتخاب، قوت جسمانی کو قوت دماغی پر اور ادنیٰ قسم کی مکاری کو اعلیٰ قسم کی ذہانت پر عام طور پر ترجیح دیتا تھا۔ علاوہ ازیں طب اور حفظ صحت کی ترقی بحیثیت مجموعی قوم کی معاشی کارکردگی کو بڑھا دیتی ہے۔ بہر حال یہ ایک مسلم الثبوت کلیہ ہے کہ قدیم حالات کے مقابلے میں جدید حالات کے تحت غیر موزوں اشخاص کی بہت بڑی تعداد باقی رہنے اور نسل بڑھانے کے قابل ہو گئی ہے۔

[2] (Exogamous)

مانا گیا ہے کہ ان کو آپس میں بیاہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آیا یہ خاص قسم کی ممانعت کوئی سائنٹفک بنیاد رکھتی ہے یا نہیں[1]۔ دوسری طرف ہندوستان میں بعض رواج ایسے ہیں جن کی وجہ سے لازمی طور پر نسلی انحطاط واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ ان ہی رواجوں میں سے ایک یہ ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی ذیلی ذاتوں میں جو آپس میں شادی بیاہ کر سکتی ہیں ہمیشہ ازدواجی رشتے قائم ہوتے اور اولاد پیدا ہوتی رہتی ہے[2]۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، انسانی توارث کے قوانین سے واقفیت کا ویسا ہی محتاج ہے جیسا کہ کوئی دوسرا ملک۔ یہ توقع کرنا دراصل بے نتیجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ واقفیت کے باوجود اختیاری فعل خارجی تحریک کے بغیر موزوں ترین نسلوں کو محفوظ طریقے پر بڑھائے گا۔ اسی کے ساتھ سب سے زیادہ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں بھی ایجابی اصلاح نسل کی آئینی تجاویز موجودہ زمانے میں خارج از بحث ہیں، اس لیے کہ ان کی اس لحاظ سے مخالفت کی جائے گی کہ وہ انفرادی آزادی پر بے جا دباؤ ڈالتی ہیں۔ پھر بھی بعض ملک اصلاح نسل کے متعلق آئین وضع کرنے کے بارے میں امتحانی طور پر تجربے عمل میں لا رہے ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ میں، ریاست نبراس کا میں ایسے شخص کو بیاہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے جو امراض خبیثہ میں مبتلا ہو۔ ریاست کنکٹی کٹ نے ایسے اشخاص کے ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہے جو مرگی کے مرض یا دماغی امراض میں مبتلا ہوں۔ مونٹانا میں پاگلوں اور مرگی کے بیماروں کی تولیدی قوت آپریشن کے ذریعے سے سلب کر لی جاتی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر وہ مجامعت تو کر سکتے ہیں لیکن اولاد پیدا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ کٹر مجرموں اور دوسرے ناخواستہ و ناپسندیدہ

---

[1] ایس، وی، کرانڈی کر اپنی عالمانہ تصنیف موسوم بہ "ہندو برون زواجی" Hindu Exogamy میں ان غیر ضروری اور بے معنی برون زواجی قیود کو نرم بنانے کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں جن میں ہندو سماج نے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔

[2] دیکھو کرانڈی کر کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۲۸۸۔

باب ۳

اشخاص کو بھی تولیدی قوت سے محروم کرنے کا طریقہ استعمال کرنا چاہیئے۔[۱] اگرچہ اکثر ملکوں میں عوام کے جذبات اور رائے عامہ کی موجودہ حالت میں اصلاح نسل کے عام پسند آئین و قوانین وضع کرنے میں بہت زیادہ آگے جانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن حکومت، معلومات کی اشاعت کر کے اور مشورے پیش کر کے اس اہم معاملے میں رائے عامہ کی کسی حد تک تعلیم و تربیت کر سکتی ہے۔

۴۔ صحت و صفائی عامہ

عوام کی معاشی کارکردگی کو برقرار رکھنے میں صفائی و صحت عامہ کا انتظام جو اہمیت رکھتا ہے اس کو جتنا بڑھا کر بیان کیا جائے کم ہے۔ ہندوستان میں طاعون، انفلوئنزا، ملیریا، چیچک، میعادی بخار وغیرہ جیسے امراض کے باعث اموات کی کثرت، معاشی حیثیت سے تباہ کن ہے؛ اس لیے کہ اس کی وجہ سے پیدائش دولت کا شیرازہ بالکل درہم و برہم ہو جاتا ہے؛ انگلستان میں گزشتہ ستر سال میں صحت عامہ کی اصلاح و ترقی کے بہت بڑے منازل طے کئے جا چکے ہیں اور ان کے نتیجے کے طور پر
96
ٹائفس، ہیضہ، تپ قرمزی، اور ڈفتھیریا (خناق دبائی) وغیرہ امراض قریب قریب نابود ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں بے پروائی، سستی اور جمود لوگوں کی امتیازی خصوصیت بن گئی ہے، اور یہ زیادہ تر خطافیہ اور ملیریا جیسے امراض کا نتیجہ ہے۔ "ملیریا اور خطافیہ، مقامی امراض کے ایک مہیب حزنیہ کے نحس اداکار ہیں اور جس اسٹیج پر یہ حزنیہ کھیلا جاتا ہے اس پر کبھی پردہ نہیں گرتا۔"[۲] یہ امراض جتنے اشخاص کو در اصل ہلاک کرتے ہیں اس سے زیادہ کو مرض زدہ کرتے اور ان کی طاقت سلب کر لیتے ہیں، اس لحاظ سے ان امراض کو نیست کر دینے سے جو معاشی فوائد حاصل ہوں گے ان کو جس قدر بڑھا کر بیان کیا جائے کم ہے۔ لوگوں کو حفظ صحت و تندرستی اور اصول صحت کی باقاعدہ اور عام تعلیم دینی چاہیئے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ صحت عامہ کے محکموں کو مزید تقویت

۱۔ دیکھو بلیکر کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۶۶ تا ۶۹۔

۲۔ لارڈ رونلڈ شے کا مقولہ۔

باب ۳

دی جائے۔ ابتدائی مصارف کثیر ہوں گے، لیکن فایدے سے خالی نہ ہوں گے، اس لیے کہ ان کے نتائج معاشی کارکردگی کو بڑھانے کی صورت میں رونما ہوں گے، اور اگرچہ یہ نتائج فوری رونما نہ ہوں گے پھر بھی بہت بڑے اور یقینی ہوں گے۔[ل]

۱۴۔ تعلیم قوم کی معاشی کارکردگی کو پوری طرح ترقی دینے کی غرض سے خاص پیشوں میں عام معلومات، واقفیت اور خاص تربیت و تعلیم ضروری ہے۔ ہندوستان میں عام اور فنی تعلیم کی حد تک ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا موضوع بحث ہے جس کی جانب ہمیں زرعی و صنعتی ترقی کی بحث کے سلسلے میں متعاقب رجوع ہونا پڑے گا۔

۲۴۔ نسلی صلاحیتیں معاشی ترقی کا انحصار جبلی نسلی اوصاف پر بھی ہے، اور بعض فرقوں میں اس کی ذرا سی بھی صلاحیت نہیں ظاہر ہوتی بعض فرقوں کی برتری اور بعض فرقوں کی کمتری کے متعلق سطحی تعمیمات سے کام لینا بہت ہی خطرناک بات ہے۔ ان تعمیمات میں سے اکثر کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ موجودہ واقعات کا خلاصہ ہیں۔ بعض مصنف محض اس بنیاد پر کہ موجودہ زمانے میں ہندوستانی معاشی و تمدنی حیثیت سے پسماندہ حالت میں ہیں یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں تہذیب و تمدن کی جن بلندیوں پر پہنچ گئی ہیں ان پر

ل۔ قوم کی صحت کے لیے مصارف عامہ، ان مصارف کے مشابہ ہیں جو محافظ جان کشتی یا آتش فرو انجن کے لیے کئے جاتے ہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتے ہیں، یعنی ایک بڑی مدت کے شغل اصل کے مشابہ ہیں۔ اس شغل اصل کا سود قطعی اور یقینی طور پر ملتا ہے اور کئی سو گونہ ملتا ہے، لیکن اس کے ملنے میں کئی سال بلکہ بعض اوقات کئی نسلیں درکار ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ مہمل سوال سننے میں آتا ہے کہ صحت عامہ کے لیے یہ تمام مصارف برداشت کرنے کا حاصل کیا ہے؟" لیکن سوال کرنے والے عام طور پر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو یہ خیال تک نہیں کرتے کہ ان کے جیسے زندہ دل، مستعد اور قابل لوگوں کی ہمارے درمیان موجودگی خود اس کا جواب ہے۔" دیکھو سالانہ رپورٹ مرتبہ صدر طبی افسر وزارت صحت انگلستان، سنہ ۱۹۲۱ء

Annual Report of the Chief Medical officer of the Ministry of Health(England) 1921

باب ۲

چڑھنے کی صلاحیت ہندوستانی جبلی طور پر نہیں رکھتے۔ علیٰ ہذا ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ایک ہندوستانی مبصر جزائر برطانیہ کے باشندوں کے متعلق اسی طرح تعمیم سے کام لے سکتا تھا کہ وہ اس زمانے میں گودے ہوئے وحشی تھے اور جنگل میں گھوما کرتے تھے جب کہ ہندوستانی اپنے اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن پر فخر کرسکتا تھا۔ اگر اس مبصر سے یہ کہا جاتا کہ ان ہی وحشیوں کے اخلاف کی قسمت میں ہندوستان کی حکمرانی لکھی تھی تو وہ اس خیال کو قابل معافی نفرت وشبہ کی نظر سے دیکھتا۔

97 بہر حال معجزہ ظاہر ہوکر رہا اور اب ہندوستانی کی باری ہے کہ وہ اپنا یہ دعویٰ ثابت کردکھائے کہ اس میں تہذیب و تمدن کی صلاحیت موجود ہے۔ تاریخ اس کے متعدد شواہد پیش کرتی ہے کہ ایک قوم نے دوسری قوم کے بارے میں مہمل اور حقارت آمیز رائے قایم کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخری زمانے میں مغربی یورپ روسیوں کو نیم وحشی خیال کرتا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ ویدرو اور دالمبیر اس بات کو ممکن ہی نہیں خیال کرتے تھے کہ روسی تہذیب و تمدن میں ترقی کرکے کبھی یورپ کے معیار تک پہنچیں گے۔ علیٰ ہذا حبشیوں کے متعلق اب بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سفید فام قوموں کے مقابلے میں مساوات کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ رہے ہندوستانی تو ان کے متعلق بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ تمام بھوری قوموں کے مثل وہ بھی مسلسل ترقی کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ وہ "عجیب وغریب حالت جمود" میں مبتلا ہیں؛[۱] جس کی وجہ سے ان پر یہ لعنت سوار ہے کہ وہ تھوڑی مدت تک ترقی کرنے کے بعد دائمی تخیلات و تصورات کی دنیا میں جا پڑتے ہیں اور طویل مدت تک ان کی حالت غیر تغیر پذیر رہتی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے متعلق اس قسم کے خیالات قایم کرنا مذموم ہوسکتا ہے تو صرف اس لحاظ سے کہ اس بدیہی واقعے کو نظر انداز کردیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کی کوئی ایک نسل یا قوم نہیں ہے بلکہ ان کی قومیت کا خمیر مختلف قوموں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات

۱؎۔ دیکھو میری ڈتھ ٹاونسنڈ کی کتاب موسوم بہ "ایشیا و یورپ" صفحہ ۹۔

باب ۳

عام طور پر معلوم ہے کہ ہندوستان کی عظیم الشان تہذیب و دولت غیر ممالک کے مہمات پسندوں کو اپنی جانب کھینچتی رہی۔ ہندوستانیوں کی موجودہ پسماندہ حالیت میں بھی مستند مبصروں کو عظمت و شوکت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مناسب موقع دیا جائے تو ہندوستانی دماغ یورپین دماغ سے ذرہ برابر بھی کمتر نہ ہوں گے۔[1] یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہندوستانی اپنا دماغ معاشی تنظیم و ترقی کے کام میں لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا اس سے متنفر ہیں۔ پس اہل ہند کو اس احساس سے مغلوب ہو کر پست حوصلہ نہ بن جانا چاہئے کہ ان میں معاشی ترقی کی صلاحیت مایوس کن اور ناقابل علاج طریقے پر ادنیٰ ہے۔

---

[1] جنرل اسمٹس نے جہانسبرگ میں ۲۶ اگست ۱۹۱۹ء کو تقریر کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔ "میں ہندوستانیوں کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھتا، بلکہ ان کی وقعت کرتا ہوں۔ ہندوستانیوں میں بعض ایسے افراد بھی گزرے ہیں جو تاریخ عالم کے مشاہیر میں سے ہیں۔ بعض ہندوستانی نسل انسانی کے ان عظیم ترین قائدوں میں شمار کئے گئے ہیں جن کے جوتے کا تسمہ کھولنے کے بھی میں لائق نہیں ہوں۔"

98

باب ۴

معاشری و مذہبی آئین و رواج

۱۔ معاشی جد و جہد پر معاشری و مذہبی آئین و رواج کا اثر

معاشی جد و جہد پر معاشری و مذہبی آئین و رواج بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں؛ چنانچہ اس باب میں ہم ہندوستان کی معاشی زندگی کی رواجی بنیاد پر بحث کریں گے اور یہ بیان کریں گے کہ ان رواجوں میں سے زیادہ اہم رواج لوگوں کی معاشی ترقی میں کس طرح مدد دیتے یا رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ کہ ہندوستان میں معاشی زندگی کی معاشری و مذہبی بنیاد خاص تحقیق چاہتی ہے محتاج توضیح نہیں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلو جس مخصوص شکل اور سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اس کا باعث ملک کے خصوصی معاشری و مذہبی آئین و رواج ہیں[۱]۔

---

[۱] ہندوستان میں لوگوں کی عمرانیاتی زندگی نے حقیت ارضی کے نظاموں اور دیہی زندگی کی تنظیم کو متعین کیا ہے؛ اور اشتراک خاندان اور ذات پات کے طریق قدیم ترین زمانے سے فرد واحد کے حقوق اس خاندان معاشرہ اور انجمن پیشہ یا تجارت کے رکن کی حیثیت سے متعین کرتے آئے ہیں جس سے وہ پیدائشی طور پر وابستہ رہا ہے۔" دیکھو ٹیکس چیٹرجی کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند" صفحہ ۵۰۔

باب ۴

۲۔ ذات پات کا طریق

ذات پات ہندوستانی معاشرے کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت ہے، چنانچہ ہم اس کی بحث کا آغاز "ذات" کی معیاری تعریف سے کر سکتے ہیں۔

ذات کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "وہ خاندانوں کا مجموعہ یا خاندانوں کا گروہ ہے جو ایک ایسے مشترک نام سے موسوم ہوتا ہے جو عام طور پر کسی خاص پیشے کو ظاہر کرتا ہے یا اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ گروہ کسی افسانوی جد یا مورث اعلیٰ کے مشترک اخلاف و وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، خواہ یہ مورث انسانی ہو یا ربانی؛ ایک ہی مقررہ پیشے یا شغل زندگی کی اتباع کا مدعی ہوتا ہے اور مستند اہل الرائے اس کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک متجانس قوم یا جماعت ہے۔ کوئی ذات اس معنی میں درون زواجیت رکھتی ہے کہ اس بڑے دائرے کا ایک رکن جو مشترک نام سے موسوم ہو اس دائرے کے باہر بیاہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دائرے کے اندر بھی عام طور پر متعدد چھوٹے دائرے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں بھی درون زواجیت اور بیاہ کی قید و بند ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ایک برہمن موجودہ زمانے میں ایسی عورت سے بیاہ نہیں کر سکتا جو غیر برہمن ہو؛ بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی بیوی کا تعلق بھی برہمن ذات کے اس ذیلی فرقے سے ہو جس میں شوہر شامل ہے اور جس سے باہر شادی نہیں کی جا سکتی"[۱]۔

ہندوستان کی ذات پات کو ان متعدد معاشری درجہ بندیوں سے ممیز کرنا ضروری ہے جو تمام قوموں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان درجہ بندیوں میں نہ تو شدید تفریق ہے اور نہ وہ متعدد فرقوں میں سختی کے ساتھ تقسیم کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں 99
کسی فرد واحد کے لیے ایک معاشری طبقے سے دوسرے میں منتقل ہونا مذہباً ممنوع بھی نہیں قرار دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا شادی بیاہ کے بارے میں بھی کوئی بندشیں نہیں ہیں اور ہر شخص اپنے حسب دلخواہ پیشے یا شغلۂ زندگی کا انتخاب کرنے میں آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ذات پات کے تحت ہندو سماج بیشمار اور ایک دوسرے سے

---

[۱] دیکھو امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد اول صفحہ ۳۱۱۔

باب

بالکل الگ چھوٹی بڑی جماعتوں میں منقسم ہے جن کے ارکان کے اعمال پر ذات بندی کے دقیق قواعد کے مجموعے کے ذریعے سے قیود عائد کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کو آپس میں بیاہ کرنے اور دوسری جماعتوں کے ارکان کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی بھی عام طور پر ممانعت ہوتی ہے، خاص کر ان لوگوں کے ساتھ جو حیثیت میں کمتر خیال کئے جاتے ہوں۔ ہندوستان میں "ولادت ہی اٹل طریقے پر انسان کے کل معاشری و خانگی تعلقات کا تعین کرتی ہے، چنانچہ زندگی بھر اس کا کھانا پینا، لباس اور بیاہ سب کام اس فرقے کے رسم و رواج کے تابع ہوتے ہیں جس میں اس نے جنم لیا ہو۔"[۵۱]

۳۔ ذاتوں کی تین بڑی قسمیں

ذاتوں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی (۱) فعلی (۲) نسلی اور (۳) فرقہ واری۔ ان میں اہم ترین فعلی ذاتیں ہیں جو ان مختلف پیشوں کی نمایندگی کرتی ہیں جو کلوں کے رواج سے بیشتر قدیم زمانے میں اختیار کئے گئے تھے۔[۵۲] فعلی ذاتوں کی مثال برہمن یا پروہت فرقے اور تجارتی ذات یا بنیے ہیں جن میں دوسرے گروہوں کے منجملہ پنجاب کے

[۵۱] دیکھو "امپریل گزیٹیر آف انڈیا" جلد اول صفحہ ۳۲۳۔ ڈاکٹر گھوریے ہندوستان کی ذات پات کی حسب ذیل اہم خصوصیات بیان کرتے ہیں:- (۱) معاشرے کی تقسیم گروہوں میں؛ (۲) مذہبی حکومت (۳) کھانے پینے میل جول پر قیود اور بندشیں؛ (۴) مختلف فرقوں کی سیول اور مذہبی پابندیاں اور ان کے خاص حقوق؛ (۵) پیشوں کے انتخاب کا فقدان؛ اور (۶) بیاہ پر قیود۔ دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" صفحہ ۲ تا صفحہ ۱۔

[۵۲] اشتراک پیشہ کو ذات پات کی واحد بنیاد بمشکل خیال کیا جا سکتا ہے؛ اس لیے کہ اگر بقول سانارٹ ایسا ہوتا تو (ذات پات کا) یہ آئین ذیلی تقسیم اور افتراق کا کمتر میلان ظاہر کرتا؛ اور شروع میں جو عنصر وجہ اتحاد تھا آخر میں بھی ایکا اور ارتباط برقرار رکھتا۔ اگر اشتراک پیشہ ذات پات کی واحد یا اہم بنیاد ہوتا تو ایک مقررہ پیشے میں کام کرنے والے سب اشخاص صرف ایک ہی ذات کے کہلاتے۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک ہی علاقے کے کل جلاہے ہمیشہ ایک ہی ذات سے تعلق نہیں رکھتے۔" دیکھو رس لے کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۶۹ تا صفحہ ۲۷۰۔

باب۴

کھتری اور راجپوتانہ کے اگروال اور راوسوال بھی شامل ہیں۔ کل فعلی ذاتوں کی تفصیل پیش کرنا تکلیف دہ اور دقت طلب کام ہے۔ ان میں جلاہے، نجار، کمہار اور زرگر جیسے دست کار، چرواہے، حجام اور دھوبی جیسے ذہی خدمت گار اور نجومی، تیلی، جانور پالنے والے اور گویئے جیسے دوسرے متعدد پیشے والے شامل ہیں۔ نسلی ذاتیں ہندوستان کے ہر گوشے میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً بنگال میں راج بنسی، چانڈال وغیرہ، صوبۂ متحدہ اور بہار میں بھار، چیرو وغیرہ، راجپوتانہ اور پنجاب میں جاٹ، جوجر اور میو، بمبئی میں کولی اور مہار؛ اور مدراس میں نائر اور پریئیان وغیرہ۔

100 فرقہ وار ذاتیں وہ ہیں جو مذہبی فرقوں سے پیدا ہوئی ہیں؛ مثلاً بمبئی کی لنگایت ذات[1] جس کا بانی مبانی ایک مذہبی قائد تھا جو برہمنوں کی سیادت کا منکر تھا۔

۴۔ ذات پات کی ابتدا۔ جیمس مل کے نظریے کے مطابق ذاتوں کی شکل میں معاشرے کی ابتدائی تقسیم کسی الہامی فرد کا کام ہوگا جس کو باقاعدہ تقسیم عمل کے فوائد کا پہلے سے علم ہوگیا ہوگا۔ جیمس مل یہ خیال کرتے تھے کہ اس امر کا باعث کہ ایک ذات دوسری ذات کے تابع تھی ایک طرف قوم کے کمزور ارکان کا توہم پرستانہ خوف اور دوسری طرف اقتدار حاصل کرنے کی پُر مکر خواہش تھی جو مذہبی پیشواؤں کی امتیازی خصوصیت ہے؛ چنانچہ یہ طبقہ اپنی حیثیت سب سے اونچی ذات کی قرار دینے میں کامیاب ہوگیا جس کی تعظیم و تکریم دوسری سب ذاتوں پر واجب تھی۔ برہمنوں یعنی مذہبی جماعت کو آسمانی بلائیں ٹال دینے اور رد کرنے کی قابلیت کا دعویٰ تھا لیکن جنگ کی تباہ کاریاں بھی کچھ کم خوف کے قابل نہ تھیں، اس لحاظ سے برہمنوں کے بعد فوجی جماعت کو اہمیت میں دوسرا درجہ حاصل ہوگیا وقس علیٰ ہذا۔[2]

ام، سانارٹ کے نظریئے کے مطابق ”ذات ان قدیم آریائی آئین اور رواجوں کی معمولی ترقی ہے، جنھوں نے یہ شکل اپنے آپ کو ان حالات کے مطابق

[1] دیکھو ان سائیکلو پیڈیا آف ریلیجن انڈ ایتھکس جلد سوم۔ ص ۲۳۱۔

[2] ” ” ” برٹانیکا گیارھواں ایڈیشن مضمون بعنوان ”ذات پات“۔

باب ۲

بنانے کی کشاکش کے سلسلے میں اختیار کرلی جن سے وہ ہندوستان میں دوچار ہوئے۔"
ام، ساناارٹ نے اس نظریے کو بڑی حد تک اس بنیاد پر قایم کیا ہے کہ ہندوؤں کی معاشرتی تنظیم یونانیوں اور رومیوں کی معاشرتی تنظیم سے ان کی قومی نشوونما کی ابتدائی حالتوں میں عام طور پر ملتی جلتی ہے اور اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ ہندوستان میں امتیازات سخت اور غیر تغیر پذیر بن گئے اور یورپ میں اس قسم کی کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔

ام، ساناارٹ کے نظریۂ ذات کے بنیادی عناصر یہ معلوم ہوتے ہیں:۔
"ایک وسیع رقبے پر آبادی کی تقسیم کی وجہ سے گروہوں کے بڑھ جانے کا میلان؛ قدیم و وحشی اقوام سے میل جول کی بنا پر نسل و خون پر فخر کرنے کی ہمت افزائی؛ رسموں کے انجام دینے کے لیے پاک صاف رہنے کا خیال جس کی بنا پر دیسی باشندوں سے تو دستی محنت کے پیشوں میں کام لیا جاتا تھا اور اس کے برعکس آریوں کے لیے اعلیٰ پیشے اور دھندے محفوظ تھے؛ مسئلہ تناسخ کا اثر جو ہر شخص کو قانون کرما کی بنا پر ایک معین حیثیت دیتا ہے؛ منتشر گروہوں کو یکجا کرنے کے لیے کسی سیاسی قوت کی عدم موجودگی؛ اور برہمنی نظام کا بتدریج ایک مستند و مستحکم حیثیت حاصل کرلینا۔"[1]

101 **۵۔ ذات کے طریقے کی سختی۔** ذات کی ابتدا اور اس کے مابعد ارتقا کے متعلق مختلف نظریوں کے بارے میں یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ سب کم و بیش ناکافی ہیں؛ اس لیے کہ وہ اس چیز کی پوری طرح توضیح کرنے سے قاصر ہیں جو خاص طور پر تشریح طلب ہے؛ یعنی ہندوستان میں ذات کے طریقے کی

[1] دیکھو رس لے کی تصنیف محولۂ بالا ۲۷۔ ذات پات کی حال کی ترقی کی توجیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جی، یس، گھوریئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت کی سخت واحد نگرانی کا فقدان، قانون اور رواج کے یکساں معیار کو نافذ کرنے کے بارے میں حاکموں کی عدم رضامندی، مختلف گروہوں کے رواجوں کے اختلاف کو درست و معتبر قرار دینے میں حاکموں کی مستعدی، ان سب امور نے جماعتوں اور گروہوں میں تفریق و اختلاف کے میلان کو اور تقویت دی اور ہر گروہ میں اتحاد اور اشتراک احساس کے جذبے کو فروغ دیا۔" ڈاکٹر گھوریئے کا یہ بھی خیال ہے کہ ورگروہوں کی کثرت اور سارے نظام کے کامل ہونے کا باعث ہندو دماغ کی

بے نظیر سختی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سختی اس وقت اور بھی زیادہ ہوگئی جبکہ بارھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے مابین مسلمانوں کے حملوں کی پے در پے موجوں کے بالمقابل اس نظام میں انجماد پیدا ہوگیا، اور اس طرح اسلام کے اساسی طور پر جمہوری اثرات کے مقابلے میں بہت ہی غیر متوقعہ طریقے پر ردعمل ہوا۔ یہ خیال کرنے کی وجہ ہے کہ اپنی نشو و نما کی ابتدائی حالتوں میں ذات کا طریقہ کم از کم پہلی تین ذاتوں کے تعلق کی حد تک سیال نوعیت رکھتا تھا۔ یہ ابتدائی سیال نوعیت ٹھیک کس طرح مفقود ہوگئی ایک ایسا عقدہ ہے کہ جو کبھی حل ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ شودر جاتی سے ابتداً جو نیچ پن منسوب کیا جاتا تھا، خواہ اس وجہ سے کہ وہ اصل و قدیم مفتوحہ قوم (دسیوں) کی نمائندہ تھی یا کسی اور سبب سے، اس نے ایک ایسے خمیر کا کام دیا ہو جو رفتار زمانہ کے ساتھ کل معاشرتی نظام میں سرایت کر گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آریوں میں مذہبی رسوم اور نذر و نیاز کو مناسب طریقے پر ادا کرنے کو جو عظیم اہمیت دی جاتی ہے اس کی وجہ سے اقتدار اس جماعت کے ہاتھوں میں مرتکز ہوگیا ہو جو مذہبی امور سرانجام دینے کے لیے مخصوص تھی، اور اس لحاظ سے یہ جماعت اس اقتدار کو اپنے ذاتی معاشرتی اغراض کی تکمیل و ترقی میں استعمال کرنے کے قابل ہوگئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ام سانارٹ کے بیان کئے ہوئے متعدد دوسرے عناصر جن کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، آخری نتیجہ پیدا کرنے میں اپنا واجبی حصہ رکھتے تھے۔ اس خیال کو تسلیم کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں معاشرے کی ایک مقررہ اور پر سکون حالت، متعدد نسلوں تک اعمال و افعال کے تسلسل کو یقینی بنا کر اور اس طرح وراثت و توارث کے اصول کو متعین کر کے ذات کی ترقی کی موئد ہوئی[1]؛ اس لیے کہ اسی کے مماثل سکونی حالات تمام یورپ میں "صنعتی انقلاب" سے پیشتر موجود تھے اور اس کے باوجود ان کی وجہ سے وہاں کوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- یہ خاصیت ہے کہ وہ مختلف اصناف و انواع قایم کرتا اور معاملات کو ان کے منطقی نتیجے تک پہنچاتا ہے، چنانچہ ہندوؤں کے ادبیات، فلسفہ اور مذہبی فرقوں کی یہی امتیازی خصوصیت ہے۔" دیکھو جی ایس گھوریے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" ص ۱۴۷ تا ص ۱۴۸

[1] ۔ دیکھو داڈیا اور جوشی کی محولہ تصنیف ص ۱۲۴ -

ایسا معاشرتی نظام رونما نہیں ہوا جو سختی کے اعتبار سے ذات کے طریق کے مقابلے میں کوئی نظیر پیش کرتا ہو۔ علیٰ ہذا اسی کے مماثل سبب کی بنا پر ہمیں اس استدلال کو ناکافی قرار دے کر مسترد کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ذرایع آمد و رفت کی غیر ترقی یافتہ حالت اور عوام کی جہالت نے میل جول میں مزاحمت و دشواری پیدا کر کے ذات کے نظام کو مضبوط و استوار بنا دیا[۱]۔ خلاصہ یہ کہ یہ توجیہات زیادہ تر اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ سختی کی جانب تحریک ایک مرتبہ شروع ہو جانے کے بعد مساعدت زمانہ سے کس طرح آگے بڑھتی گئی۔ لیکن ان سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس سختی کا آغاز کیونکر ہوا۔ پس بحیثیت مجموعی ذات کے نظام کی ابتدا و ترقی کے مسئلے کو یہ سمجھ کر ترک کر دینا چاہئے کہ وہ ایک "ناقابل حل اور بے فائدہ چیستاں ہے"۔

۶۔ ذات کے طریقے کی خوبیاں اور اس کے نمایاں کام

102 ان جاندار اصول میں سے ایک اصول جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذات پات کو حق بجانب قرار دیتے ہیں "تقسیم عمل" کا اصول ہے جو معاشی کارکردگی و قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ اکثر ملکوں میں کسی نہ کسی وقت پیشے نظری طور پر نہیں تو عملاً موروثی ہوتے تھے، اور اس توارث کے نظام سے بدیہی فوائد وابستہ ہوتے تھے، چنانچہ اس کے تحت بیٹا اپنے خاندانی پیشے کے رموز فطری طور پر حاصل کر لیتا تھا، اور کم سے کم محنت سے گھر کی پرسکون و سہولت بخش فضا میں اور باپ کی شفقت آمیز نگرانی میں اس پیشے میں ملکہ و مہارت بڑھاتا اور کمال حاصل کرتا تھا۔ یہ چیز ایسے زمانے میں خاص طور پر اہم تھی جبکہ تعلیمات عامہ کا کوئی منظم نظام نہ تھا اور دستی مہارت و مشاقی کی بہت قدردانی ہوتی تھی۔ اس طریقے میں فائدہ یہ تھا کہ باپ کو اپنے کام میں بیٹے کی امداد بہت ارزاں شرح پر ملتی تھی اور بیٹا زندگی سے آسان ترین طریقے پر روشناس ہو جاتا تھا۔ بیٹے کو دست کار کی حیثیت سے باپ کے مرنے پر اس کے اطوار، شہرت اور نیک نامی ورثے میں ملتی تھی اور یہی اس کے مال متروکہ کا اہم ترین جزو ہوتا تھا۔ پیشوں میں منتقلہ مہارت کی

[۱] دیکھو واڈیا اور جوشی کی مولفہ تصنیف صفحہ ۱۲۴ تا صفحہ ۱۲۵۔

باب

قدر و قیمت بہت زیادہ تھی اور اصول توارث اس انتقال میں مدد دیتا تھا۔ جس وقت تک اس اصول پر معقول اور فطری طریقے سے عملدرآمد ہوتا رہا اس وقت تک اس پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکتا تھا؛ لیکن جوں ہی نئے پیشے کا اختیار کرنا نہ صرف معمول سے انحراف بلکہ غلط اور قابل سزا قرار پایا اس وقت سے اس طریق کے ناقابل اعتراض ہونے کی صورت زائل ہو گئی۔[1]

فعلی یا خدمتی ذاتوں کا مقابلہ عام طور پر یورپ کے دور وسطیٰ کے "حرفتی جتھوں" سے کیا گیا ہے اور ان کو اس لحاظ سے مفید خیال کیا گیا ہے کہ وہ مشترکہ دھندوں سے پیدا ہونے والے باہمی بندھنوں کی شناخت کو فروغ دینے والا ذریعہ تھا۔ یورپ کے قدیم حرفتی جتھوں کی طرح یہ بھی اپنے ارکان کے لیے باہمی رفاہ کی انجمنوں کا کام انجام دیتی تھیں؛ مثلاً کار آموزوں کی تربیت کرنا، ارکان میں ہمدردی پیدا کرنا، نزاعی امور کے تصفیے کے لیے ثالثی کی عدالتیں مہیا کرنا، اپنے ارکان کی اجرت اور نفع کی تنظیم کرنا اور گاہ گاہ مصیبت و تکلیف میں ان کی مدد کرنا۔[2] "غرض ذات کا نظام ہندو کے لیے کلب، مزدور سبھا، رفاہی انجمن اور آدم دوست جمعیتہ کا کام دیتا تھا۔"[3] لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یورپ کے حرفتی جتھے، ذات کے طریقے سے بعض اہم اعتباروں سے مختلف تھے۔ اولاً یہ کہ حرفتی جتھا ارادی اور خود اختیاری ساجھا تھا، اور ذات پات میں یہ بات نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ گو حرفتی جتھوں کے ارکان کے لڑکوں کو کار آموزوں کی حیثیت سے بہت سہولتیں حاصل تھیں، پھر بھی ان جتھوں کے بگڑ کر اجارہ دار سبھاؤں کی حیثیت اختیار کرنے سے پیشتر تک دوسروں کو بھی مشروط طریقے پر داخل کر لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں آپس میں بیاہ کرنے کی اجازت تھی اور یہ خالصاً معاشرتی اثر و احساس کا معاملہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں کسی خاص

۱۔ دیکھو ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی محولۂ بالا عبارت۔

۲۔ دیکھو چیٹرجی کی تصنیف محولۂ بالا ص ۹۲

۳۔ دیکھو بیس، نو کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کا تصور" ص ۲۶۳۔

باب ۴

ذات میں داخل ہونا بالکل توارث کا معاملہ ہے، اور آپس میں بیاہ کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کے حرفتی جتھوں کی حد تک وہ مشترک 103
پیشہ ہی اصل بندھن تھا، جو آخرکار امیر اور بادشاہوں کے خلاف متحد کرنے والا قوی ذریعہ تھا اور ہندوستان کی ذاتوں کی طرح نفاق و کمزوری کی علامت نہ تھا۔" بعض مصنفوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ممکن ہے کہ دور وسطیٰ کے یورپ کے حرفتی جتھوں کی طرح ذاتوں نے صنعت و حرفت کو ترقی و فروغ دیا ہو" اور یہ کہ "اس نظام نے دست کار جماعتوں کی عجیب و غریب میکانکی مہارت و ہنرمندی کو غیر ملکی مسابقت کی زد سے محفوظ و قائم رکھا ہو۔"[۱] گو اس نقطۂ خیال میں یقیناً کسی حد تک صداقت ہے، تاہم یہ بھی قطعی ممکن ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندوستانی حرفتوں کی امتیازی خصوصیت یعنی زمانے کے حالات کے مطابق چلنے اور ترقی کرنے میں کوتاہی کا باعث ذات کے طریقے کی قید و بند ہو جس نے فطری ترقی میں لازمی طور پر رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔[۲]

ذات پات کی حمایت میں اس امر کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ آریوں کے حملے کے زمانے میں اسی نے مختلف قوموں کے تعامل اور مختلف تہذیبوں کے باہمی عمل میں مدد دی۔[۳]

۱۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۲۶۔

۲۔ "حرفتی جتھا پھیل سکتا اور ترقی کر سکتا ہے؛ وہ صنعت کارانہ جذبات کو ابھرنے کا پورا موقع دیتا ہے؛ چنانچہ یہ حرفتی جتھوں کا اتحاد ہی تھا جس نے دور وسطیٰ کے آزاد شہر پیدا کئے۔ لیکن ذات ایک گھٹیا قسم کا نظام ہے؛ وہ امتیاز و تفریق کے ذریعے ترقی کرتا ہے لہذا اس کی ترقی کا ہر قدم، اس کی ترقی کرنے یا اس صنعت کا تحفظ کرنے کی قوت کو جس پر عمل کرنے کی وہ مدعی ہے ضعیف کر دیتا ہے۔" دیکھو رسلے کی محولۂ بالا تصنیف، ص ۲۸۰

۳۔ ذات کا طریقہ دراصل نہ آریائی نظام ہے نہ ڈراویڈی، بلکہ اس کو زمانے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جبکہ مختلف قسم کی قوموں کو آپس میں مل جل کر رہنا پڑتا تھا رائج کیا گیا۔ ایک ایسی قوم کی تہذیب و شائستگی کو محفوظ کرنے کا واحد طریقہ جس کے لیے اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ وہ دیسی باشندوں کی کثیر تعداد کے ادہام میں جذب ہو جائے گی، یہ تھا کہ اس زمانے کی تہذیب و نسل کے اختلافات کو فولادی بندھنوں سے سختی کے ساتھ

اس طریق نے ہندو سماج کو غالباً اس قابل بھی بنایا کہ خود کو تباہی میں مبتلا کئے بغیر سیاسی حملے کے صدمات برداشت کرے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ذات کے طریقے نے ہندو سماج کی اساسی ثبات پذیری وقناعت گزینی کی جانب رہبری کی۔ کچھ سال ادھر تک ہندوستان میں کسی شخص کی حیثیت اور اس کے پیشے کا تعین سراسر اس کی ولادت کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کی بدولت وہ اس پریشانی اور بے چینی سے محفوظ رہتا تھا جو موجودہ معاشرے میں پیشے کے انتخاب میں لاحق ہوتی ہے۔ چونکہ کسی شخص کے پیدا ہوتے ہی اس کے پیشے کا تعین ہوجاتا تھا، اس لیے وہ رشک وحسد کی زد سے اور مقاصد میں ناکامی ومایوسی اٹھانے سے محفوظ رہتا تھا۔

۷۔ ذات کے طریقے کی حمایت اس کی موجودہ شکل میں نہیں کی جاسکتی

لیکن ذات کے طریقے کی موافقت وتائید میں جو کچھ کہا جاسکتا ہے اس کا اطلاق صرف اس زمانے پر ہوتا ہے جبکہ اس طریقے میں ویسی گڑبڑ اور بدنظمی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اب پائی جاتی ہے۔ ذات اپنی موجودہ متبدلہ حالت میں صرف غیر مشروط مذمت کی مستحق ہے۔ یہ ہر جہتی ترقی کے راستے کی ان عظیم مزاحمتوں میں سے ایک ہے جس کو انسان کی گمراہ ہنرمندی نے خود اپنی تباہی
کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کی ابتدائی خوبیاں خواہ کچھ ہی ہوں، موجودہ زمانے میں 104
تو وہ بگڑ کر ظلم وتعدی اور عدم رواداری کا ایک زبردست آلۂ کار بن گئی ہے
اور ایسی مذموم قوت کی حیثیت رکھتی ہے جو معاشرتی وسیاسی تفریق واختلاف
اور کمزوری پیدا کرتی ہے[۱] اگر موجودہ زمانے میں ہندوستانی قومیت کی یہ تعریف

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ دبایا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے 'یہ طریقہ جو نظام معاشرت کو تباہی وہلاکت سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا آخر کار اس نظام کی ترقی میں سدراہ بن گیا۔"

دیکھو رادھا کرشنن کی کتاب "ہندوستانی فلسفہ" جلد اول صد ۱۱۲ تا صد ۱۱۳

۱۔ کسی ضلع یا شہر کی آبادی مختلف قوموں کا مجموعہ ہے جو تقریباً نوعی فرق رکھتی ہیں اور ایسے انسانوں پر مشتمل ہے جو نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ کھا اور پی سکتے ہیں اور نہ آپس میں بیاہ کرسکتے ہیں۔ یہ کہنا

کرنا بجا ہے کہ وہ رنگ برنگ دانوں کی ایک مالا ہے جو ایک رشتے میں منسلک نہیں ہے تو اس کا باعث بہت بڑی حد تک ذات کے طریقے کا عملدرآمد ہے۔ ہندوستان میں ذات پات نے ایک طاقتور قومیت کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا کی؛ اس کے برخلاف دوسرے مقامات میں ایک مشترک علاقے میں رہنے سہنے والے مختلف باشندوں کے بے روک ٹوک میل جول نے ایک زبردست قومیت کو فروغ دیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑی سیاسی مشکل ہے جس میں ہندوستانی موجودہ زمانے میں مبتلا ہیں اور ماضی میں بھی یہ عام طور پر سیاسی کمزوری کا سبب رہی ہے۔ چنانچہ پروفیسر جادو ناتھ سرکار کے اس استدلال میں بہت کچھ قوت ہے کہ مرہٹہ سلطنت کے زوال کا باعث بڑی حد تک ذات کے ڈھکوسلے کی غیر مفید ترقی تھی۔ ہندوستانیوں کے لیے سیاسی آزادی کے بغیر اپنی معاشی مراد تمام و کمال حاصل کرنا غیر ممکن ہے؛ اور ذات پات، سیاسی سوراج حاصل کرنے کی راہ میں بلاشبہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۸۔ درون زواجیت اور نسل کا بگاڑ

"ذات کے طریقے کی موافقت میں جو امور پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بعض اعلیٰ درجے کے نسلی سلسلوں کو خالص حالت میں محفوظ رکھتا ہے، اور یہ کہ تنہا ہندوؤں کی قوم ہی نے غیر مخلوط حالت برقرار رکھنے کے طریقے اختیار نہیں کئے ہیں بلکہ دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسری جگہ درون زواجیت یا ذات کے دائرے کے اندر شادی کرنے کا طریقہ اس قدر شدت کے ساتھ نہیں پایا جاتا جتنا کہ ذات کے طریقے میں پایا جاتا ہے۔"

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ مبالغہ نہ ہوگا کہ ذات کے طریقے اور برطانوی نظم و نسق کے اثر کی وجہ سے انسانوں میں زندگی کے طبیعی تعلقات کی حد تک اتنا ہی کم اشتراک پایا جاتا ہے جتنا کہ حیوانیاتی باغ کے ساکنوں میں" دیکھو ہاپ خانلڈ فلر کی محولۂ بالا تصنیف۔ گو اس بیان میں صورت حال کو کسیقدر مبالغے کے ساتھ اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانی آبادی کی غیر معمولی طور پر غیر متجانس نوعیت کا باعث بڑی حد تک ذات پات ہے۔

باب ۷

چنانچہ اس کی وجہ سے ایک ہی دائرے کے اندر خاندانوں کا دائمی اختلاط ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اعلیٰ درجے کے نسلی سلسلوں میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں گو بعض ذاتوں میں مردوں کی زیادتی اور بعضوں میں عورتوں کی کثرت ہے لیکن ذات پات جنسی مساوات کے حصول میں مزاحم ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک ذات کی کمی کو دوسری ذات کی زیادتی سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہی ایک حد تک اس معاشری خرابی کی ذمہ دار ہے کہ بھاری جہیز دیا جاتا ہے اور بعض مقامات مثلاً پنجاب میں اب تک طفل کشی رائج ہے۔

105 **۹۔ ذات پات استعداد اور فعل کی مطابقت میں مزاحم ہے**

ذات پات کے سب سے زیادہ شدید نقائص میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جبلی قابلیت اور جد و جہد میں ایسی مطابقت و مناسبت پیدا ہونے میں حائل رہتی ہے جو معاشی ترقی و خوش حالی کے لیے ایک اساسی عنصر ہے۔ اگر کسی قوم کو محض پیدائش کے امر اتفاقی کی بنا پر اور بلا لحاظ اس کے کہ ان کے طبائع و اوصاف کیا ہیں مختلف حلقوں میں سختی کے ساتھ تفریق کر کے تقسیم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ان کو اس پیدائشی حق سے محروم کر دیا جائے کہ وہ اپنے فطری اوصاف اور قابلیتوں کو انتہائی ممکنہ حد تک ترقی دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس قوم کو وہ سب سہولتیں عطا کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے جو بصورت دیگر قومی دولت و خوش حالی کے ذخیرے میں اضافہ کرتیں۔ ہم نہیں جانتے کہ نامناسب کاموں پر اشخاص کو مقرر کر کے لوگوں کی معاشی جد و جہد کو کس قدر نقصان پہنچایا جا رہا ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے سب کو مساوی مواقع نہیں ملتے۔[۱]

۱۰۔ محنت و اصل کی عدم نقل پذیری

ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ ذات پات، اصل و محنت کی آزادانہ نقل پذیری میں مزاحم ہوتی ہے۔ محنت کی نقل پذیری میں یوں مزاحمت ہوتی ہے کہ نقل مقام یا نقل پیشہ وقت طلب بنا دیا گیا ہے، جیسا کہ دستی صنعتوں کے قدیم طریقے کے تحت ہوتا تھا، دست کار

[۱] دیکھو پی، ڈی، کیتکر کی کتاب موسوم بہ "معاشیات ہند"

باب

اپنا ذاتی اصل لگاتا ہے، اس لیے محنت کی عدم نقل پذیری کے معنی لازمی طور پر اصل کی عدم نقل پذیری کے بھی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ طریقہ سخت غیر مسابق جماعتیں قایم کرنے کا موقع بھی بہم پہنچاتا ہے؛ چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر بعض پیشوں میں افراد کی ضرورت سے زیادہ تعداد پائی جاتی ہے اور بعضوں کو بے جا فائدہ پہنچ جاتا ہے جو ذات کی دیواروں کی آڑ میں استواری کے ساتھ پناہ گزیں ہوتے ہیں اور یہ دیواریں ان کو بیرونی مسابقت سے مصنوعی طریقے پر محفوظ رکھتی ہیں۔

۱۱۔ ذات کا طریقہ بڑے پیمانے کے کاروبار میں سد راہ ہے۔

ذات کا طریقہ بڑے پیمانے کے کاروبار کی راہ میں مختلف طریقوں سے مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ کسی خاص قسم کی محنت کی رسد و طلب میں بہ سرعت توازن قائم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ذات کا طریقہ، عمل کی نازک تقسیم در تقسیم کا مخالف ہے جو موجودہ زمانے کی بڑے پیمانے کی پیدائش کی امتیازی خصوصیت ہے۔ علاوہ ازیں ذات پات کی وجہ سے عقل و ذہانت، دستی محنت اور اصل کو یکجا کرنا دشوار ہے، جو عام طور پر ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور ہر ایک جداگانہ ذاتوں سے تعلق رکھتا ہے[۱]۔ اس پر طرہ یہ کہ صَرف، مقامی اور فرقہ واری ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ہر ذات دوسری ذات سے اپنے طرز بود و باش میں غذا، لباس آلات و ظروف وغیرہ کے گوناگوں اختلافات کی وجہ سے ممیز اور ممتاز ہوتی ہے۔ پس بہت سی مختلف قسموں کی اشیا تیار کرنی پڑتی ہیں، لیکن ہر شے چھوٹے پیمانے پر تیار ہوتی ہے[۲]۔ نتیجہ یہ کہ

[۱] ہندوستان کی قدیم سرمایۂ مشترک کی بنک کاری کی ناکامی کا سبب منجملہ دوسرے اسباب کے یہ واقعہ قرار دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے اس زمانے کے حالات کے تحت کامیابی کے لیے جو چیزیں مؤید ہو سکتی تھیں ان میں سے ایک عام طور پر مفقود تھی اور وہ یہ کہ بنک امکانی طور پر ایسے اشخاص پر مشتمل ہونا چاہئے جو ایک ہی ذات سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ اس کا کاروبار پرسکون و پرامن طریقے پر چل سکے۔

[۲] تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ استدلال اس وقت بڑی حد تک کمزور ہو جاتا ہے جبکہ بعض ارکان کی تعداد

باب ۷

گو ملک بڑا اور وسیع ہے، پھر بھی پیدائش دولت کا پیمانہ چھوٹا ہے جس کی وجہ سے بڑے پیمانے کی پیدائش کے کفایات کا حاصل کرنا دشوار رہا ہے۔ ایک اور چھوٹی سی 106
بات یہ ہے کہ معاشرے کے نیچ طبقوں کے معاشی حالات کی اصلاح و ترقی ہمیشہ معیار زندگی کی ترقی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ اس کا موقع ہی نہیں ہوتا کہ نیچ طبقے اونچے طبقوں میں داخل کر لیے جائیں اور اس طرح تقلید کے اثر سے موخر الذکر کا اعلیٰ معیار زندگی اختیار کر لیں۔

۱۲۔ ذات کا طریقہ اور محنت کا وقار۔ ذات کا طریقہ اونچی ذاتوں میں بعض ایسے پیشوں اور محنت کی شکلوں سے نفرت کرنے کا میلان پیدا کرتا ہے جو نیچ طبقے معمولاً سر انجام دیتے ہیں۔ اس طرح یہ طریقہ ان کو اپنی معاشی حیثیت و حالت کی اصلاح و ترقی سے باز رکھتا ہے اور اس خرابی کی جڑیں مضبوط کر دیتا ہے جو بعض نام نہاد شریف پیشوں میں افراد کی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ کے لوگوں کو محنت کے وقار کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے، یعنی میلان یہ نہیں ہے کہ کام کو بہت بڑا درجہ دیا جائے بلکہ یہ کہ اس کو کم کیا جائے اور زیادہ مساوی طریق پر تقسیم کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر شخص اپنی مادی خوش حالی کو ترقی دینے کی غرض سے اپنے حسب دلخواہ پیشہ اختیار کرنے کی کامل آزادی رکھتا ہے؛ بحیثیت مجموعی کسی قسم کی دیانتدارانہ محنت کو بذاتہ ذلیل و حقیر نہیں خیال کیا جاتا اور آبائی پیشے کے ماسوا کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی وجہ سے کوئی شخص ذات سے باہر نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا حقہ پانی بند کیا جاتا ہے۔ یہ چیز محنت و اصل کی نقل پذیری کو ترقی دیتی ہے اور معاشی کارکردگی و قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ ذات پات میں ایک اور نقص ان میلانات کی موجودگی سے رونما ہوتا ہے جو زرعی و صنعتی پیدائش میں اصلاح و ترقی کے بعض طریقوں کو استعمال کرنے کے خلاف پائے جاتے ہیں؛ چنانچہ ہڈی، مچھلی اور فضلہ کو زرعی زمین کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے جیسا کہ بعض ذاتوں میں پایا جاتا ہے۔

اکثر ذاتوں کو اعتراض ہے۔

۱۳۔ ذات کا طریقہ اصول مساوات کے خلاف ہے

ذات کا طریقہ، مساوات کے فائدہ رساں اصول کی نفی کرتا ہے اور اونچی اور نیچی دونوں ذاتوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ اول الذکر میں برتری کا غلط اور گمراہ کن احساس پیدا کرتا ہے اور موخرالذکر میں ایسی دماغی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو خودداری کے نشوونما کے لیے مہلک ہے۔ اس کی انتہائی مثال نیچ یا اچھوت طبقے پیش کرتے ہیں جو ناشنیدہ محکومیت سے سرنگوں ہیں اور متعدد معاشرتی و معاشی پابندیوں اور مجبوریوں میں مبتلا ہیں۔ اس طریق کا بدنصیب شکار و معمولی تجارتی کاروبار میں ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ کسی ایسی دوکان میں داخل ہونے یا ایسی سڑکوں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوتا جہاں دوکاندار رہتے ہیں۔ معاشرے سے اخراج یا حقہ پانی بند کرنے کا طریقہ اس قدر مبتذل اور قدیم ترین زمانے سے رائج چلا آرہا ہے کہ اس کی وجہ سے جوانمردی، آزادی اور اپنی آپ مدد کرنے کی صلاحیت میں فطرتاً بہت بڑی مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔[1]

۱۴۔ ذات پر مغربی تہذیب کا اثر۔

مغربی خیال کا اثر اس قدر پھیل گیا ہے اور تہذیب و تمدن کے
107 جدید آلات (یعنی ریلوں) کا جال اس قدر وسیع پیمانے پر بچھ گیا ہے کہ وہ ذات پات کے قید و بند کو کسی حد تک توڑ رہا ہے۔ بیرونی دنیا سے گاؤں کے الحاق اور تجارت و جدید صنعت کی ترقی کے باعث اشخاص کی بڑی تعداد اپنے قدیم روایتی پیشوں کو ترک کرنے اور نئی نئی گرنیوں، معدنوں اور نئے کارخانوں میں کام حاصل کرنے میں فائدہ اور سہولت محسوس کر رہی ہے۔ اونچی ذات کے ارکان معاشی حالات کے دباؤ کی وجہ سے ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جو اب تک بالکل نیچ طبقوں کے لیے مخصوص تھے۔ مثلاً اکثر برہمن خیاطی، تجارت اور دوکانداری وغیرہ

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ (Moral and Moterial Report) (اخلاقی و مادی ترقی کی کیفیت) شایع شدہ ۱۹۲۳ء

باب ۲

پیشوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے پیشہ اب ذات کی یقینی علامت نہیں رہا۔ ریلوں کے ذریعے سے سیاحت کرنے کی ضرورت نے غذا، لباس اور میل جول کی بعض بندشوں کو کمزور کر دیا ہے، اور اس عمل کو مغربی تعلیم نے اپنے مساوات قائم کرنے والے میلانات کے ذریعے سے مزید تقویت پہنچائی ہے[1]

مغربی تعلیم و تہذیب، جامعاتی و کلیاتی زندگی جہاں نیچ ذات کا آدمی اونچی ذات والے کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا ہے، بڑے شہروں کی ترقی،

---

[1] دوسری ذاتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ملنے کے متعلق قواعد کا انحصار رسمی نجاست کے اس مابعد الطبیعی نظریئے پر ہے جس میں متعدد مستثنیات کو تسلیم کیا گیا ہے؛ چنانچہ منو کے زمانے سے یہ بات تسلیم کی گئی ہے، کہ ایک عابد و زاہد مسافر کے لیے جب فاقے کا خطرہ ہو تو اس کو اپنی ذات کے قید و بند کو ترک کر دینا چاہیئے اور بہترین طریقے سے جو ممکن ہو بھوک رفع کرنی چاہیئے۔ موجودہ زمانے میں اور خاص کر ریلوں کی ایجاد کے بعد سے اس سہولت بخش اصول کو برہمن اجتہادیئین نے کدوکاوش کے بعد ترقی دی اور مرتب و مدون کیا ہے۔ مثلاً ایک زمانۂ دراز سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ مٹھائیوں کو جو ایک عام اور لچکدار اصطلاح ہے اور جس میں وہ سب متفرق غذائیں شامل ہیں جو ریلوے کے پلیٹ فارم پر بکتی ہیں، تقریباً کسی شخص سے بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اسٹیشن پر گاڑی ٹھیرنے کے قلیل وقفے میں تیسرے درجے کے ڈبے کی کھڑکی سے مٹھائی کے خوانچہ والوں کی ذات کے بارے میں مفصل تحقیق نہیں کی جا سکتی، چنانچہ ایک جدید کہاوت اس صورت حال کا خلاصہ اس عملی سوال میں پیش کرتی ہے کہ "اس نے جو کھانا تمھیں دیا، تم نے کھا لیا پھر اس کی ذات دریافت کرنے سے کیا حاصل"؟ اسی اصول کے لحاظ سے دانشمند آدمی بہت جلد اس بات کو فراموش کر دیتا ہے کہ برف بھی پانی ہی سے بنایا گیا ہے اور یہ کہ "سوڈا واٹر" چالاکی سے بنائی ہوئی بوتل میں داخل ہونے سے پیشتر معمولی پانی تھا اور گنگا سے لازمی طور پر براہ راست نہیں لایا گیا؛ بعض ست، جو ہر اہ رنچوڑ جو طبی اغراض کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں گائے کے گوشت کا ایک معین تناسب رکھتے ہیں اور یہ کہ بعض درآمدہ بسکٹ اپنی تیاری کے زمانے میں لازمی طور پر ہر قسم کے بے ذات لوگوں کے ہاتھوں میں سے گزرے ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ اس قدر غیر دانشمند بھی نہیں ہے کہ یہ سوال کرے کہ کتنے قدم کے فاصلے پر اس کا ہمسایہ نجاست پیدا کر سکتا ہے جبکہ وہ بہر صورت مسلسل بارہ گھنٹے ریل کے ڈبے میں اس کے دوش بدوش بیٹھتا ہے۔" دیکھو

حکمراں قوم کا اثر، اور تشکیک کے جذبے کی ترقی، یہ سب چیزیں ذاتوں کے قیود کو
نیست کر رہی ہیں۔ ایک جانب وہ اونچی ذاتوں میں اپنے خاص حقوق پر اصرار
کرنے کے میلان کو کم کر رہی ہیں تو دوسری جانب نیچ طبقوں میں یہ میلان پیدا
کر رہی ہیں کہ وہ اونچی ذاتوں کی اعلیٰ حیثیت کو بلا چون و چرا تسلیم نہ کریں۔ علاوہ ازیں
اس وقت صرف ایک قانون ہے جس کا اطلاق بلا امتیاز و تفریق ادنیٰ و اعلیٰ
103 پر یکساں طور پر کیا جاتا ہے، اور حکومت اب اعلیٰ ذاتوں کے دعووں کی
حوصلہ افزائی نہیں کرتی اور نہ سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ان کی ماموری
کی مؤید ہے[1]۔ اس کے برخلاف اب تقررات میں نیچ ذات والوں کو ہی ترجیح
دی جاتی ہے، اور ایک طرح بدذات کے معکوس طریق کو رواج دیا جا رہا ہے۔
نیچ ذات والوں میں خودداری کی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ متحدہ قومی عمل کے
ذریعے سے اپنی قدیم پابندیوں اور معذوریوں کو رفع کرنے کی ضرورت سے
واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ میلان نیچ حلقوں میں سے سب سے
ادنیٰ طبقے یعنی مہاروں میں بھی ظاہر ہوا ہے جو اپنے حقوق منوانے کے لیے
منظم مساعی عمل میں لا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندو مسلم کشیدگی، قدامت پسند
ہندوؤں کو بھی معاشری اصلاح و مساوات کے خیالات کے اثر کے بہت
زیادہ تابع بنا رہی ہے۔ چنانچہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ قوم کی حیثیت سے
ہندوؤں کے وجود ہی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی اندرونی تنظیم
کریں، جس کے معنی دوسرے امور کے منجملہ یہ ہیں کہ ذات پات کو نیست
کر دیا جائے یا یہ کہ اس میں کم از کم اس طرح تغیر و تبدل کر دیا جائے کہ
موجودہ شکل باقی نہ رہے۔ متعدد ہندو قائدوں نے ذات پات کے خلاف
جہاد شروع کر دیا ہے، چنانچہ گاندھی جی نے ایک تحریک شروع کی ہے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ رسؔ لے کی تصنیف صـ۲۷۹ تا صـ۲۸۰۔

[1]۔ ذات پات کے بارے میں برطانوی حکومت کے تغیر پذیر طرز عمل کی بابت اور عام برطانوی حکمرانی کے اثر کی نسبت دیکھو جی، یس گھوریے کی تصنیف محولۂ بالا صـ۱۸ تا صـ۱۶۲۔

باب ۴

جس کا رخ چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کی جانب ہے۔[۱]

۱۵۔ ذات پات کی اندرونی قوت

لیکن اس سب کے باوجود یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ذات پات مردہ ہو چکی ہے۔ بدقسمتی سے اس کی گرفت اب بھی پوری طرح سخت ہے اور اس کے اثر میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ ہندوستانی
دماغ پر اس کا تسلط اس درجہ قوی ہے کہ وہ مسلمان جیسی قوموں پر بھی اثر انداز
ہوئی ہے جن کے مذہب نے اپنے پیروؤں میں کامل مساوات پر بہت
خاص طور پر زور دیا ہے۔ حالیہ واقعات نے ذات پات کے بعض نقائص
کی جڑیں بظاہر بہت مضبوط کر دی ہیں؛ خاص کر جدید اصلاحات نے
مختلف قوموں کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد کا موقع بہم پہنچا کر
ان کے درمیان ناخوشگواری اور حسد و عناد کو بڑھا دیا ہے۔ نیچ طبقوں میں
عام بیداری پیدا ہونے کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے؛ اگرچہ یہ اکثر صورتوں میں
ایک خوشگوار ترقی ہے؛ پھر بھی عملاً بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی شخص کی اپنی
ذات سے گہری الفت کے معنی یہ ہیں کہ اونچی ذاتوں سے سخت متعصبانہ تنفر
کیا جائے اور اس طرح اونچی ذاتوں کے خلاف قدیم کینہ و بغض کی پرورش
کرنے میں بہت کچھ قوت ضایع ہو رہی ہے۔ اصلاحات نے جو جدید حقوق 109
لوگوں کو عطا کئے ہیں انھیں بسا اوقات وسیع قومی اغراض کو نظر انداز کرکے
تنگ نظری کے ساتھ فرقہ وارانہ اغراض کی تکمیل میں عام طور پر غلط طریقے سے
استعمال کیا جاتا ہے؛ اور مختلف ذاتوں سے جو ترقی یافتہ تنظیم اور تقویت یافتہ
احساس خود ادراکی و بیداری رکھتی ہیں؛ مستقل سیاسی بلکوں کے تیار نظام کے

۱۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے اس فیصلے نے جس کا اعلان حال ہی میں کیا گیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت ہندو دھرم سے ہٹ جائیں گے اور دوسرا کوئی ایسا مذہب اختیار کر لیں گے جو دھرم پلٹ ہریجنوں سے مساوات کے برتاؤ کا وعدہ کرے، ہندوؤں کو تیز و تند غور و فکر میں ڈال دیا ہے؛ اور کٹر ہندو مت کی ذات پات کی مورچہ بندیوں پر نہایت غیر متوقعہ سمتوں سے شدومد کے ساتھ حملے کئے جا رہے ہیں۔

باب ۳

طور پر کام لیا جاتا ہے۔ گو مختلف ذاتیں اپنے سے اونچی ذاتوں کے خلاف آزادانہ طور پر حکایات و شکایات کا دفتر کھولتی ہیں، لیکن وہ اپنے سے نیچی ذاتوں کے ساتھ کامل مساوات کے شرائط پر سلوک کرنے کے لیے عام طور پر تیار نہیں ہیں۔ اکثر سطح سازوں کی طرح وہ اپنے سے اوپر کی ذاتوں کو اپنی سطح کے برابر لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان سے نیچے کی ذاتیں ان سے بڑھ کر ان کی سطح کے برابر آجائیں۔ یہ صحیح ہے کہ برہمنیت ہر جگہ مدافعانہ کارروائی کرتی ہے، لیکن برہمنیت کا جذبہ اب بھی قائم و برقرار ہے اور ادنیٰ ذاتوں میں نفوذ کر گیا ہے۔

۱۶۔ ذات پات کی خرابیوں کا علاج۔ جب کوئی شخص ذات پات کی خرابیوں پر غور کرتا ہے تو وہ دل ہی دل میں کڑھتا ہے کہ کاش کوئی طاقت ور اور نیک نہاد آمر مطلق پیدا ہوتا جو موجودہ معاشری عمارت کو مسمار و منہدم کر دیتا اور اس کو زیادہ معقول طریقے پر از سر نو تعمیر کرتا لیکن کسی آمر مطلق کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے اور یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کسی آمر مطلق کو کبھی اتنا زبردست اختیار و اقتدار حاصل ہوگا یا نہیں جس کی مدد سے وہ ذات کے طریقے کو نیست کرنے کے عظیم کام کو انجام دے سکیگا۔ ہندوستان کے ذات کے طریقے کو مٹانے کے لیے ایک بہت بڑے پیمانے پر معاشری انقلاب کی ضرورت ہے جو انقلاب فرانس سے بدرجہا زیادہ وسیع اور اس سے بدرجہا زیادہ متغیر کرنے والی قوت رکھتا ہو۔ لیکن اس قسم کا انقلاب بہ مشکل ممکن ہے۔ کوئی ایک ذات نہیں ہے جو تنہا اس کی قیادت کے لیے کافی قوت رکھتی ہو اور کوئی ایک دشمن نہیں ہے جس کا مقابلہ کیا جائے۔ ہر ذات اپنے سے اونچی ذات کی مخالفت کرے گی۔ اس کی مثال ایسی جنگ کی ہوگی جو ایک غیر موجود فوج ایسے دشمن کے خلاف لڑے جو کسی مقام پر موجود نہ ہو، اس لیے کہ یہ دشمن ہر جگہ موجود ہے۔ اس طرح ہمیں اس پامال و غیر دلچسپ نتیجے پر آنا پڑتا ہے کہ تعلیم کی ترقی اور بصیرت و عام روشن خیالی کے پھیلنے کا انتظار کرنا چاہیئے، تاکہ وہ ذات کے طریقے کو بے ضرر بنانے کے لیے اس کا شیرازہ

باب ۷

درہم برہم کر دے۔ ہم مزید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خاص کر طبقۂ اناث میں روشن خیالی کا پھیلنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ عورتوں کی جہالت اور ہٹ ان کو قدیم رواج اور بندشوں کا سختی سے پابند رکھتی ہے۔ اسی طرح یہ نہایت اہم و ضروری ہے کہ دیہات میں روشن خیالی پھیلے، اس لیے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جس کی آبادی کا بیشتر اور غالب حصہ دیہاتی ہے، اصلاح کی انتہائی سخت مخالفت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ [ل]

۱۷۔ اشتراک خاندانی کا طریقہ

ایک اور امتیازی خصوصیت جس کو ہندو سماج کی معمولی حالت تصور کیا جا سکتا ہے "مشترک اور ان بٹے خاندان" کا طریقہ ہے۔ مغربی ممالک میں خاندان، عام طور پر ایک بیوی، ایک شوہر اور ان کے نابالغ بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان 110 میں کسی وقت مقررہ میں غالباً تین تین نسلیں متعدد لاحقین اور رشتہ داروں کے ساتھ یکجا رہتی سہتی ہیں اور ایک ہی خاندان شمار ہوتی ہیں۔ غیر منقسم ہندو خاندان نہ صرف املاک کے لحاظ سے بلکہ غذا اور عبادت کے لحاظ سے بھی عام طور پر مشترک ہوتا ہے۔ خاندان کا رواج، بیاہ، تبنیت و کفالت کی حد تک ہندو قانون اور خاص کر قوانین وراثت و توارث کا سنگ بنیاد ہے۔

۱۸۔ اشتراک خاندانی کی ابتدا

اشتراک خاندانی کی ابتدا عمرانیات دان عام طور پر اس ترقی سے منسوب کرتے ہیں جو تمدن نے معاشی نشوونما کی ایک منزل گلہ بانی سے زرعی اور صنعتی منزلوں میں جانے میں کی۔ جس وقت شکار کرنے اور جڑیں کھودنے کی منزل کی جگہ ترقی یافتہ زراعت نے لے لی اس وقت انسان کی محنت، زمین جوتنے، مکان بنانے اور مال متروکہ کی نگہداشت کرنے میں خاص طور پر اہم ہو گئی۔ اس وقت معاشی عمل میں مرد کی حیثیت سب سے

ل۔ ہندوستان کی ذات بندی کی تشریح کے مختلف طریقوں کی دلچسپ بحث کے لیے ناظرین کو ڈاکٹر ایس۔ جی گھوریے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں ذات اور نسل" صہ ۱۴۲ تا صہ ۱۸۵ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

باب ۴

بڑے عامل کی تھی، چنانچہ اسی لیے ہم ابوّتی خاندان پاتے ہیں[۱]، معاشی اسباب کو قرابت کے قوی احساس سے اور ایک ایسے مذہب سے مزید تقویت پہنچتی ہے جو آبا و اجداد کی پرستش پر زور دیتا ہے؛ اور اس طرح یہ آئین و رواج ایک مرکب معاشری و معاشی نظام بن جاتا ہے اور ان بڑے بڑے خاندانوں کی جماعتوں کی روحانی و معاشی خوش حالی اس کا مقصد قرار پاتا ہے جن سے معاشرے نے ترکیب پائی۔ ہندوستان کے مشترک خاندان کا ابوّتی نظام جو آریوں کے قبضے کے بعد ملک کے طول و عرض میں عام طور پر رائج ہو گیا تھا، قدیم یونانیوں اور رومیوں کے نظام سے جس کو "پدری اقتدار" (Patria Potestas) کہتے تھے، قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی کے بالمقابل ہندوستان میں خاندان کے بزرگ ترین رکن کو بہت بڑا اقتدار عطا کیا گیا ہے جس کی مدد سے وہ خاندان کے کل معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کو ایک طرح کا امین یا معتمد علیہ خیال کیا جا سکتا ہے جس کے ہاتھ میں خاندان کی املاک کا نظم و نسق ہوتا ہے اور جو ارکان کی عام مادی و روحانی بہبود کے لیے خاندان کے معاملات کا انتظام کرتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے ہر طریق عمل اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے۔ خاندان کی عورتیں اپنی ہی جنس میں سے اپنا ایک علٰحدہ صدر رکھتی ہیں جس کو گھر بار کے اندرونی انتظام اور امور خانہ داری میں مردوں کے بالمقابل اقتدار حاصل ہوتا ہے، اور وہ عام طور پر خاندان کے بیرونی معاملات کی تنظیم میں بھی قابل لحاظ اثر ڈالتی ہیں، اگرچہ یہ خاندان کے سب سے بزرگ مرد کے خاص فرائض میں داخل ہے۔ ہر رکن کی آمدنی ایک مشترکہ ذخیرے یا پنچایتی مال میں جمع ہوتی ہے اور اس میں سے سب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صدر خاندان کے حسب ہدایت رقم خرچ کی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق کماتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق پاتا ہے۔ اس طرح مشترک خاندان کے نظام کو اشتراکی قومیت کے تصور

---

[۱] دیکھو سیلگ من کی تصنیف محولۂ بالا باب ششم۔

کی سب سے قریبی شکل کہا جا سکتا ہے۔

قرابت، مذہب اور معاشری روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے زندگی و محنت کے معاشی حالات نے مشترک خاندان کو اس کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اپنے اتحاد 111
اور ایکے کو طویل صدیوں تک قائم رکھے۔ آمد و رفت اور سفر کی مشکلات نے سب ارکان خاندان کو اس بات پر مجبور کیا کہ مل جل کر رہیں اور زراعت، صنعت یا تجارت کے موروثی خاندانی پیشے کو مشترکہ طور پر انجام دیں[1]۔ اس صورت حال نے انفرادی رکن کو باہر جانے اور اپنے لیے جداگانہ اور آزاد شغلۂ زندگی پیدا کرنے سے فطری طور پر باز رکھا۔ علاوہ ازیں تفرقی قابلیت سے کام لینے کا میدان بھی وسیع نہ تھا جو موجودہ پیچیدہ معاشی نظام کی خاص خصوصیت ہے۔

۱۹۔ مشترک خاندان کے طریقے کی خوبیاں

اشتراک خاندانی کی موافقت میں اکثر امور پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ طریقہ لوگوں کو خود غرضی کے بغیر محنت مشقت کرنا سکھاتا ہے اور کسی کو خالی نہیں رکھتا۔ ہر شخص کو کم از کم قوت لایموت کی ضمانت دی جاتی ہے جو معاشی ترقی کی اولین شرط ہے۔ یتیم و بے سیر بچوں کی مناسب طریقے پر نگہداشت کی جاتی ہے اور دنیا کے مصائب برداشت کرنے کے قابل ہونے سے پیشتر انھیں دنیا میں بے سہارا نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ اسی طریقے سے مشترک خاندان بد نصیب بیواؤں کے لیے بھی ایک محفوظ و موقر ملجا و ماوی ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ عقد ثانی کے ذریعے سے ان کے لیے موجودہ بے بسی کی حالت سے باہر نکلنا عام طور پر ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں مشترک خاندان بوڑھوں اور مفلسوں کے لیے کبرسنی کے وظائف اور مالی امداد کی شکل میں سرکاری انتظام کی ضرورت باقی نہیں رکھتا، معذوروں کے لیے ان کی عدم استطاعت کے باوجود خاندان میں کفالت کی گنجائش نکالی جاتی ہے، اور ان کی طاقت و قابلیت کے مطابق ان کو موزوں کام تفویض کیا جاتا ہے۔ عام طور پر

[1] دیکھو بھٹناگر کی تصنیف محولۂ بالا۔

باب ۴

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشترک خاندان سے ایک حد تک سادہ تقسیم عمل کے فوائد حاصل ہوتے ہیں؛ چنانچہ ہر رکن کو وہی کام دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ موزوں ہو۔ دیہات میں کسانوں اور دستکاروں کی عورتیں اور بچے بالغ مردوں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ یہ امر سال کے گرما گرمی کے موسموں میں ایک حد تک اہمیت رکھتا ہے جبکہ اجرت پر محنت دستیاب ہی نہیں ہوتی۔

صرف کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک خانہ داری کا ساز و سامان اور انتظام مشترک خاندان کی صورت میں الگ الگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی؛ اس لحاظ سے بھی بہت کچھ کفایت ہوتی ہے؛ قلیل آمدنی سے بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں اور مقابلۃً بڑے خاندانوں کا قیام و انتظام زیادہ محنت کے بغیر عمل میں آتا ہے۔ جس وقت تک مشترک خاندان قائم رہے اس کے اثاثے کا بہت زیادہ کفایت شعارانہ استعمال ممکن ہے اور تقسیم و انتشار زمین کی خرابیاں رونما نہیں ہوتیں۔

ان سب معاشی فوائد کے علاوہ مشترک خاندان بحیثیت مجموعی ضبط، تادیب، ایثار، اطاعت و ادب کے محاسن بھی پیدا کرتا ہے۔

۲۰۔ مشترک خاندان کے طریقے کے نقائص۔

112 تاہم مشترک خاندان کے طریقے کے بعض پوشیدہ نقائص موجودہ زمانے کے متبدلہ حالات کی وجہ سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طریق کے سب سے بڑے نقائص میں سے ایک یہ ہے کہ محنت اور اس کے صلے کے مابین مطابقت نہیں ہوتی؛ چنانچہ ہم ضمناً کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کی اکثر شکلوں کے خلاف اس کو ایک موثر استدلال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت جیسی کچھ ہے اس کے لحاظ سے سخت مشقت کے حق میں بہترین محرک یہ ہے کہ اس بات کا یقین حاصل ہو کہ محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پھل پورا پورا ملے گا۔ لیکن یہ محرک مشترک خاندان میں عام طور پر مفقود ہوتا ہے؛ اس لیے کہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ خواہ خاندان کا کوئی رکن کام کرے یا بے کاری میں وقت ضائع کرے اس کو اس بات کا اطمینان و یقین ہوتا ہے کہ بہر صورت اس کی

کفالت کی جائے گی اور یہی یقین خاندان میں نکھٹوؤں کی تعداد بڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے خود داری اور ذمہ داری کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔

چونکہ مشترک خاندان کا اساسی خیال یہ ہے کہ فرد، جماعت کے اغراض و مقاصد کا تابع رہے جس کی بنا پر خاندان کے صدر کو اس کے ہر رکن کے عمل کی باریکی کے ساتھ تنظیم کرنی پڑتی ہے، لہذا انفرادیت کی ترقی کے لیے فضا ناموافق ہوتی ہے اور لوگوں میں کسی قسم کی اختراعی قوت اور بے باکی نہیں پیدا ہونے پاتی؛ اس لیے کہ ان کا فرض صرف اس قدر ہوتا ہے کہ احکام سنیں اور ان کی اطاعت کریں۔ تنہا صدر خاندان ہی اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے، لیکن اس کو بھی خاندان کی ذمہ داری کا احساس بے باکی کے ساتھ خطرات برداشت کرنے سے عام طور پر روکتا ہے جو آج کل معاشی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں انفرادی ارکان کی آمدنیاں کل خاندان کے مصارف کے لیے بہ مشکل تمام کافی ہوتی ہیں، اسی وجہ سے اصل کی فراہمی اور اس لحاظ سے نڈر طریقے پر کاروبار کو بڑے پیمانے پر چلانے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گھر بار کی محبت کا پیدا ہونا اپنا مستحسن پہلو رکھتا ہے لیکن وہ آدمی کو گھر گھسنا بناتا ہے اور باہر نہ نکلنے کی عادات کی ہمت افزائی کرتا ہے جس کی وجہ سے محنت غیر نقل پذیر ہو جاتی ہے۔

۱۲۔ اس طریق کو توڑنے والے جدید اثرات

چونکہ موجودہ زمانے کے حالات بحیثیت مجموعی مشترک خاندان کے طریق کے قیام و دوام کے ناموافق ہیں، اس لیے اس کے نقائص زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور یہ طریق ان قوتوں سے عام طور سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے جس کا اثر موجودہ زمانے میں اس پر پڑ رہا ہے۔ اولاً یہ کہ ذرائع آمد و رفت و وسائل نقل و حمل نے انفرادی اختراعی قوت کے لیے نئے میدان کھول دیئے ہیں جس کی بنا پر خاندان کے زیادہ بے باک ارکان کو خاندان کا آغوش ترک کرنے اور اپنے لیے آزاد مشغلۂ زندگی پیدا کرنے کی ترغیب ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم خاندانی پیشوں کے زوال یا نقصان نے اکثر صورتوں میں خاندان کے لیے اکٹھا رہنا غیر ممکن بنا دیا

باب ۱

ہے اور علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مغربی انفرادیت کا قوی اثر مشترک خاندان کے ایکے پر حملہ آور ہونے میں ناکام نہیں رہا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی قانون اور ضابطے کا نمایاں طور پر انفرادی میلان بھی مشترک خاندان کی شکست کی رفتار کو تیز کر رہا ہے۔ کشاکش حیات کی شدت پذیری، جذبۂ انفرادیت کی ترقی کے ساتھ ملکر مشترک خاندان
113 کو موجودہ زمانے کے کم و بیش خلاف اور متناقص بنا رہی ہے۔ قدیم زمانے کے مشترک خاندان کے ساتھ جو خانگی مسرت اور قناعت عام طور پر منسوب کی جاتی تھی وہ اس صورت میں نہیں پائی جاتی۔ "دو اور لو" کے جذبے کی جگہ غیر مصالحانہ خود استحقاقی نے لے لی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل اکثر خاندانوں میں جو مشترک بنیاد پر زندگی بسر کر رہے ہیں بے اطمینانی اور چھوٹے چھوٹے جھگڑے فسادوں کا دور دورہ ہے۔

گو بحیثیت مجموعی ہم اس بات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ مشترک خاندان کے طریقے کو بتدریج معدوم کر دینا چاہیئے، پھر بھی اس کا یہ مفہوم نہ قرار دینا چاہیئے کہ ہم ایسی مذموم انفرادیت کے موافق ہیں جو سراسر نفس پرستی پر مبنی ہو اور کمزور اور محتاج رشتہ داروں کی دست گیری کے لیے اپنے ضمیر کی آواز نہ سن سکے۔ مسئلہ صرف افراط و تفریط سے بچنے کا ہے، یعنی ایک طرف تو انفرادیت کو کاملاً دبانے سے پرہیز کیا جائے اور دوسری طرف باہمی امداد و ہمدردی کے جذبے کو کچلنے سے اجتناب کیا جائے۔ ایثار نفس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی لیکن یہ ایثار جبری ہونے کے بجائے ارادی و اختیاری ہونا چاہیئے۔

۲۲۔ قوانین وراثت و توریث

مشترک خاندان کی بحث کے بعد ہم فطری تغیر کے عمل کے ذریعے سے قوانین وراثت و توریث کے مسئلے پر پہنچے ہیں جو زیادہ تر مشترک خاندان کے آئین و رواج کے تابع ہیں۔ جیسا کہ سیلگ من نے کہا ہے "انفرادی ملک کا آئین و رواج موجودہ زمانے کی معاشی زندگی کی تہ میں مضمر ہے" اور ایک طویل ارتقا کی پیداوار ہے جس میں تین اساسی حالتیں تمیز کی جاسکتی ہیں۔ پہلی حالت جماعتی یا فرقہ وار ملکیت کی ہے۔ دوسری حالت ناقابل انتقال اور مشترک خاندانی ملکیت کی ہے۔ تیسری

ب

حالت خانگی انفرادی ملکیت کی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ابھی تک دوسری حالت کا دور دورہ ہے اور تیسری حالت کی جانب تغیر شروع ہو چکا ہے۔ ہندو قانونی قیاس ابھی تک غیر منقسم خاندانی ملکیت کی موافقت میں ہے بجز اس کے کہ با قاعدہ تسہیم و تفریق ہو[1]۔

۲۳ - متکشرا اور دیا بھاگ قانون۔ 114

ابتداً اگر خاندانی جائداد کی تملیک کا کوئی تصور تھا تو وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جیسے ہم آج کل مشترک ملکیت کہتے ہیں۔ ملکیت پر خاندان کا قبضہ و دخل اجتماعی ہوتا تھا اور ارکان کو انفرادی طور پر اس پر اس معنی میں کوئی حق نہ ہوتا تھا جس معنی میں کہ ساجھے یا شراکت کی جائداد کے مالک شرکا ہوتے ہیں۔ ملکیت اور

---

[1] ”انگلستان میں ملکیت عام طور پر انفرادی، آزاد اور غیر محدود ہوتی ہے۔ یوں تو اشتراک کا بھی امکان ہے لیکن قیاسات قانونی اس کے خلاف ہوں گے۔ ملکیت پہ بندش ہو سکتی ہے لیکن صرف خاص حالات اور خاص شرائط کے تحت۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مشترک ملکیت ہی عام قاعدہ ہے، اور ہر منفرد صورت میں وہ موجود قیاس کی جائے گی تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی امر ثابت نہ ہو۔ اگر کوئی فرد کسی جائداد کا تنہا مالک ہو تو، یہ جائداد بعد کی نسل میں مشترک حق ملکیت میں مبدل ہو جائے گی۔ قطعی غیر محدود ملکیت جس کی بنا پر مالک اپنی جائداد سے اپنی مرضی کے موافق کام لینے کا اختیار کلی رکھتا ہے مستثنیات میں سے ہے۔ باپ پر بیٹا، بھائی پر اس کے دوسرے بھائی اور عورت پر اس کے وارث روک قائم کرتے ہیں۔ اگر جائداد محصل یا مکتسب کے ہاتھوں میں آزاد اور بے روک شکل میں بھی ہو تب بھی اس کے ورثا کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس پر از سر نو روک قائم ہو جائیگی۔ مغرب میں انفرادی ملکیت عام اصول ہے اور مشرق میں عام قاعدہ اجتماعی یا مشترک ملکیت ہے گو ان دونوں نظاموں کے فرق کو براہ راست تضاد کی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے پھر بھی یہ بالکل یقینی ہے کہ دونوں مشترک ماخذ اور بنا رکھتے تھے۔ ہندوستان میں ماضی اور حال میں تسلسل پایا جاتا ہے انگلستان میں دونوں کو ایک وسیع خلیج جدا کرتی ہے۔ اور دونوں کو ملانے کے لیے سابق میں جو پل باندھا گیا تھا اس کے صرف چند تختے اس کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔“ دیکھو جے، ڈی، مین کی کتاب موسوم بہ ”رسالۂ ہندو قانون و رواج“ صہ ۳۰۵۔

باب ۴

انتظام میں تفریق وتمیز کرنے کا سوال اس وقت تک نہیں اٹھا جس وقت تک انتقال جائداد کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جس وقت انتقال کا مسئلہ رفتار زمانہ کے ساتھ رونما ہوا تو، ہندو قانون کی دو اہم شرحوں یعنی متکشرا اور دیا بھاگ نے ایک دوسرے سے متضاد دو نظریے پیش کیے[1] متکشرا طریقے کے مطابق باپ کے ساتھ اس کے بیٹے اپنے باپ کے حین حیات خاندانی جائداد کے مشترک مالک ہوتے ہیں لیکن دیا بھاگ طریقے کے تحت بیٹے صرف باپ کے مرنے پر جائداد کے مالک متصور ہوتے ہیں۔ بہرصورت باپ ہی آزاد منتظم ہوتا ہے؛ فرق صرف ملکیت کے بارے میں ہوتا ہے۔ دیا بھاگ طریقے کے تحت باپ اپنے حین حیات تنہا مالک ہوتا ہے۔ متکشرا قانون کے تحت والد اور اس کی اولاد نرینہ اجتماعی طور پر مالک ہوتی ہے، یعنی افراد کے طور پر نہیں بلکہ انجمن کے طور پر۔ اس فرق کی بدولت جائداد کی توریث وتقسیم کے مختلف اصول رونما ہو گئے ہیں۔ اگر کسی مشترک ہندو خاندان کا کوئی رکن اپنا حصہ الگ کرنا چاہتا ہو تو وہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس لیے کہ ہندو خاندان کے ارکان کے لیے مشترکہ طور پر زندگی بسر کرنے کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ لیکن دیا بھاگ طریق کے تحت صرف بھائیوں اور بھائیوں کی اولاد کے درمیان تقسیم ممکن ہے اور باپ اور اس کے بیٹوں کے مابین ممکن نہیں؛ اس لیے کہ موخرالذکر مالک نہیں ہیں۔ متکشرا طریق کے تحت باپ بیٹوں کے درمیان بھی تقسیم ممکن ہے، اس لیے کہ وہ سب مشترکہ طور پر مالک ہیں، اور تقسیم وتفریق کی صورت میں لڑکوں کو یہ اصرار کرنے کا حق ہے کہ

[1] ہندوستان میں وراثت کے دو طریقے ہیں، متکشرا اور دیا بھاگ۔ موخرالذکر بنگال میں اور اول الذکر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں رائج ہے۔ ان دونوں طریقوں کے درمیان جو فرق ہے اس کا باعث یہ واقعہ ہے کہ متکشرا طریقے کے تحت میراث کے حق کو متعین و منظم کرنے والا اصول "قرابت" یا رشتہ بذریعۂ خون ہے۔ اس کے برخلاف دیا بھاگ طریق کے تحت اس اصول کی جگہ "مذہبی قابلیت" کا اصول لیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وارث میں لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ہو۔" دیکھو ڈی، ایف، ملا کی کتاب موسوم بہ "اصول ہندو شاستر" صہ ۱۶ ۔

باب

ان کے حقوق کا احترام کیا جائے[1]۔

۲۴۔ ان دونوں طریقوں کے تحت وراثت 115

اب ہم قانون وراثت پر پہنچتے ہیں۔ "وراثت" کے معنی مالک کی وفات پر اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کی ملکیت کے انتقال کے ہیں[2]۔ اصول متکشرا کی رو سے مشترک خاندان میں وراثت کا کوئی سوال نہیں ہوتا، اس لیے کہ کسی رکن کی موت سے ملکیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور جائداد غیر منقسم حالت میں باقی رہتی ہے بجز اس کے کہ تسہیم و تفریق پر اصرار کیا جائے۔ بقول مین[3] اصول متکشرا کے تحت جس وقت تک خاندان مشترکہ طور پر زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہو اس وقت تک ارکان خاندان کو جائداد سر دست توریث کے ذریعے سے نہیں بلکہ باقی ماندہ جائداد کے طور پر پہنچتی ہے۔ چنانچہ دیا بھاگ طریق میں بھی، اگر موت واقع ہو اور اس کے نتیجے کے طور پر کوئی تقسیم و تسہیم نہ ہو تو، خاندان کے معاملات میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی۔ صرف ایسی صورت میں جبکہ تسہیم و تقسیم واقع ہو، جانشینی اور توریث کا سراغ لگانے کا سوال رونما ہوتا ہے۔ دیا بھاگ خاندان میں، جب کبھی کسی رکن کی وفات واقع ہوتی ہے، وراثت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور متوفی کا حصہ اس کے وارث کو ملتا ہے۔

لیکن یہ نہ خیال کر لینا چاہیے کہ ہندوستان میں کل کی کل املاک مشترک املاک ہیں۔ علحدہ و انفرادی جائداد حاصل کی جا سکتی ہے، اگرچہ اس کا تعین کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا کہ کن حالات میں وہ الگ ہے لیکن منفرد ملکیت کی صورت میں خالص حق وراثت رونما ہوتا ہے جس کے لیے قانونی اہتمام ضروری ہے۔

۲۵۔ قوانین وراثت و توریث کے معاشی اثرات

ان دونوں طریقوں کے تحت تقسیم و توریث کا نتیجہ یہ ہے کہ جائداد کی تقسیم بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہے،

---

[1] دیسی ریاستوں اور بعض زمینداریوں میں تسہیم و تقسیم کی اجازت نہیں ہے اور گدی یا جائداد نسلاً بعد نسلٍ سب سے بڑے بیٹے کو ملتی ہے۔ صرف ان ہی مستثنیٰ صورتوں میں "قانون اولاد اکبر" رائج ہے۔

[2] تسہیم و تقسیم بلا شبہ موت پر منحصر نہیں ہے، اگرچہ عام طور پر باپ یا منتظم کی وفات پر وہ عمل میں آتی ہے۔

باب

سب لڑکوں کو مساوی حصہ ملتا ہے اور بیواؤں اور لڑکیوں کو بھی مشترک خاندان میں ایک حد تک حصہ ملتا ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ مردوں کی نسل کے کسی مشترک جد اعلیٰ کے مرد اخلاف دوسروں کے مقابلے میں وراثت میں زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اسلامی قوانین وراثت و توریث نظری اعتبار سے نہیں تو عملاً ہندو قانون سے بہت قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں اگرچہ اشتراک فرض نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی مشترک خاندان کا طریقہ کمیاب نہیں ہے، اور اسلامی شرع کے تحت جائداد کا مالک، خواہ جائداد اس کی آبائی ہو یا خود اس کی اکتسابی، صرف اپنے حین حیات اس پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ ہندو قانون کے تحت جائداد جتنے اقسام کے ورثاء کو ملتی ہے اس سے زیادہ اقسام کے ورثاء میں وہ شرع اسلام کے تحت تقسیم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلامی قانون کے تحت تقسیم جائداد کے قواعد و ضوابط کا انحصار صرف قرابت (رشتہ بذریعہ خون) ہی پر نہیں ہے بلکہ بعض منصفانہ ملحوظات پر بھی ہے جن کے ذریعے سے قرابت کی بنا پر مقرر کردہ قواعد میں ترمیم و تبدیلی ہوتی ہے۔ ہندو قانون کی طرح اس میں بھی فرزند اکبر کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور مرد وارثوں کو عورت وارثوں پر عام طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔

ہندوستانی قوانین وراثت و توریث کی حمایت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فرزند اکبر کے حق کی عدم موجودگی، اصول مساوات و منصفانہ تقسیم کے سراسر
مطابق ہے۔ ان قوانین کا میلان یہ ہے کہ دولت و تمول کے عظیم فرق و اختلاف 116
کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور متوسط طبقے کی تعداد میں معقول اضافہ کیا جائے۔ تقسیم زمین پر ان قوانین کے عمل کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک، تاوقتیکہ ان پر حد سے زیادہ عملدرآمد نہ کیا جائے وہ ایک ایسے ثبات پذیر دیہاتی معاشرے کا یقین دلاتے ہیں جو آزاد اور خود دار خود کاشت زمینداروں پر مشتمل ہو، چنانچہ مغرب میں بھی ایسے کسانوں کو ایک مفید زرعی نظام کی پشت و پناہ خیال کیا جاتا ہے جس سے ملک کی خوش حالی کو گہرا لگاؤ ہے۔ یہ واقعہ کہ ہر شخص کو کاروبار آغاز کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے،

باب ۲

صنعتی نقطۂ نظر سے ایک بہت بڑی سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ ترکے کا چھوٹا ہونا، جو حقداروں میں جائداد کو مساویانہ طریق پر تقسیم کرنے کا عام نتیجہ ہے، بجائے خود اس بات کا محرک ہے کہ راحت و آرام کے عادتی معیار کو برقرار رکھنے کے خیال سے اس ترکے میں مزید اضافے کی کوشش کی جائے۔[1]

لیکن چند اہم امور کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے مروجہ قوانین وراثت ناقص پائے جاتے ہیں۔ سب سے اول یہ کہ ان قوانین کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اصل کے ذرائع کی بڑی مقدار میں فراہمی کو روک کر بڑے پیمانے کے کاروبار کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ جب ہر فرد واحد کو قلیل مقدار میں حصہ ملے، جیسا کہ جائداد مساوی تقسیم ہونے کی صورت میں عام طور پر کم حصہ ملتا ہے تو پس اندازی دشوار ہوتی ہے۔ لیکن اس خرابی کو اس طرح رفع کیا جاسکتا ہے کہ صنعت کی تنظیم کو مشترک سرمایے کے اصول پر اور محدود ذمہ داری کی بنیاد پر ترقی دی جائے جس کی بنا پر پس انداز کی ہوئی چھوٹی رقموں کو بھی بڑے پیمانے کے کاروبار میں لگانے کا موقع ملتا ہے۔

ہندوستان میں ان قوانین کے بے روک عملدرآمد کی ایک اور شدید خرابی یہ ہے کہ تقسیم و انتشار اراضی نے انتہائی صورت اختیار کرلی ہے جس کے نتیجے کے طور پر اکثر کھیت غیر منفعت بخش ہو گئے ہیں اور مقدمہ بازی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو ہندوستانی کسانوں کے افلاس کو بہت ہی نامبارک طریقے سے ترقی دے رہی ہے۔

۲۶۔ کیا ہندوستانی روحانیت ہندوستان کی معاشی پسماندگی کی ذمہ دار ہے؟

اب ہم اس بحث مباحثے پر رائے زنی کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ہندوستانی معاشرے کی غیر ترقی پذیر نوعیت اور اس کی عام معاشی پسماندگی کو ہندوستانی روحانیت سے منسوب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟[2] یہ بات عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں "مذہب یہ حکم دیتا ہے کہ تمام مادی فوائد سے

ا۔ دیکھو پی بنرجی کی کتاب موسوم بہ "تحقیق معاشیات ہند" صفحہ ۴۔
۲۔ ہم نے اس عبارت میں جہاں کہیں "ہندوستانی روحانیت" یا "ہندوستانی مذہب" کے الفاظ استعمال

باب ۳

117 منہ موڑ لیا جائے'، اور ہندو کو اس کے مذہب کی یہ تاکید ہے کہ ہر شے کو مذہب کا مظہر تصور کیا جائے۔" علاوہ ازیں ہندوستانی تہذیب و تمدّن کی خصوصیت "لامحدود" کا مستقل احساس ہے، اس کے برخلاف معاشی ترقی، زندگی کے "محدود" اور "مادّی" پہلو سے انہماک کی طالب ہے۔ سب سے اول ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا ہندوستانی مذہب و فلسفہ نے اخروی روش کا حکم ایسے مفہوم میں دیا ہے جس مفہوم میں کہ دوسرے مذاہب اور فلسفے حکم نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں معاشی ترقی کی راہ میں ترک دنیا کے نصب العین کا تسلّط کس حد تک مزاحم ہے، اس لیے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی روحانیت اسی نصب العین کو عوام کے سامنے پیش کرتی ہے۔

۲۷۔ تاریخ سے رجوع۔

اس سلسلے میں ہم اس استدلال کے خلاف کہ ہندوستانی روحانیت نے زندگی کے مادّی پہلو سے عام تغافل اور قنوطی روش کو فروغ دیا ہے، ابتداءً تاریخی شہادت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اگر ہندوستانی دماغ بالکل آخرت کے خیالات سے مملو ہوتا، جیسا کہ اس سے یہ بات وقتاً فوقتاً منسوب کی گئی ہے تو اہل ہند تاریخ میں عظیم الشان سلطنت سازوں، فاتحوں اور نڈر نو آبادکاروں کی حیثیت سے مشہور نہ ہوتے[۱]۔ ان تمام سمتوں میں ان کے نمایاں کارناموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کے مقاصد و اغراض کسی طرح مذہب و

بسلسلۂ حاشیہ صفحہ ۱۷۶۔ کئے ہیں وہاں ان سے ہمارا مطلب "ہندو روحانیت" یا "ہندو مذہب" ہے۔ اسلام کا حوالہ اس مفہوم سے خارج کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ اول تو ہندومت ہی ہندوستان کی اکثریت کا مذہب ہے اور دوسرے یہ اسلام کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ ہندو مذہب کے مقابلے میں طلب حق کا زیادہ اور ترک دنیا کا کم حامی ہے۔ اور ہندومت کے مقابلے میں مدافعت و حمایت کا کمتر محتاج ہے۔

[۱] دیکھو کالے کی تصنیف جلد اول باب ۴۔

باب ۲ فلسفہ تک محدود نہیں رہے ہیں اگرچہ انھوں نے ان شعبوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ یہ نظریہ کہ ہندوستانی دماغ ہمیشہ مذہبی و مابعد الطبیعی خیال آرائیوں میں منہمک رہا ہے اور دوسرے اغراض پر اس نے کوئی توجہ نہیں کی ایجابی علوم میں اس کے مسلمہ کارناموں سے تناقض رکھتا ہے۔ یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں ہی نے ریاضی و میکانی معلومات کی بنا ڈالی۔ "انھوں نے زمین کی پیمائش کی، افلاک کے نقشے کھینچے، آفتاب اور سیاروں کی رفتار و گردش کا حال حلقۂ بروج کے ذریعے سے معلوم کیا، مادّہ کی ترکیب کا تجربہ کیا، اور پرندوں، چرندوں، نباتات اور تخموں کی نوعیت کی تحقیق کی۔" الجبرا کی ایجاد اور ہیئت و اقلیدس پر الجبرا کے اطلاق کا سہرا ہندوؤں ہی کے سر بندھتا ہے۔ اعدادی علامتوں کا بھی یہی حال ہے جو یورپ میں ہر جگہ رائج ہیں[1]۔ علاوہ ازیں قدیم ہندوستانی دستی صنعتوں کی پیداوار نے جو عالمگیر شہرت حاصل کی وہ اس واقعے کی بیّن شہادت ہے کہ ہندوستانی روحانیت نے گزشتہ زمانہ میں معاشی جدوجہد کو مفلوج نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستانیوں نے بڑے میکانی آلات ایجاد نہیں کئے چنانچہ رادھا کرشن نے اس کا ذمہ دار "مہربان آکاش کو قرار دیا ہے جس نے انھیں بڑے بڑے دریائی سلسلے اور غذا کی وافر رسد مہیا کی۔" گو یہ نظریہ اس قدر سیدھا سادہ ہے کہ اس کو مکمل تشریح و توجیہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے بدل کے طور پر جو مفروضے پیش کئے جاتے ہیں کہ ہندوستانی عقل و ذہانت میں جبلّی نقص موجود ہے یا ہندوستانی دماغ دنیوی معاملات کے مقابلے میں روحانی

118 معاملات میں زیادہ منہمک ہے ان کو مسترد کرنے کے کافی وجوہ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ میکانی ایجادوں کا سلسلہ تو بہت ہی حال کے زمانے سے شروع ہوا ہے۔ ہندوستان کم از کم اٹھارھویں صدی تک مادی تہذیب و تمدن کے فنون و صنائع کی خدنگ مغرب کی سربر آوردہ

---

[1] ۔ یوں تو مؤلف صاحبان اپنے بیان کے مختار و ذمہ دار ہیں، تاہم یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "الجبر" یا "الجبر و المقابلہ" عربوں کی ایجاد مانا جاتا ہے اور یورپ نے یہ علم عربوں ہی سے حاصل کیا۔ علیٰ ہذا علامات اعداد بھی جو یورپ میں رائج ہیں "عربی" کہلاتے اور مانے جاتے ہیں۔ (مترجم)

باب۴

قوموں سے مقابلے کا دعویٰ کرسکتا تھا۔ یہ واقعہ کہ اس صدی کے بعد سے جمود طاری ہو گیا ہے اس کو ہندوستانی روحانیت سے معقولیت کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ متعاقب بیان ہو گا، دوسرے ایسے اکثر اثرات کام کرتے رہے ہیں جو اس واقعہ کی مناسب و اطمینان بخش توجیہ کرتے ہیں۔

۲۸۔ معاشی جد و جہد پر مذہبی عقیدے کے اثر کو مبالغے سے بیان کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں ماڑواڑی، جین، اور بھاٹیا اور مسلمانوں میں خوجے، بوہرے اور میمن جیسے لوگوں اور اقوام ہی کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں راسخ الاعتقاد ہوتے ہیں اور اس کے اثر کو سب سے زیادہ قبول کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان ہی لوگوں نے ملک کی جدید صنعتی زندگی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور مغربی صنعتی زندگی اختیار کرنے کی نمایاں صلاحیت ظاہر کی ہے[1]۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ ہندو دھرم یا مذہب اسلام کی پیروی، مادی اغراض کی کامیاب تکمیل سے تناقض یا اختلاف نہیں رکھتی۔ اگر یہ بھی بیان کیا جائے کہ ہندوستان میں مذہب کا میلان دنیاوی و مادی جد و جہد کی جملہ شکلوں کے خلاف ہے، جیسا کہ موجودہ زمانے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تب بھی متوسط درجے کے پیروی کی حد تک مذہب کا اثر اس صورت میں کارگر طریقے پر زائل ہو سکتا ہے جبکہ حالات مادی ترقی کے موافق ہوں اور جبکہ ان حالات سے پوری طرح استفادہ کرنے کی جبلی صلاحیت موجود ہو۔ جین اور بھاٹیا جیسی مذکورۂ بالا متعدد قوموں کو برطانوی حکمرانی سے پیشتر ہی سے اپنی کاروباری جد و جہد اور بے باکانہ تجارت کے دیرینہ روایات سے یقیناً مدد ملی۔ کوئی مذہب، خواہ بلحاظ نوعیت دنیا سے کتنا ہی بے تعلق

---

[1] دیکھو کالے کی تصنیف جلد اول صفحہ ۹۵۔

باب ۴

کیوں نہ ہو، انسان کی معاشی حالت کی اصلاح کے فطری محرک پر مستقل غلبہ حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ معاشی محرک کم از کم اتنا ہی قوی ہوتا ہے جتنا کہ مذہبی محرک، بلکہ اپنے عمل میں زیادہ مسلسل اور دیرپا ہوتا ہے اور یہ بات مغرب و مشرق دونوں پر یکساں صادق آتی ہے۔ البتہ صرف اس صورت میں جبکہ عام معاشی توقعات مایوس کن ہوتے ہیں، مثلاً جس وقت نظم و نسق اس قدر ظلم و تعدی پر مبنی ہوتا ہے کہ ہر تخلیقی جدوجہد کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے تو متوسط آدمی مذہب میں سکون تلاش کرتا ہے جو توکّل اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتا ہے اور ان چیزوں کو ایسی تسکین بخش دوا کی طرح استعمال کرتا ہے جو اس شخص کو ان خرابیوں کے احساس سے بیخبر بنا دیتی ہے جن میں وہ گھرا ہوا ہوتا ہے اور جن کا برداشت کرنا اس کے لیے اس واسطے ضروری ہے کہ وہ ان کو دفع کرنے سے قاصر ہے۔ جس وقت اس کی دنیاوی حالت کو قطعی جدوجہد کے ذریعے سے درست کرنے کے مواقع اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو، فلسفۂ بے عملی سے الفت 119 اور ایسے مذہب سے محبت جو لوگوں کو بامقصد مادّی جدوجہد سے پھیر دے خالص رسمی چیز بن جاتی ہے۔ مذہب اور زندگی میں ربط باقی نہیں رہتا، اور لوگ مذہبی اقوال و احکام کی پابندی صرف زبانی کرکے اپنی زندگی بالکل جداگانہ معیاروں کے مطابق منظّم کرتے ہیں، یا اس کے بدل کے طور پر کسی مذہب کی پیروی، چند مقررہ مذہبی رسوم کی انجام دہی اور بعض رواجوں اور طریقوں کی سختی سے پابندی تک محدود رہ جاتی ہے جو پُرجوش تلاش معاش میں کسی طرح لازمی طور پر مزاحم نہیں ہوتی۔ یہ متناقض صورت حال اس وجہ سے رونما ہوتی ہے کہ روایتی طور پر مسلمہ اعتقاد بدلے ہوئے حالات کے مطابق نہیں ہوتا، لیکن اس صورت حال کے پہلو بپہلو خود مذہب بتدریج تازہ عقلی ترکیب پانے لگتا ہے اور اپنے اندر نئے تصورات پیدا کرلیتا ہے جو اعتقاد اور عمل کی درمیانی خلیج کو پاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ غرض اس کی ہئیت ایک نئے سانچے میں ڈھلتی ہے،

باب ۴

یہاں تک کہ یہ خیال ترک کر دیا جاتا ہے کہ دنیاوی جد و جہد جبلّی طور پر بے نتیجہ یا گناہ کا کام ہے۔ یہ میلان رونما ہوتا ہے کہ ریاضت اور دنیا سے کنارہ کشی کی بجائے دنیا میں رہ کر پرجوش محنت و مشقت کرنے کے متعلق وعظ و تلقین کی جائے اور اس امر سے انکار کیا جائے کہ دنیاوی اور روحانی جد و جہد کے مابین کوئی نمایاں خط فاروق قائم کرنا ضروری ہے۔ مادّی اغراض کے لیے سعی کرنے کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لازمی طور پر روحانی انجام کے خوابوں کے خلاف نہیں ہے اور کسی فرد کی زندگی میں دونوں محرکات کو باہم اس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہی مقصد کو پورا کرنے کے لیے کار آمد بن جائیں۔ جدید مسیحی دنیا انجیل کے اس خیال کے لفظی معنی نہیں لیتی کہ امیر آدمی، جہاں تک اس کے روحانی انجام کا تعلق ہے، خطرے میں ہوتا ہے[1]۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے مسیحی علمائے دین اس کو مان لینے کے لیے فوراً تیار ہو جائیں گے کہ کیڈبری جیسے کاروباری آدمی کے لیے کسی دوسرے شخص کی طرح بہشت میں داخل ہونے کا اچھا خاصا موقع ہے۔ اس لیے کہ مادّی دولت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اگر دولت دیانت داری کے ساتھ ملے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اس کو کما رہا ہے اس نے کوئی قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس کا معقول صلہ دینا قوم مناسب اور سود مند خیال کرتی ہے۔ زر کا کمانا اور صرف کرنا دونوں کے متعلق یہ ممکن ہے کہ ان کا مقصد اور نتیجہ اخوانی اور بے غرضانہ ہو۔

۲۹۔ جبریت، ماضی کے متنزلزل سیاسی حالات کی میراث ہے

ہم یہ خیال کرنے کی جانب پوری قوت کے ساتھ مائل ہیں کہ "جبریت"

---

[1] "جن لوگوں کے پاس دولت ہے ان کے لیے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کس قدر دشوار ہے! ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا اس سے آسان تر ہے بجائے کہ امیر آدمی کا خدائی بادشاہت میں داخل ہونا۔" دیکھو انجیل (مرقس) باب ۱۰ ص ۲۳

یا دنیا سے بے تعلقی اور رہبانیت جو زندگی کے بارے میں ہندوستانی مطمح نظر کی خصوصیت اور لوگوں کی مادی ترقی کی راہ میں سنگین رکاوٹ خیال کی جاتی ہے، بڑی حد تک اس سیاسی افراتفری سے منسوب کی جا سکتی ہے جو ملک کے اندر برطانویوں کی آمد سے فوراً ہی
پیشتر پائی جاتی تھی اور جس نے معاشی محرک کے معمولی عمل کو 120
ناممکن بنا دیا تھا۔ جب حکومتیں لوگوں کی حفاظت کرنے کی بجائے ڈاکہ زنی کرنے لگیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ برطانوی راج کے قائم ہونے سے پیشتر کے دور بد نظمی و بدامنی میں جو حکومتیں موجود تھیں ان میں سے اکثر پر یہ بیان پوری طرح صادق آتا تھا؛ اور جب لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ سالہا سال کی محنت و مشقت کا ثمرہ کسی ناگہانی حملہ آور کی دست برد یا کسی ظالم حاکم کی چیرہ دستی کے باعث آن کی آن میں کھو بیٹھیں تو دولت کی پیدائش اور فراہمی کی تحریک و ترغیب کا بہت ہی کمزور حالت میں ہونا یقینی اور لابدی تھا۔ یہ فطری امر ہے کہ ان حالات کے تحت لوگوں کا مطمح نظر امید اور بلند حوصلگی نہ رہا، ان کے دماغوں پر جبریت کا تسلط ہو گیا اور وہ تقدیر کے قائل بن گئے۔

۳۰۔ مذہب کو متبدلہ حالات کے مطابق بنانے کے لیے مذہب کی از سر نو تعبیر کا عمل۔

امن قائم ہوتے ہی اور مغربی خیالات اور مغربی سائنس کے اثر کے تحت، مذہب کی از سر نو تعبیر ان ہی اسلوب پر شروع ہو چکی ہے جن سے مغرب آشنا ہے، اور مجہول صبر و تحمل سے زیادہ با مقصد عمل کی تلقین کی جا رہی ہے[۱] دوسرے الفاظ میں، کسی مقررہ وقت میں مذہب کے بارے میں

۱۔ ہندوستان میں مذہب کی از سر نو تعبیر کا جو عمل جاری ہے اس کی مثالوں کے طور پر

باب ۳

کسی قوم کا جو مطمح نظر ہوتا ہے وہ زیادہ عام طور پر ان کی معاشی حالت کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہوتا ہے۔ جوں جوں معاشی حالت زیادہ موافق ہوتی جاتی ہے وہ زیادہ امید افزا حالت یا روش پیدا کرتی ہے اور یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ جبری اصول پس پشت ڈال دیے جائیں۔ یہ تصور کرنا غلطی ہے کہ ہندو مذہب معاشی ترقی کی راہ میں مستقل مزاحمت پیدا کرتا ہے؛ اس لیے کہ یہ مذہب نہ تو پرانی لکیر کا فقیر ہے اور نہ دائمی طور پر معین شکل رکھتا ہے؛ بلکہ وہ اپنا رنگ روپ بدلتا رہتا ہے، تاکہ خیالات کی ترقی اور مادی حالات کی اصلاح و ترقی کے مواقع کا ساتھ دے سکے۔[1] ہندوستانی تمدن اور شائستگی صدہا سال سے متعدد اور طاقتور حملوں کے باوجود باقی چلی آ رہی ہے
121 جس کا راز اس کی لچکدار قدامت پسندی ہے، اور یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ موجودہ حالات کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہی نہیں

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ رادھا کرشنن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی فلسفہ" جلد اول سے ذیل کی منتخب عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:۔

عزلت گزینی یا ترک دنیا کے ذریعے سے نجات حاصل کرنے کی کوششوں میں یہ خیال بھی شامل ہے کہ ایک آدمی کی آتما تمام دنیا کی آتماؤں سے بحیثیت مجموعی زیادہ قیمتی ہے لیکن یہ کوششیں کسی حقیقی بندگی کے جذبے کو نہیں ظاہر کرتیں۔ اوپانشید کا یہ منشا ہے کہ ہم کام کریں لیکن بے غرض و بے لوث طریقے پر" (دیکھو صفحہ ۲۱۵)۔ "جھوٹی ریاضت اور تپسیا جو زندگی کو ایک خواب اور دنیا کو ایک دھوکا خیال کرتی ہے، اوپانشید کے مشرب کے خلاف ہے۔" "اس دنیا کی زندگی کی فضا مسرت سے لبریز ہے۔ تسلیم و رضا کا فلسفہ" "اخلاقیات کا ریاضت آموز ضابطہ" "کاہلی اور دنیا سے بیزاری کا میلان" نہ صرف کائنات کے خالق کی توہین ہے بلکہ اپنی ذات کے خلاف گناہ ہے؛ اور دنیا ہم پر حق رکھتی ہے۔ اوپانشید کا عقیدہ ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر دنیا پر بھی" ص ۲۲۰۔

[1] "کیا بہ لحاظ عقیدہ اور کیا بہ لحاظ عمل ہندو مت کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو یکسانی

رکھتی؛ سچ پوچھو تو پرانی عبارتوں میں نئے معنی داخل کرنے اور پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھرنے کا عمل ہندو مذہب میں جتنا آسان ہے اتنا غالباً کسی دوسرے مذہب میں نہیں۔ مخالف نقّادوں نے کہا ہے کہ ہندو مذہب غیر منظم اور بے قاعدہ ہے اور اس میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ اس کو کسی قطعی اصول کے مجموعے کی شکل میں معین کیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "ناقابل تنقید اور ہوا کی طرح ناقابل گرفت ہے"۔ لیکن یہی چیز دراصل کو ایک حد تک طاقت بخشتی ہے اور نئے حالات کے اقتضا کے مطابق صورت اختیار کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اس الزام کے باوجود کہ یہ مذہب دنیاوی معاملات سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتنے کی ترغیب و تحریص دلاتا ہے، وہ یہ ثابت کرنے میں کوئی دقت نہیں پاتا کہ اگر اس کو مناسب طریقے پر سمجھا جائے تو یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے معتقدوں سے یہ التجا نہیں کرتا کہ دنیاوی اغراض سے دست کش ہو جائیں بلکہ صرف یہ کہ خود غرضانہ سعی ترک کر دیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرو، بلکہ صرف یہ کہ دنیا میں سیدھے راستے چلو۔ تلک کی یادگار تصنیف موسوم بہ "گیتا رہاسیا" کا اصل مضمون یہ ہے کہ "بھگوت گیتا" ایک ایسی کتاب ہے جو ہندوؤں کی انجیل ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے، اس میں ترک دنیا (تیاگ) پر باعمل زندگی کو نمایاں طور پر ترجیح دی گئی ہے، اور وہ دنیا سے وابستگی کے بغیر عمل کرنے کی تلقین کر کے زندگی کے روحانی اور مادّی پہلوؤں میں ربط و مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بسا اوقات یہ خیال شدّ و مد

بقیۂ حاشیہ صفحہ گزشتہ: ...کے ساتھ بے حرکت اور غیر متبدل ہو۔ ہندو دھرم ایک حرکت ہے نہ کہ سکون؛ ایک عمل ہے نہ کہ نتیجہ؛ ایک ترقی پذیر روایت ہے نہ کہ معین الہام"۔
دیکھو پروفیسر رادھا کرشنن کی کتاب موسوم بہ "زندگی کے بارے میں ہندو نقطۂ نظر" ص ۱۲۹۔

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستانی قنوطیت کا اصلی سبب ہندو مذہب کا ایک خصوصی اصول یعنی "کرما" ہے اس لیے کہ اس کی رو سے ریاضت (تپسیا) اور ترک دنیا (تیاگ) ہی جنموں اور نئے جنموں کے لگا تار چکر سے بچنے کا اکیلا ذریعہ ہے۔ لیکن اس اصول کی مختلف طریقے پر بھی تعبیر کی جا سکتی ہے؛ چنانچہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ عمل کی راہ میں مزاحم ہونے کی بجائے اس کے حق میں نہایت طاقت ور محرک ہے، اس لیے کہ اس کی رو سے انسان ہی اپنی قسمت بناتا ہے نہ کہ قضا و قدر۔

یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسلام کے بعض خصوصی احکام پر بھی اسی طریقے سے نظر ثانی کی جا رہی ہے اور ان کو حالات کے مطابق بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ عام عقیدے کے مطابق مسلمان کے لیے سود (ربا) کا لین دین جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ بحث بہت سنجیدگی کے ساتھ کی جاتی ہے کہ آیا کسی سچے مسلمان کا ایک ایسی انجمن کا رکن بننا جائز ہے کہ نہیں جو سود کا لین دین کرتی ہے۔ یہ بات بھی بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں کی امانتی رقموں کے سود کا لاکھوں روپیہ ڈاک خانے کے سیونگ بنکوں میں لا دعویٰ پڑا رہتا ہے۔ اس امتناعی حکم کی بنا پر موجودہ حالات کے تحت بظاہر جو دشواری پیدا ہو گئی ہے اس کے مد نظر یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ قرآن شریف کی متعلقہ آیتوں کی اس طرح تشریح کی جائے کہ ان کی رو سے صرف ربا ممنوع قرار پائے نہ کہ ہر قسم کا سود۔[1]

۱۳۱۔ ہندوستانی قنوطیت کے دوسرے اسباب مذہب کے سوا

122 اس طرح ہندوستانی ذہنیت کی خصوصیت کے متعلق اکثر مبصروں کا یہ خیال ہے کہ اس میں قنوطیت اور رنج و غم بے چون و چرا برداشت کرنے کا انداز پایا جاتا ہے، اس کی کافی توجیہ و تشریح کے لیے ہندوستانی مذہب و

[1] دیکھو ام ال ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ (Rusticus Loquitur) ص ۲۶۷ تا ص ۲۶۸

تلقہ کے اثر کے علاوہ دوسرے اسباب کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان پر صدیوں کے غیر ملکی تسلط و قبضہ اور نظم و نسق کی خرابیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف افسردہ دلی اور اداسی چھا گئی۔ ہمارے بیان کردہ اسباب کی فہرست میں انسان کی تباہ کاریوں کے ساتھ فطرت کی ستم کاریوں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور موسم کا اثر خاص کر ان علاقوں میں جو انتہائی گرم یا مرطوب ہیں، یہ پڑتا ہے کہ انسان کے جسمانی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ امکان قوی ہو جاتا ہے کہ جسم انسانی ان امراض کو قبول کرے جو منطقۂ حارہ میں پھیلے ہوئے ہیں، مثلاً ملیریا، طاعون، اور خطافیہ۔ ان امراض میں سے بعض مثلاً خطافیہ مہلک نہ بھی ہوں تو جسمانی طاقت و توانائی عام طور پر گھٹا دیتے اور مردہ دلی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں زندگی میں زندہ دلی اور رجائیت کے سطح نظر پر قائم رہنا غیر ممکن ہو جاتا ہے[1] اس طرح قنوطیت کی ایک عضویاتی بنیاد ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ قحط سالیوں جیسی آفتوں کے اثر کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے جن کا کھٹکا ہندوستان جیسے زرعی ملک کو ہر آن لگا رہتا ہے؛ اس لیے کہ اس کا انحصار غیر معین بارش پر ہے اور گزشتہ زمانے میں قحطوں کو روکنے کے لیے ویسے کارگر انتظامات نہیں کئے جا سکتے تھے جیسے کہ اس زمانے میں موجود ہیں؛ مثلاً قحط کا بیمہ اور امداد قحط۔ اس بلا کے متواتر نزول اور اس کے مقابلے میں کامل بے بسی و بے چارگی نے لوگوں میں لازمی طور پر یاس اور قنوطیت پیدا کر دی ہو گی اور تقدیر کا قائل بننے اور تسلیم و رضا سے کام لینے کی ہمت افزائی کی ہو گی۔ مرض اور قحط کے یہ توام حزنیئے جو ہندوستانی اسٹیج پر ایک زمانۂ دراز سے بار بار ادا ہو رہے تھے، لوگوں کی افسردہ دلی اور اداسی کی بہت بڑی حد تک توجیہ کرتے ہیں۔ ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معاشرے کے سر پر ذات پات کا

---

[1] دیکھو رونالڈ شے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان پر ایک طائرانہ نظر" باب ۲۲۔

بھوت سوار ہونے کی وجہ سے اس پرا ہ رخاص کر پست ذاتوں پر ایسی بہت سی پابندیاں عائد تھیں جنھوں نے انسانوں کے ایک انبوہ کثیر کے لیے معاشری و معاشی اصلاح و ترقی کا راستہ بند کر دیا تھا اور اس کو غلامی کے جنجال میں پھنسا دیا تھا جس سے رہائی کی کوئی امید نہ تھی۔

مغربی یورپ میں بھی عوام میں رجائیت اور شوق حصول کا رونما ہونا قریبی زمانے کا واقعہ ہے۔ جدید سائنسی دور سے بیشتر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قحط و خشک سالی جیسی آسمانی بلائیں اور طاعون، ہیضہ جیسے متعدی امراض کی اشاعت خدائی قہر و غضب کی علامت تھیں جن کے خلاف ہاتھ پیر مارنا یا جد و جہد کرنا کمزور اور فانی انسان کے لیے بے سود تھا۔ گویا یورپ میں بھی کسی زمانے میں عوام کے خیالات پر نام نہاد مشرقی جبریت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگر بے بسی اور بے چارگی کی یہ حالت یورپ میں بڑی حد تک غائب ہو گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی مدد سے اور اس کے گوناگوں مظاہر کی بدولت جو علم طب کی نشو و نما اور وسائل آمد و رفت کی توسیع و ترقی وغیرہ کی صورت میں رونما ہوئے ہیں انسان یہ محسوس 123 کرنے لگا ہے کہ قدرت پر اس کا قابو بڑھ رہا ہے اور جو کامیابیاں اور فتمندیاں اس کو حاصل ہو رہی ہیں ان کے مد نظر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہر خرابی اور کمی جو اس میں پائی جاتی ہے دائمی کوششوں کے ذریعے سے قابل علاج اور قابل تکمیل ہے۔ ہندوستان میں بھی زندگی کے نقطۂ نظر کے بارے میں اسی کے مثل تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے اور اس کا امکان بلکہ یقین ہے کہ جوں جوں نئی روشنی پھیلتی اور تعلیم عام ہوتی جائے گی، عملی سائنس ترقی کرتی جائے گی اور قومی معاشی نشو و نما کی پالیسی استقلال کے ساتھ اختیار کی جائے گی، ویسے ویسے ہندوستانی قنوطیت کے موجودہ اسباب غائب ہوتے جائیں گے اور یہ خیال

قائم کرنے کی کوئی بنیاد نہ رہے گی کہ قنوطیت ہی معاشی ترقی کے راستے کی بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔

باب ۵

124

ہندوستان کی معاشی حالت میں تغیر

۱۔ انگلستان کا صنعتی انقلاب

اس باب میں ہم معاشی ترکیب و تنظیم کے ان اساسی تغیرات پر تبصرہ کریں گے جنھوں نے اس ملک کی زندگی اور محنت کو گزشتہ ایک سو سال میں بدل دیا ہے۔ جو قوتیں برسر کار رہیں وہ ایک حد تک وہی تھیں جن کی مختصر تعریف "صنعتی انقلاب" کی اصطلاح میں کی گئی۔ اِن قوتوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے انگلستان کے صنعتی انقلاب کا حال اجمالی طور پر بیان کر دینا مفید ہوگا۔

گو انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ایک اعتبار سے تباہ کن نتائج پیدا کیے، لیکن دوسرے اعتبار سے وہ خود ایسی قوتوں کا نتیجہ تھا جو کامل نشو و نما پانے سے قریب قریب دو سال پیشتر سے کارفرما تھیں اور جنھوں نے اٹھارھویں صدی کے کم و بیش وسط میں کافی قوت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ اِن ہی کے نتیجے کے طور پر وہ جاذب نظر تغیرات وقوع پذیر ہوئے جن سے "صنعتی انقلاب" کا نام خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے متعدد اسباب تھے کہ صنعتی انقلاب

باب ۵ نے پہلی دفعہ رونما ہو کر انگلستان کو اپنا مرکز کیوں قرار دیا۔ امریکہ کی دریافت
اور ہندوستان کے بحری راستے کے انکشاف کے باعث سولھویں اور سترھویں صدی
میں جو تجارتی انقلاب رونما ہوا وہ صنعتی انقلاب کا لازمی پیش خیمہ تھا، اس لیے کہ
تجارتی انقلاب نے تجارت بین الاقوام کی نوعیت اور پیمانے کی کایا پلٹ دی
اور عالمگیر بازار کھول دیئے جو صنعتی انقلاب کی میکانکی ایجادوں کی پیداوار بہت
بڑی مقدار میں جذب کر لیتے تھے۔ مغربی یورپ کے ملکوں کے "تجارتی" اصول
کی امتیازی خصوصیت تجارتی اجارہ کا نظریہ تھا جس کے باعث سترھویں اور
اٹھارھویں صدی میں معاشی قومیت کی جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور گو انگلستان
ان جنگوں سے کامیاب اور سرخرو نکلا اور اس کی بحری اور تجارتی طاقت پہلے
سے بہت زیادہ ہو گئی، لیکن انگلستان کے رقیبوں اور حریفوں کے ذرائع و صنائع
نہایت کمزور ہو گیے اس کی وجہ سے انگلستان کی مسابقت کی قوت بہت بڑھ گئی۔
علاوہ ازیں جس زمانے میں انگلستان میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اسی زمانے میں
ہندوستان میں برطانوی حکومت و اقتدار مستحکم طور پر قایم ہوا، اور ہندوستان کے
بڑے بڑے بازاروں کا کھل جانا لنکا شائر کی نئی سوتی صنعت کے حق میں زبردست
محرک ثابت ہوا۔ دوسرے اکثر عاملین بھی انگلستان کی جدید تحریک کی موافقت
میں تھے۔ مثلاً (۱) انگلستان کی جزیرے کی حیثیت جو اس کو اس کے حدود
کے اندر جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھتی تھی؛ (۲) ملک کے اندر تجارت
آزاد کا رواج (۳) عمومی قانون کا تسلّط جس نے جاگیریت اور فرقہ وارانہ بے اطمینانی
کی خرابیوں کو بڑی حد تک رفع کر دیا؛ (۴) حکومت کا پارلیمانی شکل میں قایم 125
ہونا جس پر زمیندار، امرا مسلّط ہیں اور قومی صنعتی و تجارتی میلان رکھتے ہیں؛
(۵) سرکاری قواعد و ضوابط کے بارے میں مفید بدگمانی جو اسٹورٹ کی آمریت
کی یاد سے پیدا ہوئی؛ (۶) مذہبی رواداری کا اصول جس کی رو سے غیر ملکی ماہر
دستکاروں کے توطن داخلی کا خیر مقدم کیا گیا؛ اور (۷) بنک کاری اور اعتبار
کی باموقع ترقی۔ اٹھارھویں صدی کے انگلستان میں مرکزی و مقامی مذہب و
سیاسیات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اس نے صنعت پر توجہ مرتکز کرنے میں

باب ۵ مزید مدد دی، اور میکانی ایجادوں کے حق میں محرک کا کام کیا؛ طبیعی علوم کے انکشافات اور ریاضی کے احیا سے خیالات میں جو جوش اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا وہ بھی ایجادوں کے حق میں بہمیز ثابت ہوا[1]۔

۲۔ انگلستان کے صنعتی انقلاب کی چار بڑی خصوصیتیں۔

انگلستان کے صنعتی انقلاب کی چار بڑی خصوصیات تھیں؛ (۱) زراعت میں انقلاب (۲) نقل و حمل میں انقلاب (۳) صنعت میں انقلاب (۴) معاشی خیال اور پالسی میں انقلاب؛ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوا اور سبھوں نے باہم عمل اور ردعمل کیا۔ سب سے اول زراعت میں تغیر رونما ہوا جو نتیجہ تھا انگلستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے زیادہ مقدار میں اشیائے خوردنی طلب کرنے کا، چنانچہ دور وسطیٰ سے مشترکہ کھیتوں کی کاشت کے جو تباہ کن دقیانوسی طریقے رائج چلے آرہے تھے ان کی جگہ حقیت اراضی کے ایک جدید نظام نے لی اور زرعی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ زرعی سائنس کی ترقی اور سائنٹیفک کاشت کی عملی ضرورت واہمیت نے دوسری "احاطہ بندی کی تحریک" کا موقع بہم پہنچایا جس کی وجہ سے ملکی کاشتکاری غائب ہوگئی اور بے زمین مزدوروں کی جماعت اور سرمایہ دار آسامی کاشتکاروں کا گروہ جو ان مزدوروں سے کام لیتا تھا، نمودار ہوا۔ اس طرح موجودہ تین قسمیں رونما ہوئیں، یعنی بڑا زمیندار، سرمایہ دار کاشتکار اور بے زمین زرعی مزدور۔ انقلاب نے نقل وحمل اور صنعت کے شعبے میں اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا کہ ایک تو ذرائع آمدورفت میں اصلاح و ترقی ہوئی، ایسی سڑکیں بن گئیں جن پر محصول وصول کرنے کی چوکیاں قائم کی گئیں اور قابل عبور نہریں تعمیر ہوئیں۔ دوسرے، کوئلے، لوہے اور پارچہ بافی کی صنعتوں میں مختلف قسم کی ایجادیں عمل میں آئیں، خاصکر کاتنے کی کل، جلاہے کا قوت سے چلنے والا راچھ، اور دخانی انجن۔ تیسرے فیکٹری کا طریقہ رائج ہوگیا جس کی بدولت کارخانوں میں بڑے پیمانوں پر کام ہونے لگا اور انسانی محنت کی جگہ کلوں نے

[1] دیکھو جے ایل اینڈ بی ہیمنڈ کی کتاب موسوم بہ "جدید صنعت کی ترقی" صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۹۶

باب ۵ لے ڈی ۱۸۱۵ء کے لگ بھگ وسائل نقل وحمل وذرائع آمدورفت میں ایک انقلاب شروع ہوا جس کی بنا پر آخر میں چل کر ریلیں، دخانی جہاز اور ٹیلیگراف وجود میں آئے۔ صنعتی انقلاب، صنعت پارچہ بافی، کان کنی اور لوہے کے کارخانوں سے شروع ہوکر بتدریج دوسرے صنائع میں بھی رونما ہوا؛ اور اس کی ترقی میں مشترک سرمایہ اور کمپنیوں کے نظام نے، جن کی ذمہ داری محدود تھی، اور اعتبار و بنک کاری کی توسیع نے مزید سہولتیں بہم پہنچائیں۔

126 ان تغیرات کے زیر اثر، معاشی خیال نے آدم اسمتھ کے زمانے سے ایک نیا رخ اختیار کرنا شروع کیا "جو قوم کی معاشی زندگی کی مفصل سرکاری نگرانی و تنظیم" کے قدیم نظام کے خلاف "فطری آزادی اور انفرادی کاروبار" کے اصول پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس قدیم نظام کے خلاف آدم اسمتھ کی کتاب موسومہ "دولت اقوام" بڑی حد تک ایک مدلل اور طاقتور احتجاج تھی۔ نئے معاشی مسلک (اسکول) نے اپنا عام اصول کار "مداخلت نہ کرو" قرار دیا اور اجرت اور کارآموزی وغیرہ کے متعلق قدیم تنظیمی ضوابط کو پوری طرح منسوخ کرانے کا بھی وہی ذمہ دار تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلدارانہ کاروبار اور آزاد مسابقت کی راہ سے سب موانع دور ہو گئے اور صنعتی انقلاب کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔ ضمناً ہم یہ بیان کرسکتے ہیں کہ گو انتہائی "غیر مداخلت" کے اصول نے صنعتی انقلاب کی ترقی کی رفتار تیز کردی لیکن عبوری دور کی ان خرابیوں میں اضافہ کردیا جو کسی انقلاب انگیز تبدیلی سے وابستہ ہوتی ہیں اور ان متعدد تکالیف وشکایات کے ازالہ کو ملتوی کردیا جو زیادہ تر صنعتی انقلاب سے رونما ہوئے تھے۔

۴۔ صنعتی انقلاب کے نتائج

صنعتی انقلاب کے نتائج بہت نمایاں تھے۔ پیدائش دولت میں بہت بڑا اضافہ ہوا؛ تجارت داخلہ وخارجہ میں بہت خاصی توسیع ہوئی؛ انگلستان کی آبادی جنوبی حصے سے شمالی حصے میں بہت بڑی تعداد میں منتقل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مجموعی تعداد میں بہت سریع اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ملک کی معاشری اور معاشی تنظیم میں اساسی تغیرات ہوئے؛ چنانچہ معاشی وسیاسی اقتدار اصلدار جماعتوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا

باب ۵

جس کی وجہ سے مزدور پیشہ طبقوں کے اغراض کو زراعت اور صنعت دونوں شعبوں میں نقصان پہنچا۔ گھریلو صنعت کی جگہ بڑے پیمانے پر کام کرنے والی فیکٹری نے لے لی جہاں ہزاروں مزدور کام کرنے لگے جن کا تعلق اصلداروں سے زر نقد (بطور اجرت) کے رشتے کے سوا کچھ نہ رہا، اور وہ انسانی تعلقات جو مزدور اور اس کے آقا میں قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے ناپید ہو گئے۔ اصل اور آلات پیدایش، سرمایہ داروں کی چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئے جس کی وجہ سے اصلدار اور مزدور میں تفریق پیدا ہو گئی اور معاشرہ دو متضاد و باہمد گر بر سر پیکار گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ مزدور کی زندگی کو غیر محفوظ اور پر خطر بنانے والی بے روزگاری کی ہر وقت کی دھمکیاں، معاشرے کے شیرازے کو درہم و برہم کرنے والی اور بار بار وقوع میں آنے والی ہڑتالیں اور در بندیاں اور معاشی توازن میں متواتر بحرانوں کی رخنہ اندازیاں، یہ سب چیزیں جدید صنعتی نظم و ترتیب کی خصوصیات بن گئیں، اور معاشرے کو نئے اور پیچیدہ معاشرتی سیاسی اور معاشی مسایل سے دوچار ہونا پڑا۔

۴۔ موریسن کی تقسیم قدیم اور جدید وضع کے ملک[1]

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انگلستان کے ان تغیرات کے بالمقابل ہندوستان میں کیا تغیرات رونما ہوئے۔ لیکن ہم ہندوستان کی معاشی حالت کے تغیر کی بحث اس تقسیم سے شروع کریں گے جو موریسن نے دنیا کے ملکوں کے مابین قائم کی ہے۔ موریسن
127 ملکوں کو دو وسیع حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) وہ ملک جو قدیم معاشی نظم سے تعلق رکھتے ہیں اور ابھی تک صنعتی انقلاب کے دور سے نہیں گزرے ہیں۔ اور (۲) وہ ملک جو نئی معاشی وضع سے تعلق رکھتے ہیں اور صنعتی انقلاب کے دور سے گزر چکے ہیں پہلی قسم کے ملکوں کی مثال کے طور پر مصر، مشرقی یورپ کے ممالک اور ہندوستان کو پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں صنعتوں کا قدیم نظام اب بھی نئے تغیرات سے غیر متاثر ہے۔ دوسری قسم کی مثال کے طور پر انگلستان، فرانس، جرمنی اور ریاستہائے متحدہ کو پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں قدیم نظام کی جگہ پیدایش و تقسیم کے نئے طریقوں نے

[1] دیکھو موریسن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں معاشی حالت میں تغیر" صفحہ ۱ تا صفحہ ۳۔

باب ۵

پوری طرح لے لی ہے۔ لیکن یہ ایک بھدّی قسم کی تقسیم ہے، اس لیے کہ دونوں قسموں کے مابین کوئی نمایاں خط فارق نہیں ہے۔ پہلی قسم کے اکثر ممالک دوسری قسم کے تحت جانے کا میلان ظاہر کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض میں تغیر رونما ہو چکا ہے۔ ہمارے پیش نظر مقصد کے لیے، ہندوستان اور انگلستان کو ایسے دو ملکوں کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے جو متضاد معاشی قسموں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ہندوستان اب بھی بڑی حد تک قدیم معاشی نظام سے تعلق رکھتا ہے، اگرچہ اس کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ اس کا میلان دوسری قسم میں مبدل ہونے کی جانب ہے۔ انگلستان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا صنعتی انقلاب ختم ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کی زندگی محنت کے حالات غالباً دوسرے کسی مقام سے زیادہ مکمل طور پر متاثر ہوئے۔ قدیم صنعتی نظام بعض طبعی حالات کا نتیجہ تھا جو دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں کسی نہ کسی وقت میں پائے جاتے تھے اور جہاں کہیں وہ موجود رہے ان کا پیدا کیا ہوا معاشی نظام کم و بیش یکساں تھا۔

۵۔ قدیم نظام کی خصوصیات

پہلی قسم یا قدیم معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ملکوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔ (۱) مسابقت اور معاہدے پر رواج و حیثیت کا غلبہ۔ (۲) آبادی کی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم و تفریق جیسی کہ دیہات میں پائی جاتی ہے اور ناقص ذرائع نقل و حمل و وسائل آمد و رفت کی وجہ سے ان کا معاشی حیثیت سے خود مکتفی یا خود کفیل ہونا۔ (۳) زراعت کا غلبہ دوسرے پیشوں پر اور اس کے نتیجے کے طور پر مختلف پیشوں میں آبادی کی تقسیم غیر مساوی ہونا اور شہری آبادی سے دیہی آبادی کا تناسب بہت بڑھا ہوا ہونا (۴) بازار کے تنگ و محدود ہونے کی وجہ سے تقسیم عمل کا سادہ اور نامکمل حالت میں ہونا۔ (۵) دستکار کا گھریلو صنعت اور دستکاری کو چھوٹے پیمانے پر اور بذات خود آزادانہ طور پر چلانا؛ اور اس کے نتیجے کے طور پر صنعت میں اصل کا بہت چھوٹی مقداروں میں لگایا جانا اور درمیانی منتظم یا آجر کا موجود نہ ہونا۔ (۶) معاشی انتظام میں زر کی عدم موجودگی اور مبادلۂ اشیا (جنسی مبادلت) یا چیزوں کا براہ راست ایک دوسرے سے مبادلہ کرنے کے طریقے کا رائج ہونا۔ (۷) اعتبار کا غیر منظم ہونا اور رباکا رواج۔

باب ۵ 128

۶ - جدید نظام کی خصوصیات - دوسری قسم یعنی جدید معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ملکوں کی خصوصیات حسب ذیل اور مذکورۂ بالا خصوصیات کی ضد ہیں :- (۱) معاہدے اور مسابقت کی آزادی - (۲) صنعتی دنیا کے مختلف حصوں کا ایک دوسرے پر قریبی انحصار' وسائل حمل ونقل وذرایع آمدورفت کی ترقی و توسیع کی بدولت - (۳) مختلف پیشوں میں آبادی کی متابلۃً مساویانہ تقسیم اور زراعت کی مقابلۃً غیراہم حیثیت' اور اس کے نتیجے کے طور پر دیہی آبادی کے مقابلے میں شہری آبادی کی کثرت (۴) تقسیم عمل زیادہ پیچیدہ اور مکمل ہوتی ہے جس میں بازاروں کی روزافزوں توسیع وترقی اور کلوں کا روز بروز زیادہ استعمال سہولتیں بہم پہنچاتا ہے - (۵) صنعت کی تنظیم بڑے پیمانے پر' جس کا اقتضا یہ ہے کہ سرمایہ بڑی مقدار میں لگایا جائے اور چند ماہر آجر اس کی نگرانی کریں' بڑی فیکٹریوں اور صنعتی مرکزوں میں مزدوروں کا اجتماع وارتکاز اور مزدوروں اور اصلداروں میں شخصی تعلقات کی عدم موجودگی - (۶) مبادلۂ اشیا (جنسی مبادلت) کے طریق کی بجائے زر کا نظام - (۷) اعتبار اور بنک کاری کی ترقی اور ربا کی عدم موجودگی -

آج کل ہندوستان کی حالت معاشی حیثیت سے بدل رہی ہے' اور کم وبیش کے فرق سے ایسی خصوصیات ظاہر ہورہی ہیں جو دونوں قسم کے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں - چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان ترقی تو کررہا ہے لیکن اس کی رفتار ہر جگہ یکساں نہیں ہے بلکہ صدیوں کے فرق کو ظاہر کرتی ہے' اس لیے کہ بعض علاقے معاشی حیثیت سے دور قدیم کی نہیں تو دور وسطیٰ کی حالت پیش کرتے ہیں اور باقی قطعی طور پر دور جدید میں قدم رکھ چکے ہیں اور ان کے معاشی حالات میں ویسی ہی مکمل ترقی ظاہر ہوئی ہے جیسی کہ مغربی یورپ کے اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے - پھر بھی ترقی کا میلان مذکورہ بالا دوسری قسم کے روزافزوں غلبے کی جانب ہے -

۷ - قدیم معاشی تنظیم گاؤں - ہندوستان میں جو تغیر واقع ہوا ہے اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اس قدیم معاشی نظام کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے جو نئی قوتوں کے اس پر یورش کرنے سے پیشتر موجود تھا -

ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ملک دیہات میں منقسم ہے' جہاں آبادی کا بیشتر حصہ سکونت پذیر تھا اور آج تک برابر ہے - دنیا سے

باب۵ الگ تھلگ اور اپنی تمام ضرورتوں کا خودکفیل گاؤں "قدیم ہندوستانی معیشت کی اِکائی تھا؛ چنانچہ "ہمیں گاؤں ہی کی جانب متوجہ ہوکر ان حالات کی تحقیق کرنی چاہئیے جن کے تحت قدیم وضع اور میلان کے لوگ رہتے سہتے اور کام کرتے ہیں"۔[1]

۸۔ گاؤں کی ابتدا کیسے ہوئی اور وہ اب تک کیوں قایم ہے۔

129 "گاؤں" جس خاص قسم کی بستی کا نام ہے اس کے وجود کی تشریح و توجیہ کے سلسلے میں مختلف مفروضات پیش کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرقہ یا قبیلہ جو پہلے خانہ بدوش تھا زراعت کے لیے جنگل کو خس و خاشاک سے صاف کرنے کے مشکل کام کی بنا پر اس بات پر مجبور رہا ہو کہ موثر تعامل کے اغراض کے لیے کسی ایک مقام پر مستقل سکونت اختیار کرلے۔ ممکن ہے کہ پانی کی رسد، دوسرا اثر انداز ہونے والا عامل ہو۔ پانی کسی مقررہ رقبے میں ہر جگہ آسانی و آزادی کے ساتھ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں وہ علاقے جہاں اس کی کثرت تھی فطری طور پر آبادی کے ارتکاز کے لیے منتخب کرلیے گئے ہوں گے۔ ایک اور عامل جس نے اس ارتکاز کو تقویت پہنچائی ہوگی لازماً مخالف قبیلوں اور جنگلی جانوروں سے حفاظت کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان کی دیہی آبادی اپنی نظیر دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی رکھتی ہے۔ مثلاً انگلستان کے دور وسطیٰ کا "جاگیری قریہ" جرمنی کا "مارک" اور روسی "میئر" یہ سب بظاہر مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں دیہی تنظیم کی ثبات پذیری اور متعدد سیاسی انقلابات کے مقابلے میں اس کا اصلی حالت میں قایم رہنا، عام طور پر ہندوستانی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے، خاصکر بیرونی مبصروں کا یہی خیال ہے اور ٹھیٹ دہقانی سادگی اور خوشحالی کو جو قدیم ہندوستانی دیہی برادریوں کا طرۂ امتیاز تھی پُرشوکت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] ۔ دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۳۴۔

[2] ۔ قاری کو سر چارلس مٹکاف کی سنہ ۱۸۳۰ء کی یادداشت کی مندرجہ ذیل عبارت جس کا عام طور پر حوالہ دیا جاتا ہے یاد ہوگی کہ:۔ "دیہی برادریاں چھوٹے چھوٹے جمہوریے ہیں جن میں ضرورت کی قریب قریب کل چیزیں موجود ہیں وہ بیرونی تعلقات سے بالکل الگ تھلگ ہیں خواہ کوئی اور چیز برقرار ہے یا نہ رہے لیکن یہ بظاہر برابر

باب ۵

لیکن اس خیال کو کہ گاؤں بیرونی جنگوں اور انقلابات کا اثر لیے بغیر زندگی بسر کرنے کے قابل تھا بہت کچھ تحفظات و شرائط کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ خیال کرنا ناممکن ہے کہ اٹھارھویں صدی میں جس وقت کل ملک میں جنگ و جدال اور ڈکیتی کا دور دورہ تھا، دیہات بالکل محفوظ رہے ہوں گے اور انھیں پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ حملوں کی مدافعت کے لیے انھیں مجبوراً اپنی ہی قوت پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ان حملوں کو مسترد کرنے میں وہ گاہ گاہ کامیاب ہوتے تھے لیکن عام طور پر دشمن اس قدر قوی ہوتا تھا کہ کامیاب مقابلہ دشوار بلکہ غیر ممکن ہوتا تھا۔ تاخت و تاراج اور لوٹ مار یقیناً ان کی زندگی و معیشت میں وقتاً فوقتاً ہر طرح خلل انداز ہوئی ہوگی اور اس سے بچ کر سابقہ حالت پر عود کر آنے کا عمل بہت سست رفتار اور تکلیف دہ رہا ہوگا۔ یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ دیہات، اردگرد کی جنگوں اور انقلابات کے اثر سے محفوظ رہ کر اپنی معمولی پر امن و سکون زندگی بسر کر سکتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی جس سیاسی بدنظمی و طوائف الملوکی کا ملک میں دور دورہ ہوا وہ اپنا زہریلا اثر دیہات تک وسیع کرنے اور ان کی معاشی زندگی پر کاری اور مکرر ضرب لگانے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس واقعہ کو کہ دیہی تنظیم صدیوں تک 130 تقریباً غیر متبدلہ حالت میں برقرار رہی اس امر کی جانب منسوب نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی دیہات میں باقی رہنے کا جبلی وصف موجود ہے بلکہ بعض مستقل عاملوں مثلاً وسائل آمدورفت کی عدم موجودگی اور اس کے نتیجے کے طور پر نظم و نسق حکومت میں موثر مرکزی نظام کے فقدان کی جانب منسوب کرنا چاہیے۔

۹ ٹھیٹ ہندوستانی گاؤں

ٹھیٹ ہندوستانی گاؤں میں مزروعہ رقبے کچھ افتادہ زمین کے ساتھ یا بغیر ہوتے ہیں۔ اس مجموعی زمین میں عام طور پر ایک مرکزی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ قائم ہیں۔ ان دیہی برادریوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر ایک جداگانہ چھوٹی مملکت ہوتی ہے ان کا یہ اتحاد ان کی خوشحالی میں بہت بڑا حصہ رکھتا ہے اور ان کی آزادی اور بے تعلقی کو برقرار رکھنے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔"

سلہ دیکھو لمے 'یس' مل ٹے کر کی کتاب موسوم بہ "مغربی ہند کی دیہی برادریوں کی سرگزشت" صفحہ ۱۰۵ تا صفحہ ۱۰۶ -

باب ۵

خطہ ہوتا ہے جہاں سکونتی مکان قریب قریب واقع ہوتے ہیں اور اس مرکزی خطے کے ارد گرد متعدد دائروں میں یکے بعد دیگرے پھیلی ہوئی گاؤں کی زمینیں ہوتی ہیں بعض صورتوں میں کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے منتشر مکانات اور باڑے پائے جاتے ہیں، گو کسان جان و مال کی بہتر حفاظت کی خاطر اور دوسرے اسباب کی بنا پر معمولی طور پر دیہی سکونتی رقبے کے اندر اپنے مکان میں رہتا سہتا ہے۔ گاؤں عام طور پر درختوں کے جھنڈ کی ملکیت کا فخر رکھتا ہے، اور اسی کے ساتھ وہاں کسی نہ کسی قسم کا سرکاری دفتر بھی ہوتا ہے جہاں دیہی عہدہ دار اپنے بہی کھاتے رکھتے اور اپنا کاروبار انجام دیتے ہیں[1]۔

۱۰۔ دیہی نظم

(۱) کسان

دیہی نظم کی جانب عود کرتے ہوئے، سر دست ہندوستان کے دیہات کی دو بڑی قسموں یعنی ایک رعیت داری یا انفرادی گاؤں اور دوسرے مشترکہ گاؤں کے باہمی فرق کو نظر انداز کرنا اور دونوں کی مشترکہ خصوصیات ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک عام بیان کی کوشش کرنا مناسب ہوگا۔ ہر گاؤں کلیتہً خود کفیل معاشی اکائی ہوتا ہے جس کے حدود کے اندر زرعی و صنعتی جد و جہد کے لیے کل مطلوبہ محنت، اصل اور مہارت موجود ہوتی ہے۔ گاؤں کے باشندوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) کسان (۲) دیہی عہدہ دار اور (۳) دیہی دستکار اور ادنیٰ خدمتگزار۔ کسانوں کو بھی دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) خود کاشت زمیندار (۲) آسامی کاشتکار۔ یہ دونوں دیہی برادری کے اہم ترین طبقے کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ حقیقی کسان، خواہ وہ ملکی کسان ہوں یا آسامی، زیادہ تر چھوٹے چھوٹے کھلے کھیتوں پر کاشت کرتے ہیں (جو زرعی انقلاب سے پیشتر کے انگریزی دیہات کی بے باڑ کی عمومی زمینوں کی یاد تازہ کرتے ہیں)۔ ان پر اتنی ہی محنت صرف کی جاتی ہے۔ جتنی کہ وہ اور اس کا کنبہ مہیا کر سکتا ہے اور کہیں کہیں اجرت پر مزدور رکھے جاتے ہیں۔ جو تھوڑا بہت روپیہ اصل کے لیے درکار ہوتا ہے اس کو کسان ہی بطور خود رقم پس انداز کر کے یا زمیندار سے مستعار لے کر یا عام طور پر گاؤں کے مہاجن سے قرض لے کر مہیا کر لیتے ہیں۔

---

[1] دیکھو آر بیڈن پاول کی کتاب موسوم بہ "برطانوی ہند میں مالگزاری اور حقیت اراضی" صفحہ ۶۶

باب ۵ وہی کاشت کے خطرات برداشت کرتے ہیں، خود ہی اپنے چھوٹے کھیتوں کے منتظم و مہتمم ہیں اور خود ہی ماہر مشیر بھی۔ جو کچھ پیداوار بچ رہتی ہے اس کو وہ قریب ترین بازار
131 میں لے جاتے ہیں اور اس کے مبادلے میں نمک اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء ضرورت و تعیش خرید لاتے ہیں جو گاؤں میں دستیاب نہیں ہوتیں[1]۔

۱۱ - دیہی نظم
(۲) دیہی عہدہ دار

ہر گاؤں اپنے عہدہ دار رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی گاؤں نظم ونسق کی جس طرح پہلے اکائی تھا اسی طرح آج تک ہے۔ دیہی عہدہ داروں میں ہمیں سب سے اول گاؤں کے سرگروہ یا پٹیل کا ذکر کرنا چاہئیے جو گویا رعیت واری گاؤں کا صدرالمہام ہوتا ہے۔ اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے اور گاؤں کے امن ونظم اور مالگزاری کی وصول یابی کی ذمہ داری اسی کے سر ہوتی ہے۔ اس کو معمولی فوجداری اختیارات بھی عام طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے قبضے میں ایک خطۂ زمین ہوتا ہے جسے "وطنی" زمین کہتے ہیں اور جو اس کی خدمات کے صلے کے طور پر اس کو ملتا ہے۔ گاؤں کا دوسرا عہدہ دار جو محاسب یا محرر کا کام کرتا ہے پٹواری یا کلکارنی کہلاتا ہے۔ یہی گاؤں کے سب حسابات اور یادداشتیں رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک چوکیدار بھی ہوتا ہے جو کوتوالی میں جرائم ووارداتوں کی اطلاع کرتا ہے، خاطیوں اور مجرموں کو گرفتار کرتا ہے اور پولیس کی مدد کرتا ہے۔ اور سب سے آخر میں دیہی قاصد یا نامہ بر ہوتا ہے۔ ان عمائدِ دہ کو جنھیں بعض اوقات الوتہ دار (Alutes) کہتے ہیں، ...... بلوتہ داروں (Balutes) یا دیہی خدمتگاروں یعنی دست کاروں اور ادنیٰ خدمتگزاروں سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ موخرالذکر دیہی باشندوں کی تیسری جماعت ہے۔ قدیم زمانے میں اکثر دیہات میں پنچایتیں یا دیہی بزرگوں کی انجمنیں ہوتی تھیں جو ازراں اور موثر قسم کی ثالثی کی عدالتیں ہوتی تھیں اور عام حالات میں دیہی آبادی میں ایکا اور اتحاد قائم رکھتی تھیں۔

۱۲ - دیہی نظم
(۳) دیہی دستکار

قدیم زمانے میں تقریب قریب ہر گاؤں میں نجار، آہن گر، کمہار، جراح، موچی، دھوبی، زرگر، ٹٹ پونجئے دوکاندار اور تیلی وغیرہ

[1] دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف محولہ بالا باب ۲۔ نیز منوجی کی تصنیف محولہ بالا باب ۲۔

باب ۵

جیسے دستکاروں کی مکمل تعداد ہوتی تھی۔ ہر گاؤں میں ایک مقدس آدمی بھی ہوتا تھا خواہ وہ نجومی ہو یا پروہت، گرو ہو یا فقیر۔ بڑے دیہات میں جلاہے کی موجودگی بھی ممکن تھی، اور تقریباً ہر گاؤں میں مہاجن بھی رہتا تھا جو عام طور پر ساہوکار اور ٹھوک غلہ فروش کے کاموں کو ملا کر انجام دیتا تھا۔ دستکار گاؤں کے خدمتگار ہوتے ہیں جن کا پیشہ موروثی ہوتا ہے اور جن کو اجرت بلحاظ کار شاذ ہی دیجاتی ہے۔ ان کو گاؤں میں رہنے کے لیے صرف مکان دیا جاتا ہے، لیکن سب گاؤں والوں کی ضرورتوں کی تکمیل ان کو کرنی پڑتی ہے جس کے لیے اہل دہ انھیں یا تو خام اشیاء مہیا کر دیتے ہیں یا ان اشیاء کی قیمت۔ ان کی محنت کے صلے کے طور پر ان کو سالانہ باقاعدہ زمین دیجاتی ہے یا فصل کی کٹائی کے وقت بہ شکل جنس کچھ معاوضہ دیدیا جاتا ہے[1]۔ لیکن ایسے دستکار جن کی خدمات کی صرف گاہ گاہ ضرورت ہوتی ہے، مثلاً جلاہے تو ان کو اجرت بلحاظِ کار دیجاتی ہے اور صرف آلۂ شکرسازی یا بیل گاڑی جیسی اشیا کی تیاری کے لیے نجار جیسے دستکار کو زائد معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء کی کیفیت مردم شماری کے الفاظ کے مطابق "ہندوستان 132 کی دیہی زندگی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر گاؤں دستکاروں اور ادنیٰ خدمتگاروں کے مکمل عملے سے آراستہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ کل کے بنے ہوئے کپڑے، مٹی کے تیل، چھتریوں وغیرہ جیسی مغربی اشیا کے حال میں رواج پانے سے پیشتر تک گاؤں اپنی جملہ ضروریات کا خود کفیل اور دوسروں سے بے نیاز ہوتا تھا، صرف نمک اور چند دوسری اشیائے تعیش مستثنیٰ تھیں جو گاؤں کے میلے میں خریدی جاتی تھیں یا کاروانوں کے ذریعے درآمد کی جاتی تھیں[2]۔

۱۳۱۔ گاؤں کا الگ تھلگ اور خودکفیل ہونا۔

گاؤں والے، سڑکوں اور ریلوں کے بننے سے پیشتر بیرونی دنیا سے بمشکل کوئی تعلق رکھتے تھے بجز اس کے کہ غلے یا کپڑے کا تاجر گاہے ماہے

۱۔ دیکھو بیڈن پاول کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۹۹۔

۲۔ دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۔

باب ۵

آیا کرتا تھا اور ایک گاؤں کی زائد از ضرورت اشیا اپنے ساتھ لیجا کر دوسرے گاؤں کی احتیاج کو پورا کرتا تھا یا کبھی کبھی اپنی دستکاری کی پیداوار کو فروخت کرنے کے لیے کسی تجارتی مرکز کو جایا کرتا تھا۔ گاؤں کو اس بنا پر مجبوراً خود کفیل ہونا پڑتا تھا کیونکہ بیرونی دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہوتا تھا۔ بقول ہورنیبن "جہاں پانی کے ذریعے سے نقل و حمل غیر ممکن ہوتی ہے اور گاڑیوں کے ذریعے سے آمدورفت سست رفتار اور ناقابل اعتماد ہوتی ہے وہاں مبادلات ان ہی اشیا تک محدود رہتے ہیں جن کی نقل و حمل انسانوں یا لدو جانوروں سے ممکن ہوتی ہے۔" ابتدائی انیسویں صدی میں ہندوستان میں دریائے گنگا اور سندھ جیسے چند ہی دریائی راستے تھے، اور سڑکوں کی نقل و حمل ناقص اور ویسی ہی خراب تھی جیسی کہ آرتھر ینگ کے بیان کے مطابق ابتدائی اٹھارھویں صدی میں انگلستان کی تھی۔ مناسب سڑکیں بہ مشکل موجود تھیں، بجز ان چند سڑکوں کے جو مغلوں نے بنائی تھیں؛ اور جہاں کہیں وہ موجود تھیں ان کی حالت عام طور پر بے حد غیر اطمینان بخش ہوتی تھی اور ان پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا راج رہتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سڑکوں کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ بھی نہ کیا، اس کو نظم و نسق سے زیادہ سروکار نفع سمیٹنے سے تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت داخلہ غیر ترقی یافتہ حالت میں رہی۔ اس طرح بقیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور بے تعلق رہنے کی وجہ سے گاؤں اس بات پر مجبور ہوگیا کہ اپنی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خود اپنے طور پر مستقل انتظامات کرلے، چنانچہ اس سلسلے میں مکانوں اور باقاعدہ معاوضے کا پیشکش دے کر اس نے دستکاروں کے مطلوبہ عملے کو اپنی جانب کھینچا۔ معمولی اوقات میں تو وسائل آمدورفت کی عدم موجودگی کے باعث گاؤں کو تکلیف اس لیے نہ ہوتی تھی کہ اس کی تنظیم میں اس کمی اور مجبوری کو ملحوظ رکھا گیا تھا اور اس کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ اس کمی کا اثر زائل ہو جائے۔ لیکن قحط کے زمانے میں نقل و حمل کی سہولتوں کی عدم موجودگی کے باعث غلہ جہاں بکثرت ہوتا تھا وہاں سے قحط زدہ مقام کو منتقل کرنے میں مزاحمت پیدا ہوتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ موخرالذکر مقام میں تکلیف و مصیبت زیادہ نازک صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یہی بدیہی توجیہ ہے قیمتوں کے ان حیرت انگیز اختلافات کی جو متصلہ و ملحقہ دیہات میں پائے جاتے تھے۔ دیہات ایک دوسرے سے

باب ۵

بہت ہی قریب ہونے کے باوجود ذرائع نقل وحمل کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں بہت
دور کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن دیہات میں غلے کے ذخائر کی موجودگی قلت وتنگی محسوس
نہ ہونے دینے کی ضامن تھی، بہ شرطیکہ قلت مختصر مدت تک محسوس ہو۔ چونکہ دیہی دستکاروں
133 کی تیار کی ہوئی اشیا کا بازار تنگ اور محدود ہوتا تھا اس لیے تقسیم عمل نہایت غیر مکمل
ہوتی تھی۔ تخصیص کے فوائد سے بڑی حد تک دست بردار ہونا پڑتا تھا اور بہت سا وقت
اور مہارت ضایع جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ دیہی صنعت بہت ہی پسماندہ حالت میں تھی[1]۔
ہندوستانی دستکاری کی اعلیٰ درجے کی پیداوار پر تعریف وتوصیف کی عام طور پر جو بوچھار
کی جاتی ہے اس کا اطلاق دراصل ان صنعتوں پر نہیں ہوتا جو دیہات میں رائج تھیں
بلکہ قدیم زمانے کی شہری صنعتوں پر ہوتا ہے۔

۱۴۔ زر وغیرہ کی عدم موجودگی۔

دیہی زندگی کی ایک اور خصوصیت جس پر زور دینے کی ضرورت ہے
یہ تھی کہ کچھ سال اوھر تک زر، مبادلات طے کرنے کے لیے یا
خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے بہت شاذ استعمال
کیا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ زر کی ضرورت ایسی خود کفیل قوم کو شاذ ہی محسوس ہوتی ہے
جس کو بیرونی دنیا سے صرف چند ہی مبادلات عمل میں لانے پڑتے ہیں[2]۔ چونکہ زراعت
ہی اہم ترین دیہی صنعت تھی، اس لیے غلہ معیار قدر تھا اور اہل دِہ اسی کو آپس
کے مبادلات میں استعمال کرتے تھے۔ غلے کی مانگ عام تھی اور اس کا وزن اور
جسامت اس لیے حارج و مزاحم نہ ہوتی تھی کہ مبادلات زیادہ تر گاؤں کے حدود کے

---

[1] دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۳۔

[2] لیکن قلت زر کی وجہ سے اس حد تک لازمی طور پر دشواری محسوس کی گئی ہوگی جس حد تک کہ حکومت کی جانب سے زمین کی مالگزاری نقد میں ادا کرنے پر اصرار کیا گیا ہوگا۔ اس صورت میں کسان کو اپنی پیداوار کا ایک جزو فروخت کرنا پڑتا ہوگا، اور اس معاملے میں اس کی حیثیت موجودہ حالت کے مقابلے میں حتی الامکان زیادہ کمزور رہی ہوگی۔ چونکہ نقل وحمل مشکل وپرخطر تھی اس لیے اغلب ہے کہ تاجر اپنی قیمت خرید اور قیمت فروخت کے درمیان زیادہ فرق کے طالب رہتے ہوں اور اشیائے خام کی تجارت برآمد میں چونکہ اس وقت تک ترقی نہ ہوئی تھی اس لیے بہ حیثیت مجموعی کسان اپنی اشیا کی بہترین ممکنہ قیمت حاصل کرنے کے بارے میں موجودہ زمانے سے بھی زیادہ کمزور وناموافق حیثیت رکھتا ہو۔

باب ۵

اندر انجام پاتے تھے۔ غلے کی طرح جس شئے کی طلب شدید اور عام تھی وہ صرف زمین تھی، اور چونکہ اس کی ملکیت گاؤں میں اعلیٰ حیثیت اور رتبے کی علامت تصور کی جاتی تھی اس لیے اس کے ذریعے سے خدمات کا صلہ ادا کیا جاتا تھا خاص کر پٹیل کی طرح کے زیادہ اہم خدمتگاروں کو اسی کی شکل میں معاوضہ دیا جاتا تھا[۱]۔ یہ معاوضہ جس شرح سے ادا کیا جاتا تھا اس کا تقرر دیہات کے رسم ورواج کے ایک مفصل و پیچیدہ لیکن بخوبی مفہومہ نظام سے ہوتا تھا۔ اس شرح کا تقرر نیز گاؤں کے دوسرے معاشی تعلقات کا انحصار مسابقت کی بجائے رسم ورواج پر تھا[۲]۔

محنت کی عدم نقل پذیری اور گاؤں والوں کی قدامت پسندی موجودہ زمانے سے زیادہ قدیم زمانے کی امتیازی خصوصیت تھی، گو قدیم زمانے میں اتحاد اور ایکے کا احساس زیادہ قوی تھا اور اسی احساس کی کمزوری موجودہ زمانے کی صورت حال کی سب سے زیادہ اضطراب پیدا کرنے والی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

دیہی نظام کے مذکورہ بالا بیان کو ان حالات کا آئینہ خیال نہ کرنا چاہیے جو آجکل در اصل پائے جاتے ہیں۔ ملک کے قدیم معاشی انتظام کے اکثر شعبوں کی طرح 134 گاؤں میں بھی قابل لحاظ بلکہ بعض اعتبارات سے اساسی تبدیلی واقع ہوئی ہے، اور یہ سب کچھ ان نئے عاملین کے اثرات کے تحت ہوا ہے جو گزشتہ ایک سو سال میں رونما ہوئے۔ پھر بھی قدیم نظام کی جگہ جدید نظام نے ابھی تک پوری طرح نہیں لی ہے، اور ان تمام تغیرات و تنظیم کے باوجود جو واقع ہوئے ہیں، قدیم نظام کے خدوخال کو اس کی خالص شکل میں دیکھنا اب بھی ممکن ہے۔ گاؤں میں جو تغیر و تبدل واقع ہو رہا ہے اس پر اس باب میں متعاقب زیادہ مفصل بحث کی جائے گی۔

۱۵۔ رواج اور حیثیت

ہم رانا ڈے کا قول بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں بجز چند مستثنیٰ و محدود صورتوں کے نہ تو آزاد و غیر محدود مسابقت کی خواہش ہے اور نہ سلیقہ۔ رواج اور سرکاری قوانین مسابقت سے

[۱] ۔ دیکھو موریسن کی محولۂ بالا کتاب، صفحہ ۴۵

[۲] ۔ دیکھو متعاقب صفحات فصل (۱۵ تا ۱۸)

باب ۵ زیادہ طاقتور اور دخیل ہیں اور حیثیت کا اثر معاہدے سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔" ہندوستانی تہذیب و تمدن کی سکونی نوعیت، لوگوں کی قدامت پسندانہ جبلت اور خاصکر فطری معیشت یا جنسی مبادلت کے طریق نے رواج اور حیثیت کی پرورش کی اور ان کو مستحکم بنایا۔ ڈاکٹر کننگ ہیم جنسی مبادلت کو رواج سے اور زر کو مسابقت سے منسوب کرتے ہیں "جس وقت تک جنسی مبادلت کا طریق قایم ہے اس وقت تک لگان، اجرت اور محصولوں کی ادائی رواج کی بنا پر ہونے کا قرینہ ہوتا ہے۔ لیکن جب زر استعمال ہونے لگتا ہے تو ان مطالبات کی ادائیوں میں جلد جلد تغیرات واقع ہوتے ہیں اور وہ مسابقت کے ذریعے سے طے پاتے ہیں۔"

ہندوستان کے ذات پات اور اشتراک خاندانی کے طریقے کی تحقیق سے ہم کو اس بات کا سرسری اندازہ ہوا کہ فرد واحد کی زندگی کا راستہ اور اس کے معاشری و خانگی تعلقات کی کل رفتار معین کرنے میں یہ رسم و رواج کیا قوت رکھتے ہیں۔ جس وقت تک رسم و رواج پر جدید عناصر قابل لحاظ طریقے سے اثر انداز نہیں ہوئے اس وقت تک فرد واحد آزاد عامل نہ تھا اور اس کو اپنے پیشے، معیار زندگی اور سکونت وغیرہ کا انتخاب کرنے میں آزادی معاہدہ حاصل نہ تھی۔ کسی خاص ذات اور خاندان میں کسی فرد کی ولادت اس بات کا تعین کر دیتی تھی کہ معاشرے میں اس کی حیثیت کیا ہوگی، خواہ یہ چیز اس کے لیے مضر ثابت ہو یا مفید، اور اس سے وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ اس کو اسی حیثیت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ جو اس کے لیے ولادت کا اتفاقی امر متعین کر دیتا تھا۔

تاریخی حیثیت سے، رواج نے ہر قسم کے معاشی تعلقات کا تعین کرنے میں اہم حصہ لیا ہے، صنعتی انقلاب سے پیشتر جاگیری نظام اور حرفتی پنچایتوں کے نظاموں کے تحت تمام یورپ میں اس کا دور دورہ تھا۔ البتہ کچھ سال ادھر سے مسابقت، رواج کی قائم مقام بنی ہے۔ اسی طریقے سے ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کے تحت مسابقت کی بجائے رواج ہی کی بنا پر لگان، اجرت، اور

لہ۔ دیکھو صفحہ (۸ تا ۱۰)

135 قیمتوں کا تقرر ہوتا تھا۔ رواج کو محض رسم خیال کیا جا سکتا ہے جو عادت کی پختگی پر مبنی ہو، اور رواج کا اساسی تصور ہر قسم کی تبدیلی کی مقاومت ہے اور محض اس بناء پر کہ وہ تبدیلی ہے۔ لیکن نام نہاد رواج کے نظام کے تحت بھی، متبدلہ رواج کے بھیس میں مسابقت کی خاموش قوت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ رواج بہت زمانے تک مسابقت کے خلاف نہیں رہ سکتا؛ اس لیے کہ بقول موریسن "مسابقت اس کشاکش حیات کا صرف دوسرا نام ہے جو تمام جاندار مخلوق میں جاری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسابقت اور رواج کے باہمی تضاد کو عام طور پر مبالغے کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہوگی کہ ان سے بہت غیر مشابہ نتائج نہیں پیدا ہوتے۔ جب ان میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو رواج میں عام طور پر اس طرح تبدیلی کر دی جاتی ہے کہ وہ معاملے کی عملی ضرورتوں کے مطابق بن جائے۔"[1] رواج اور مسابقت کا باہمی تضاد و تخالف، تغیر پذیر حالات کے مطابق بننے کی سہولت اور درجے پر مبنی ہے۔ اس کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ رواج کے تحت، تغیر دشوار ہے اور تغیر و تبدّل کی اس سے زیادہ مقاومت و مزاحمت ہوتی ہے جتنی کہ مسابقت کے تحت۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رواج کے تحت کوئی تبدیلی ہی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں محنت و اصل کی نقل پذیری مکمل ہوتی ہے وہاں مسابقت رائج ہوگی، اور جہاں یہ نقل پذیری موجود نہ ہوگی وہاں رواج غالب ہوگا۔ رواج کے اثر کے سلسلے میں مل نے بتلایا ہے کہ وہ طاقتور کے مقابلے میں کمزور کی حفاظت و حمایت کرتا ہے اور قوانین و حکومت کی عدم موجودگی میں کمزوروں کا واحد محافظ ہے۔ دوسری جانب رواج کے معنی بہت عام طور پر یہ ہیں کہ طاقتور کی موافقت میں کمزور کو عادتاً دبایا جائے جیسا کہ حرفتی پنچایتوں اور ذات پات میں یا جاگیری نظام کے تحت ہوتا ہے۔ رواج فرد واحد کی آزادی کی تحدید کرتا ہے اور اس کو نامناسب و غیر ضروری طریقے پر قوم کا حد سے زیادہ تابع بنا دیتا ہے۔

۱۶۔ رواج اور لگان

اب ہم یہ بیان کریں گے کہ قدیم زمانے میں مختلف

[1] دیکھو ٹی موریسن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۵۴۔

باب ۵ معاشی تعلقات پر رواج کا کیا اثر پڑا۔

لگان جو کسان، زمینداروں کو ادا کرتا تھا، زیادہ تر رواجی ہوتا تھا اور اس میں ایک نسل سے دوسری نسل میں جاکر کوئی تغیر و فرق پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض ایسے خاص حالات بھی تھے جو مسابقت کے تحت بھی لگان کو غیر تغیر پذیر بناتے تھے۔ مثلاً قدیم زمانے میں ہندوستان میں زمین کی رسد زیادہ اور طلب کم تھی اور اسامی ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ یہ حالت موجودہ زمانے کے برعکس تھی کہ آجکل زمین کی رسد کم اور طلب زیادہ ہے اور زمین کاشت کے لیے بہ مشکل دستیاب ہوتی ہے۔ بہرحال اس صورت حال کی توجیہ کم از کم ایک حد تک اس واقعے میں مضمر ہے کہ اسامی کو سیاسی حالات کی بدنظمی و بے امنی کے باعث اس بات کا ہمیشہ یقین نہ ہوتا تھا کہ زمین پر کاشت کرنے کے بعد وہ اپنی جائز پیداوار سے متمتع ہونے کے قابل ہوگا۔ 136
علاوہ ازیں دائمی جنگ و جدل کے حالات کے تحت اسامیوں کا زمیندار کے تابع فرمان رہنا بہت مفید و کار آمد تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بے امنی کے حالات کے پھیلے رہنے ہی کی وجہ سے اسامی اپنے زمیندار سے معاملہ طے کرنے میں سختی نہ برت سکتے تھے، اس لیے کہ وہی ان کا فطری محافظ تھا اور اس کی قوت و خوشحالی پر ان کا تحفظ موقوف تھا[1]۔ ان حالات نے زمیندار اور اس کے اسامی کے درمیان منصفانہ اور باہم نفع بخش تعلقات قایم کیے۔ لیکن جس وقت امن قایم ہوگیا زمیندار رواجی لگان وصول کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا تھا، اور یہ تبدیلی پھر بھی حقیقی تھی، اس لیے کہ اس میں مقررہ لگان وصول کرنے کے بجائے زائد محصول عائد کرنے کا ہنرمندانہ طریق کار پوشیدہ ہوتا تھا۔

۱۷۔ رواج اور اجرت۔

رہی اجرت تو زمین کی کاشت کے لیے اجرتی مزدوروں سے جس خفیف حد تک بھی کام لیا جاتا تھا اس حد تک بعض مسلمہ رواجوں کی بنا پر معاوضۂ محنت کی تنظیم کی جاتی تھی چنانچہ عام طریقہ یہ تھا کہ مزدور کو اس کے آجر کے مکان میں قیام و طعام مہیا کیا جاتا تھا یا

[1] دیکھو مارٹن لیک کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی زراعت کی اساس"، صفحہ ۱۳۰۔

باب ۵

جنس کی شکل میں مقررہ معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مزدور کو ایک طویل مدت تک بلکہ عام طور پر سال کے حساب سے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دیہی دستکاروں کو دیہی جماعت کی خدمات انجام دینے کا معاوضہ ازروئے رواج مقررہ سالیانہ کے طور پر جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا جو ہر کسان سے غلہ کوٹتے وقت ہی وصول کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح اس طریق پر متعلقہ فریقین کے نقطۂ نظر سے بحیثیت مجموعی بخوبی عملدر آمد ہوتا رہا۔ لیکن معاوضوں کی مقدار اس لحاظ سے تغیر پذیر ہوتی تھی کہ ہر سال کی فصل کی نوعیت کے اعتبار سے تحصیلات کی مقدار مختلف ہوتی تھی، اور چونکہ معاوضہ جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا اس لیے ویسی پیچیدگی پیدا نہ ہوتی تھی جیسی کہ موجودہ زمانے میں زر کی قوت خرید کے تغیرات کے باعث اجرت صحیحہ و اجرت متعارفہ کے درمیانی فرق و عدم مساوات کی بنا پر رونما ہوتی ہے۔

۱۸- رواج اور قیمت۔ خریدی ہوئی اشیاء کے معاوضے میں زر دینے کا طریقہ عام نہ تھا بلکہ استثنائی شکل رکھتا تھا۔ لیکن اس طریقے سے جس حد تک بھی خرید و فروخت عمل میں آتی تھی معمولی زمانے میں اس کو منظم کرنے کے لیے "رواج" طاقتور عامل تھا، اور ایک ایسے ماحول میں جہاں گاؤں کے قریب قریب سب معاملات رواج کے اثر کے تحت انجام پاتے تھے اس کے سوا کچھ اور ممکن بھی نہ تھا۔ لیکن غیر معمولی سالوں میں "رواج" مسابقت سے مغلوب ہو جاتا تھا، حتیٰ کہ قلت و خشک سالی کے زمانے میں قیمتیں بڑھ کر بہت اونچی سطح تک پہنچ جاتی تھیں اور افراط کے زمانے میں نہایت تیزی کے ساتھ نیچے آجاتی تھیں۔ ان مقامی تغیرات میں اعتدال پیدا کرنے والے بیرونی اثرات اس لیے مفقود تھے کہ ذرایع نقل و حمل ناقص ہونے کی وجہ سے بیرونی بازاروں تک گاؤں کی رسائی نہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع، منظم اور حساس بازاروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کل ملک کے لیے مسابقتی قیمتوں کی یکساں سطح جیسی کسی چیز کا وجود غیر ممکن تھا۔ چنانچہ ہم اوپر کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں کہ ملحقہ و ہمسایہ دیہات میں بھی قیمتوں میں عام طور پر حیرت انگیز فرق و اختلافات ہوا کرتے تھے۔

باب ۵

۱۹۔ قدیم معاشی نظام کے تحت شہر[1]

یہ اغلب ہے کہ گزشتہ صدی کے آغاز میں ہندوستان کی آبادی کا قریب قریب ۱۰ فیصد حصہ شہروں اور قصبات میں رہتا تھا اور یہ تناسب اسی زمانے کے بعض یورپی ممالک مثلاً فرانس یا روس کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہئیے کہ ہندوستان کی صنعتی آبادی اس وقت بڑی حد تک دیہات میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ خیال کیا گیا ہے کہ تقریباً ۴۰ فیصد آبادی دیہی و شہری صنایع پر انحصار کرتی تھی اور ۶۰ فیصد کا دارومدار زراعت پر تھا۔

اکثر قدیم ہندوستانی شہروں کی ابتدا اور خوشحالی کو مندرجۂ ذیل تین اسباب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ (۱) وہ جاترائی مقام تھے یا کسی نہ کسی طرح کے مقدس مقام تھے، مثلاً الہ آباد، بنارس، گیا، ناسک، پوری، یا (۲) وہ کسی دربار یا حکومت کا مرکز تھے یا کسی صوبے کا پائے تخت تھے، مثلاً دہلی، لکھنو، لاہور، پونہ، تنجور، ارکاٹ، یا (۳) وہ تجارتی منڈیاں تھے اور تجارتی راستوں پر مناسب محل وقوع کی وجہ سے ان کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی مثلاً مرزاپور، بنگلور، ہبلی وغیرہ۔

تجارتی شہروں کے مقابلے میں مقدس مقام اور حکومت کے مرکز زیادہ اہم تھے۔ مقدس شہروں مثلاً بنارس میں پیتل، تانبے اور بھرت کی صنعتیں عروج پر تھیں۔ اس لیے کہ مقدس برتن، باسن اور ظروف یہاں بنائے جاتے تھے جن کی مانگ جاترائیوں اور زائرین میں مستقل اور کثیر تھی۔ درباری شہر بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھے۔ ان کی تعداد بھی کثیر تھی۔ وہ صرف شاہی درباروں کے سلسلے میں وجود میں نہیں آئے بلکہ چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور نوابوں کی حکومت کا مرکز ہونے کی وجہ سے بھی بن گئے۔ ان کی سرسبزی و خوشحالی کا انحصار بدیہی طور پر دربار یا دارالسلطنت کی قدردانی و سرپرستی پر تھا، اور جب شاہی دربار یا دارالسلطنت منتقل ہوا یا تباہ ہوا ان کو بھی زوال آیا جیسا کہ دکن کے قدیم حکومتی مرکزوں مثلاً دیوگیری، پیٹھن، بیجاپور اور وجیانگر کے

[1] شہروں کے متعلق ہمارا بیان زیادہ تر گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا پر مبنی ہے۔

بارے میں ہوا جو اس وقت بے رونق کھنڈر ہیں۔ اس قسم کے شہروں میں سامان تعیش تیار کرنے والی صنعتیں غالب تھیں، مثلاً اعلیٰ درجے کی پارچہ بافی، زردوزی، طلائی و نقروی صنعت، ہاتھی دانت کے کام کی صنعتیں اور دوسری متعدد قسموں کی فن کاری اور دستکاری۔ یہ صنعتیں اس زمانے میں بام عروج پر پہنچ گئی تھیں اور جملہ شیدائیان فن سے خراج تحسین و توصیف وصول کرتی تھیں۔ تجارتی شہروں کی اہمیت کا باعث یہ تھا کہ وہ تجارتی شاہراہوں پر واقع تھے اور سہولت کی بدولت انھوں نے چوراہے کے گاؤں سے ترقی کرکے شہروں کی حیثیت حاصل کرلی چونکہ اس زمانے میں ہندوستان کی داخلی و خارجی تجارت کا پیمانہ بڑا نہ تھا، اس لیے اس قسم کے شہروں کی اہمیت محدود رہی۔ تاہم ان کی حیثیت ان شہروں کی حیثیت کے مقابلے میں جو درباروں کی خوشحالی و قدردانی پر منحصر تھے زیادہ ثبات پذیر تھی۔ باب ۵

اس زمانے میں بھی شہری زندگی کی اہم خصوصیات، دیہی برادریوں کی زندگی کی خصوصیات سے فطری طور پر مختلف تھیں۔ اس لیے کہ ان کی آبادی نسبتاً زیادہ تھی جس کا
138 گزارہ ہمسایہ و ملحقہ دیہات کے غلے کی درآمد پر تھا۔ شہروں کے پیشوں اور حرفوں میں زیادہ تنوع تھا، ان کی صنعت کی تنظیم بدرجہا بہتر تھی اور ان کے بازار وسیع تھے۔ علاوہ ازیں شہروں میں مبادلات میں زر کا لین دین بہت زیادہ ہوتا تھا، حرفت میں زیادہ آزادی سے کام لیا جاتا تھا اور اعتبار کی تنظیم بہت اچھی تھی۔ اشیا کو جمع کرنے اور اس کے بعد فروخت کرنے کی غرض سے ان کو تقسیم کرنے کا طریقہ بہت قدیم زمانے ہی میں خاصا ترقی پا چکا تھا۔ تجارتی اغراض کے لیے معقول انتظام کی موجودگی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں ملکی اعتباری دستاویزات استعمال کیے جاتے تھے اور ایک ساہوکار یا تاجر دوسرے کے نام ہنڈی تحریر کرتا تھا۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اس طریقے پر ہندوستان کے طول و عرض میں ایک حساب سے دوسرے حساب میں زر بآسانی منتقل کیا جاتا تھا۔ بڑی تجارتی کوٹھیاں صرف زر کا کاروبار ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ سامان اور اشیا کی بھی تجارت کرتی تھیں مثلاً مرزاپور اور بنارس میں ایسے سوداگر موجود تھے جو سامان فراہم و جمع کرکے بہت وسیع رقبے میں تقسیم کرتے تھے۔

باب ۵

۲۰۔ ہندوستانی صنعتیں ماضی میں۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کبھی صنعتی ملک رہا ہی نہیں اور اس کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ وہ زرعی ملک بنا رہے۔ لیکن اگر اس بیان کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان میں زراعت ہمیشہ سے اہم صنعت رہی ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ہندوستان اصطلاح کے جدید مفہوم میں صنعتی ملک نہیں رہا ہے تو اس سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے، گو یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ انگلستان اور موجودہ زمانے کے دوسرے ممالک بھی جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ تھے، اپنی تاریخ کے زیادہ دور نہیں بلکہ متصل زمانے میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو ہندوستان موجودہ زمانے میں رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس بیان کا مفہوم یہ قرار دیا جاتا ہے کہ ہندوستان سراسر زرعی ملک تھا اور یہاں اس کے سوا کوئی دوسری صنعت قابل لحاظ نہیں تھی تو ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کی شہادت پر اس بیان کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔[1] سنہ ۱۹۱۸ء کے صنعتی کمیشن کا قول ہے کہ "ایسے زمانے میں جبکہ مغربی یورپ یعنی جدید صنعتی نظام کا مقام ولادت، غیر مہذب قوموں سے آباد تھا، ہندوستان اپنے حکمرانوں کے تمول اور اپنے دستکاروں کی اعلیٰ درجے کی فنی مہارت کی بنا پر مشہور تھا۔ بلکہ اس کے بہت بعد کے زمانے میں بھی جبکہ مغرب کے مہمات پسند تاجر پہلی دفعہ ہندوستان میں وارد ہوئے، یہ ملک صنعتی ترقی کے اعتبار سے یورپ کی زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں کسی طرح پیچھے نہ تھا۔"[2] پروفیسر ویبر ارقام فرماتے ہیں کہ "نازک قسم کے بافتہ پارچوں کی تیاری، رنگ آمیزی، فلز کاری، قیمتی پتھروں کے کام اور ہر قسم کی فنی صنعتوں میں ہندوستانیوں کی مشاقی و مہارت کو عالمگیر شہرت حاصل رہی ہے۔[3] مصر میں دو ہزار سال قبل ولادت مسیح کی

۱۔ دیکھو رمیش چندر دت کے تصانیف ہندوستان کی معاشی تاریخ کے بارے میں۔

۲۔ دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۔

۳۔ دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ میں موصوف کا اختلافی نوٹ۔ صفحہ ۲۹۵۔

باب ۵ موسیائی اور مسالے سے ڈھکی ہوئی لاشیں بہترین قسم کی ہندوستانی ململ میں لپٹی ہوئی ملی ہیں۔ روم میں ہندوستانی مصنوعات بڑے پیمانے پر صرف ہوتی تھیں

139 اور یونانی ڈھاکہ کی ململ کو گنجیتکا[1] کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آہنی صنعت بھی ترقی کے بہت ہی بلند معیار پر پہنچ گئی تھی، جیسا کہ دہلی کے نواح کے مشہور ڈھلے ہوئے آہنی ستون سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح صنعت سے "نہ صرف جملہ مقامی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں بلکہ اس کی بدولت ہندوستان اس قابل بھی ہوگیا تھا کہ اپنی مکمل مصنوعات غیر ممالک کو برآمد کرے"[2]۔ علیٰ ہذا ہندوستان اپنی ریشمی مصنوعات، اونی شالوں، صندل کی لکڑی کے صندوقچوں اور چھری چاقو کے لیے مشہور آفاق تھا۔ متعدد غیر ملکی سیاحوں نے اس کے سرسبز اور ترقی یافتہ صنائع اور حرفتوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ بیرونی حملہ اور ملک گیری کی موجوں نے جو یکے بعد دیگرے گیارھویں صدی سے اٹھنی شروع ہوئیں، ہندوستانی صنعتوں کی ترقی میں ایک زمانے تک بہت بڑی مزاحمت پیدا کردی۔ لیکن پرسکون حالات کے عود کرآنے کی وجہ سے خاصکر اکبر اعظم کے دور حکومت میں بظاہر ان صنعتوں میں حیات تازہ کے آثار نمودار ہوئے اور وہ اپنی سابقہ حالت پر پوری طرح آگئیں۔ اس زمانے میں ہندوستان سے سوتی و ریشمی اشیا کثیر تعداد میں ایران، شام اور عرب کو برآمد کی جاتی تھیں۔ چنانچہ اسی تجارت اور خوشحالی کی بنا پر یورپ کے تاجروں کے لیے ہندوستان مرکزِ کشش بنا۔ اس زمانے میں ان میں ہندوستان میں اپنا قدم جمانے کے لیے جو رقابت پیدا ہوئی وہ ملک کی اشیائے خام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس کے مختلف النوع اور بیش قیمت مصنوعات اور دستکاری کے نمونوں کی بنا پر۔ چنانچہ ہندوستان کے کتان، چھینٹ کیلی کو، جواہرات، زردوزی کے کام[3] اور اونی و ریشمی مصنوعات ہی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی منفعت بخش تجارت کی بنیاد مہیا کی۔

۱؎ (Gangetika)

۲؎ ۔ دیکھو اناڈے کی کتاب موسوم بہ "مضامین معاشیات ہند" صفحہ ۱۷۱۔

۳؎ ۔ دیکھو مالویہ کا اختلافی نوٹ صنعتی کمیشن کی رپورٹ میں صفحہ ۲۹۶ تا صفحہ ۲۹۷

باب ۵

گزشتہ صدی کے آغاز میں ہندوستان کی شہری صنعت زیادہ تر ایسی دستکاریوں پر مشتمل تھی جو عمدہ قسم کے بنے ہوئے پارچے اور دوسرا ساماں تعیش طبقۂ امرا کے لیے تیار کرتی تھیں۔ اس کی تنظیم دیہی صنعت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھی، اور یہی بیرونی مسابقت کی زد میں سب سے اول آئی۔ دستی پارچہ بافی یقیناً اہم ترین صنعت تھی، اور اس میں بھی سوتی مصنوعات بلاشبہ اول نمبر پر تھیں اور ہندوستان میں ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔ بقول آر۔ سی۔ دت "پارچہ بافی قومی صنعت تھی اور لاکھوں عورتیں سوت کاتنے کا پیشہ کرتی تھیں"۔[1] سوتی مصنوعات کے زیادہ اہم مرکز ڈھاکہ، لکھنؤ، احمد آباد، ناگپور اور مدورا تھے۔ کشمیری شال مشہور ترین اونی پیداوار تھی، لیکن یہ صنعت کشمیر تک محدود نہ تھی بلکہ پنجاب کے متعدد شہروں میں بھی رائج تھی۔ علاوہ ازیں دھات کی صنعتیں موجود تھیں جو پیتل تانبے اور بھرت کے ظروف تیار کرتی تھیں، چنانچہ ان مصنوعات کے مرکز بنارس، ناسک، پونا، احمد آباد، وزاگاپٹم اور تنجور تھے۔ پنجاب اور سندھ میں ہتھیار اور ڈھالیں بنائی جاتی تھیں۔ راجپوتانہ کے شہروں کو مینا کاری کے زیور تیار کرنے اور پتھر تراشنے 140
کے فنی کاموں میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ دوسری دستی صنعتیں بھی موجود تھیں، مثلاً جیسے سونے اور چاندی کے تار بنانا، سنگ مرمر اور صندل کی لکڑی کا کام کرنا، آرائشی انگوٹھیاں بنانا، شیشہ سازی، دباغت اور چرمی کام، کاغذ سازی اور عطر سازی۔

ایک سو سال پیشتر صنعت جہاز سازی اتنی کافی سرسبز حالت میں تھی کہ اس کی بنا پر انگلستان کے جہاز سازی کے کارخانوں میں رشک و حسد پیدا ہوا، لیکن ہندوستان کو ان کے مقابلے میں کامیاب کرنے والی سہولت یہ تھی کہ یہاں عمدہ قسم کی لکڑی بڑی مقدار میں موجود تھی جو آہن پوش و خانی جہازوں کے پیشتر کے زمانے میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔

شہری دستکاریاں مختلف ذاتوں کے لحاظ سے مختلف حرفتی جتھوں میں منظم تھیں اور ان کی حیثیت موروثی پیشوں کی تھی۔ یہ جتھے باہمی امدادی انجمنوں کی طرح کام کرتے تھے اور رکنیت کے شرائط اور کام کی خوبی کی نگرانی کرتے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تقسیم عمل بہت بڑی حد تک اور تخصیص صنایع خفیف حد تک موجود تھی،

[1] دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۳۸۔

باب ۵

گو ہر اہم شہر اپنا مختلف دستکاریوں کا پورا لوازمہ یا دستہ رکھتا تھا۔ اس طرح شہری صنعت دیہی غیر زرعی صنعت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر طریق پر منظم تھی۔ ہر جگہ کی دستکاریوں کے مثل یہاں بھی تنہا کام کرنے والے دستکار کے پاس اصل کی زیادہ مقدار نہ ہوتی تھی۔ وہ عام طور پر فرمایش کے لحاظ سے کام کرتا تھا اور اس کے گاہک اس کو اشیائے خام مہیا کر دیتے تھے۔ چونکہ دستکار صنعت کے خانگی نظام کے تحت زندگی بسر کرتا تھا اس لیے وہ کسی محنت اور کوشش کے بغیر اپنے پیشے کا راز اپنے باپ سے سیکھ لیا کرتا تھا اور موروثی خاندانی پیشوں کے نظام کی بدولت اس کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اس کی حیثیت محفوظ اور یقینی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ دستکار موجودہ حالت کے مقابلے میں اس وقت اس لیے بہت زیادہ خوشحالی اور سرسبزی کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا کہ اس کے تیار کیے ہوئے سامان کی مانگ یقینی تھی۔ لیکن اس کی معاشی حالت کا حد سے زیادہ خوشگوار خاکہ کھینچنا آسان نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ پارچہ باف عام طور پر وہ کل منافعہ حاصل کرنے کے قابل نہ ہوتا تھا جو اس کے تیار کردہ سامان کی سرگرم طلب سے وصول ہوتا تھا۔ اس منافعے کا بیشتر حصہ وہ بیچ والا آجر وبالیتا تھا جو پارچہ باف کو زر مستعار دیتا تھا اور عام طور پر اس قابل ہوتا تھا اور بعض اوقات یہ نیت رکھتا تھا کہ پارچہ باف سے جتنا زیادہ کھینچ سکے کھینچے۔

۲۱۔ ہندوستانی صنعتوں کے زوال کے اسباب

دستکاریوں کا زوال گو بعض صورتوں میں بہت جلد یعنی اٹھارھویں صدی کے آخر میں شروع ہوا لیکن تقریباً انیسویں صدی کے وسط میں بہت نمایاں ہو گیا۔ اس کے اسباب حسب ذیل قرار دیے جا سکتے ہیں۔

(۱) شاہی درباروں کا اجڑنا۔

شاہی درباروں اور امرا کی سرپرستی و قدردانی کے مفقود ہونے کے معنی یہ تھے کہ دستی صنعتوں کی پیداوار کی سب سے بڑی مانگ موقوف ہو جائے اور اس کی وجہ سے ان میں زوال پیدا ہو۔ چنانچہ بنگال کی سوتی اور ریشمی مصنوعات زیادہ تر عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے وجود پر منحصر تھیں جس کے مرکز دہلی، آگرہ اور لاہور تھے۔ اور اس سلطنت کی شکست کے ساتھ جو اورنگ زیب کی وفات
141
کے بعد شروع ہوئی، بنگالی مصنوعات کی خوشحالی فطری طور پر زائل ہونے لگی۔[1] جوں جوں

[1] دیکھو مورلینڈ صاحب کی کتاب "اکبر سے اورنگ زیب تک" ۱۲

باب ۵ برطانوی اقتدار بڑھتا اور پھیلتا گیا، شاہی درباروں اور امرا کی سرپرستی تیزی کے ساتھ اُٹھتی گئی اور جو صنعتیں ان کے سہارے زندہ تھیں ان کو فوراً زوال آیا۔ چنانچہ لکھنؤ اور ٹنجور کی صنعتیں اسی طرح تباہ ہوئیں۔

(ب) مخالف غیر ملکی اثرات کا عمل[1]

برطانوی حکمرانی کے آغاز نے ان حرفتی جتھوں اور دوسری جماعتوں کے اقتدار کو بالواسطہ کمزور کر دیا جو تجارت کا انتظام اور استعمال ہونے والی اشیائے خام کی خوبی کی نگرانی کرتی تھیں۔ آبادی کو بے ہتھیار کرنے اور امن قایم کرنے کے عمل کا ان صنعتوں پر بہت مضر اثر پڑا جو اسلحہ اور آلاتِ حرب تیار کرتی تھیں۔ جن لوگوں کی قدر دانی کی بدولت دستکاریاں ترقیاں کر رہی تھیں ان کے جانشین اب یورپین افسر، غیر ملکی سیاح اور ہندوستانیوں کی نئی تعلیم یافتہ پیشہ ور جماعت تھی۔ گو ہندوستان میں رہنے والے یوروپین، یورپ سے درآمدہ مال کو فطری طور پر ترجیح دیتے تھے، پھر بھی ان دستکاریوں کی خفیف سی یورپی طلب نے ان کی تباہی کو روکنے میں مدد دی لیکن یوروپی مذاق کے مطابق نئی نئی شکلوں اور نمونوں کے رواج اور ان اشیا کی روز افزوں مانگ نے ہندوستانی دستکاریوں کی خوبی اور کاریگری پر مضر اثر ڈالا۔ تعلیم یافتہ پیشہ ور جماعت بحیثیت مجموعی، حکمران قوم کے معیاروں کے زیرِ اثر دیسی حرفتوں کی پیداوار استعمال کرنے سے گریز کرتی رہی اور سودیشی اشیاپر ہ درآمدہ اشیا کے صرف کو ترجیح دیتی تھی۔ اس طرح شاہی درباروں کی قدیم قدر دانی اور سرپرستی کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے جو کمی پیدا ہو گئی تھی وہ جدید نظام اشیا کے تحت صرف جزوی حد تک پوری ہوئی۔

(ج) ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمینٹ کی پالیسی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی میلانات ابتداً اس کو ہندوستانی صنعتوں کی ہمت افزائی کی جانب لے گئے۔ چنانچہ اس کی تجارت برآمد کا انحصار زیادہ تر ان ہی صنعتوں پر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی فرمائشوں کے ساتھ پیشگی قیمت ادا کر کے، قرضہ دے کر اور دوسرے طریقوں سے ان کی مالی معاونت کرتی رہی۔ لیکن انگلستان کے حقوق قائمہ

[1] دیکھو ڈی۔ آر۔ گاڈگل کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۵۴۔

باب ۵ نے اس پالسی کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور اس غرض سے پارلیمنٹ میں اپنے اثر سے کام لیا تاکہ کمپنی مذکور ہندوستان سے ان ہی اشیاءِ خام کی برآمد پر توجہ مرتکز کرے جو انگریزی مصنوعات کے لیے درکار تھیں[1]۔ انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگلستان اور ہندوستان کی تجارت کی مخالفت کی وجہ سترھویں صدی کے آخر میں یہ بھی ہوئی کہ اس تجارت کی بنا پر سونا انگلستان سے نکل کر ہندوستان جا رہا تھا۔

142 اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں، انگلستان نے ہندوستان کے مال پر محصول درآمد عاید کیا جس کا دوہرا مقصد تھا یعنی (۱) اپنے اونی و ریشمی مصنوعات کی تامین اور (۲) برِاعظمی جنگوں کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے آمدنی کی توفیر۔ سنہ ۱۷۰۰ء تا ۱۸۲۴ء میں رنگین ہندوستانی چھینٹ کی درآمد انگلستان میں قانوناً ممنوع قرار دی گئی، البتہ سادہ ململ اور چھینٹ نیز ہر قسم کے ریشمی پارچوں اور سوتی اشیاء کو جن کی مکرر برآمد براعظم میں کرنا مقصود تھا، مستثنیٰ رکھا گیا۔ بقول آر۔سی۔ دت "اٹھارھویں صدی میں ہندوستان نہ صرف بہت بڑا زرعی بلکہ بہت بڑا صنعتی ملک بھی تھا، اور ہندوستان کے پارچہ بافی کے دستی راچھ اور چرخے ایشیا اور یورپ کے بازاروں کی مانگ کو تمام و کمال پورا کرتے تھے۔ یہ بدقسمتی سے صحیح ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ نے ایک سو سال پیشتر کے خود غرضانہ تجارتی اصول پر عمل پیرا ہو کر برطانوی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں انگلستان کی نوخیز صنعتوں کی ہمت افزائی کی خاطر ہندوستانی مصنوعات کی حوصلہ شکنی کی۔ پارلیمنٹ کی مقررہ پالسی جس پر اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے اور انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں عمل کیا گیا یہ تھی کہ ہندوستان کو برطانیہ عظمیٰ کی صنعتوں کا محتاج و دستِ نگر بنایا جائے اور اہل ہند کو مجبور کیا جائے کہ برطانیہ عظمیٰ کے دستی کارخانوں اور کپڑا بننے کی کلوں کے لیے خام مال مہیا کرنے کی غرض سے صرف اشیائے خام تیار کریں۔ اس پالسی پر مضبوط و مصمم ارادے سے عمل کیا گیا اور اس کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو ہندوستانی صنعتوں کی کامل ہلاکت و تباہی کا باعث ہوئی۔ احکام جاری کیے گئے کہ ہندوستانی دستکاروں کو کمپنی مذکور کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے"۔

[1] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۵۷۔

باب ۳

تجارتی نگرانکاروں اور ایجنٹوں کو ہندوستانی جلاہوں کی برادریوں اور دیہاتوں کے بارے میں وسیع اختیارات استعمال کرنے کا قانوناً مجاز گردانا گیا، محصول درآمد کے ذریعے سے ہندوستانی ریشمی و سوتی مصنوعات کی درآمد انگلستان میں ممنوع قرار دی گئی، اور انگریزی مصنوعات کو ہندوستان میں بلا محصول بے روک ٹوک یا برائے نام محصول لگا کر درآمد کیا گیا[1]۔ انگلستان میں ہندوستانی سامان پر ۳۰ تا ۸۰ فی صد محصول درآمد عاید کیا گیا تھا اور بعض صورتوں میں ہندوستان سے درآمد کرنے کی کلیتہً ممانعت تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت ہندوستان سے انگلستان کو اشیا کی برآمد کو کسی حد تک نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی[2]۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ ہندوستان اور دنیا کے بازاروں میں انگریزی اشیا مسابقت کر رہی تھیں[3]۔ اگر اس قسم کے بھاری محصول اور امتناعی احکام موجود نہ ہوتے تو پیزلی اور مانچسٹر کی گرنیاں ابتدا ہی میں بند ہو جاتیں اور خواہ بھاپ کی قوت ہی کیوں نہ استعمال کی جاتی ان کا کام موقوف رہتا۔ لیکن ہندوستانی صنعتوں کا بھینٹ چڑھا کر ان گرنیوں میں جان ڈالی گئی۔ برطانوی صناع نے ایسے رقیب و حریف کو زک دینے کے لیے جس سے وہ مساوی شرائط پر مسابقت کر ہی نہیں سکتا تھا، سیاسی ناانصافی کو اپنا آلہ کار بنایا[4]۔ انگلستان

---

[1] دیکھو آر۔ سی۔ دت کی کتاب موسوم بہ "معاشیاتِ ہند ابتدائی برطانوی حکمرانی کے تحت" صفحہ ۷ تا صفحہ ۸۔

[2] لیکن ہندوستانی سوتی صنعت کے زوال کی توجیہ کے سلسلے میں ان تامینی تدابیر کے اثر پر زور دینے میں جو انگلستان میں ہندوستانی اشیا کی درآمد روکنے کے لیے اختیار کی گئی تھیں عام طور پر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ "انگلستان کا بازار، ہندوستان کے سوتی پارچوں کی برآمد کی حد تک اس وسیع بازار کا بہت ہی چھوٹا سا جز و تھا جو چین و جاپان سے لیکر اسپائس آئلینڈز، برما، بیگو، عرب، مغربی آفریقہ اور تمام یورپ پر پھیلا ہوا تھا" (مورلینڈ)۔

[3] دیکھو سی۔ جی ہیملٹن کی کتاب موسوم بہ "تجارتی تعلقات مابین ہندوستان و انگلستان" صفحہ ۱۶۳۔

[4] یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر انگریزی مصنوعات کی تامین ہندوستانی اشیا کے مقابلے میں نہ بھی کی جاتی تو بھی انگلستان کی مصنوعات کلوں کی سہولت کے باعث ترقی کرتیں۔ لیکن ہیچ ہیچ ولسن کا قول جو اوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ اگر انگلستان کو ہندوستان کے اغراض کی حفاظت کی اتنی ہی فکر ہوتی جتنی اپنے اغراض کی بابت تھی تو وہ ہرگز ہندوستان پر تجارت آزادی پالسی کی پابندی عائد کر کے اس کے برخلاف خود تجارت مامون کی پالسی پر عمل نہ کرتا۔

اس وقت سوتی مصنوعات تیار کر رہا تھا جن کے لیے ہندوستان ایک اچھا بازار تھا، باب ۵۔ 143
چنانچہ اس بازار کا استعمال کرنے کی غرض سے اس نے اپنے سیاسی اقتدار سے کام لینے میں تامل نہیں کیا۔" اس کا قرینہ نہ تھا کہ برطانوی حکومت ایک ایسی دور افتادہ قوم کے ساتھ جو اس کے زیر اقتدار آ گئی تھی اس سے کم خود غرضانہ برتاؤ کرے گی جتنا کہ اس نے امریکہ کی برطانوی نوآبادیات کے ساتھ کیا تھا۔[1] انگلستان میں ہندوستانی مصنوعات کی فروخت کو روکنے کے لیے جو محصول درآمد عاید کیے گئے تھے وہ صرف انیسویں صدی کے وسط میں جاکر اٹھائے گئے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برطانوی مصنوعات کی بے روک مسابقت ہندوستان اور بیرونی بازاروں میں ہندوستان کی ملکی صنعتوں کو پوری طرح نیست و نابود کر چکی تھی۔

(۴) کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت۔

اس زمانے میں ہندوستانی پارچوں اور دوسرے مصنوعات کی کساد بازاری کا اہم ترین سبب انگلستان کا صنعتی انقلاب تھا۔ ہندوستان کی گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی دستی صنعتیں کسی طرح غیر ملکی مسابقت کی تاب نہ لاسکتی تھیں جو اعلیٰ درجے کی صنعتی تنظیم، دیوہیکل کلوں، بڑے پیمانے کی پیدائش، پیچیدہ قسم کے تقسیم عمل اور ترقی یافتہ ذرائع نقل و حمل و وسائل آمد و رفت کی وجہ سے اور بھی زیادہ طاقتور ہوگئی تھی۔ بقول دت "یورپ میں قوت سے چلنے والے راچھ کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔" ہندوستان کی صنعت جہاز سازی بھی اس سے نہ بچی، اور ہندوستانی جہازوں کی جگہ برطانوی تجارتی جہازوں نے لے لی۔ یہ ایک حد تک اس پالیسی کا نتیجہ تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس (مجلس نظما) نے ہندوستانی جہاز رانی و جہاز سازی کے خلاف انگلستان میں ہیجان پیدا ہونے کے جواب میں اختیار کی تھی۔ علیٰ ہذا دوسری ہندوستانی صنعتوں مثلاً لوہا پگھلانے کا کام، شیشے کی صنعت اور کاغذ سازی پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ہندوستان میں لارڈ ڈلہوزی کے زمانے سے سڑکوں اور خاصکر ریلوں کی تعمیر کی بدولت ذرائع نقل و حمل کے

[1] ۔ دیکھیے ایل، بی، جینڈ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۸۵۔

باب ۵

انقلاب نے ملک کے اکثر اندرونی اور دور افتادہ علاقوں کو بھی درآمد اشیا کے لیے کھول دیا
اور اس طرح مسابقت کی قوت میں مزید شدت پیدا کر دی[1]۔ سڑکیں، ٹیلی گراف،
ریلیں، نہر سویز کی تعمیر، جہازوں کے کرایہ کی تخفیف، خاصکر سنہ ۱۸۲۰ء کے بعد، جس کی
بدولت انگریزی مصنوعات کی برآمد کے مصارف کم ہو گئے، غرض ان سب چیزوں
نے ہندوستانی دستکار کی دشواریوں کو اور بھی بڑھا دیا اور اس کو بہت جلد تباہ کر دیا۔[2]
ریلوں کی تعمیر اس قدر سرعت سے ہوئی کہ ہندوستانی دستکار کو نئے حالات کے مطابق
اپنے آپ کو بنانے اور اپنے لیے کوئی منفعت بخش ذریعۂ معاش اور پیشہ تلاش
کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ چونکہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا اور دستکاروں کو اپنے 144
ہی ذرائع پر انحصار کرنا پڑا، اس لیے دستکار ہزاروں کی تعداد میں اپنے روایتی پیشے
ترک کر کے زراعت میں جا گھسے اور اس طرح انھوں نے زمین پر آبادی کے دباؤ
کو بڑھا دیا۔ اگر ریلوں کی تعمیر کی رفتار نسبتہً سست ہوتی اور تغیر زیادہ تدریجی طریقے
پر واقع ہوتا تو ممکن تھا کہ ہندوستانی صنعتوں کی جانب سے زیادہ قوتِ مقاومت
ظاہر ہوتی، پیشہ زراعت اختیار کرنے کی جانب لوگ اتنی کثیر تعداد میں مائل نہ
ہوتے اس کے بدل کے طور پر دوسرے پیشوں کی تلاش کی جاتی اور ان سے استفادہ
کیا جاتا اور عبوری دور میں جو مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں ان میں بڑی حد تک
کمی ہو جاتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انقلاب اس قدر اچانک طور پر رونما ہوا تھا کہ
اس قسم کی از سرِ نو تنظیم کا موقع ہی نہ ملا۔[3]

(۵) حکومت ہند کی عدم مداخلت کی پالیسی۔

حکومت نے صرف یہی نہیں کیا کہ دشواریوں میں پھنسی ہوئی دستی صنعتوں کی دست گیری سے باز رہی بلکہ بعض اوقات اس نے اپنے اصول سے ہٹ کر ہندوستانی بازار سے نفع حاصل کرنے میں انگریزی مصنوعات کی براہ راست مدد کی۔ ریلیں انگریز صناعوں کی

---

[1] دیکھو کتاب ہذا جلد دوم "نقل و حمل" کا باب۔
[2] دیکھو اے پیٹرسن کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں صنعتی ارتقا" صفحہ ۲۰۔
[3] دیکھو اے لوئے کی کتاب موسوم بہ "ہندوستانی قحط" صفحہ ۱۰۰۔

باب ۵

تیار کی ہوئی پیداوار کو ملک میں ہر جگہ پہنچاتی تھیں، جس کی وجہ سے دیسی اشیا کی جگہ بدیسی اشیا نے لے لی، اور اشیائے خام کی برآمد کی بہت افزائی کرتی تھیں۔ ملک کی تجارت داخلہ کی قربانی دے کر تجارت خارجہ کو توسیع و ترقی دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ذرائع کی یکطرفہ ترقی ہوئی۔ جیسا کہ راناڈے کا قول ہے "ہندوستان جیسے بڑے ملک نے انگلستان کے زیر نگیں آکر اس (انیسویں) صدی میں قدیم نوآبادیات کی خالی جگہ پر کر دی۔ اس محکوم ملک کو ایک مزرعہ یا کھیتی خیال کیا جانے لگا ہے کہ وہ خام پیداوار تیار کرتی رہے جس کو برطانوی ایجنٹ برطانوی جہازوں میں لاد کر وطن روانہ کریں تاکہ برطانوی مہارت اور اصل کی مدد سے مصنوعات تیار کی جائیں اور برطانوی تاجران مصنوعات کو ہندوستان اور دوسرے مقامات کی برطانوی کمپنیوں کے ذریعے سے اس محکوم ملک میں مکرر برآمد کریں۔ بھاپ کی قوت کے استعمال اور کلوں کو چلانے کی مہارت کی ترقی اور ذرائع نقل و حمل و آمد و رفت کی توسیع نے محض اس زمانے کے رجحان کو مزید تقویت پہنچائی اور اس تغیر کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس عظیم الشان محکوم ملک میں زرعی پیشوں کی جانب میلان بتدریج بڑھتا گیا اور ملکی صنعتوں کا سریع زوال واضح اور نمایاں ہوتا گیا۔" ممکن ہے کہ ہندوستانی خریدار کو ارزاں غیر ملکی اشیا سے کچھ فائدہ ہوا ہو۔ لیکن یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ دیسی دستی صنعتوں سے محنت کے ہٹ جانے اور اس کے نتیجے کے طور پر زراعت میں مرتکز ہو جانے کی وجہ سے قحط کے امدادی کاموں کے مصارف بہت بڑھ گئے اور اسی وجہ سے خریدار پر محصول ادا کرنے والے کی حیثیت سے بار پڑا۔

۲۲۔ ہندوستان اور انگلستان کے صنعتی انقلاب میں تضاد۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان میں بھی صنعتی انقلاب نے قدیم حالات کو بدل کر جو جدید نظام اشیا قایم کیا اس کی وجہ سے بہت کچھ بے ترتیبی اور خلل ہونا ہوا اور دستکاروں کو بہت کچھ مصائب اور دشواریوں کا سامنا رہا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت انگلستان نے 145
بے کار و بے روزگار پارچہ بافوں اور دوسرے دستکاروں کی

لہ۔ دیکھو راناڈے کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۹۹ تا صفحہ ۱۰۷۔

باب ۵

حالت زار سے مساوی تغافل برتا اور حکومت کے ایجابی عمل کا مقصد یہ تھا کہ جدید اصلاح اور ہنماؤں کے لیے راستہ صاف کیا جائے اور دستکاروں کی تکلیف و مصیبت رفع نہ کی جائے۔ لیکن انگلستان میں کام سے ہٹائے ہوئے مزدور سخت مصیبت کے مختصر دور کے بعد فوراً ہی جدید کارخانوں اور بڑی فیکٹریوں میں جذب ہو گئے۔ زراعت پیشہ آبادی بڑھنے کی بجائے شہری صنعتوں میں آبادی کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، چنانچہ جدید صنعتوں میں محنت کی طلب اس قدر کثیر و شدید تھی کہ اس کو پورا کرنے کے لیے دیہی بستیاں اجڑ گئیں اور صنعتی انقلاب کے نتیجے کے طور پر انگلستان نے بے نظیر خوشحالی اور اقتدار کے دور میں قدم رکھا۔ ہندوستانی انقلاب نے ان سب اعتبارات سے بالکل مختلف نتائج پیدا کیے۔ ہندوستان کا صنعتی انقلاب ایسی قوتوں کا نتیجہ تھا جو ملک سے باہر پیدا ہوئی تھیں، اور کلوں کی بنی ہوئی اشیا جن کا مقابلہ دستکاروں کو کرنا پڑا، ایک زمانۂ دراز تک ہندوستان میں تیار ہی نہیں کی جاتی تھیں بلکہ یورپ کے کارخانوں میں بنتی تھیں[1]۔ ملک میں بڑے پیمانے پر کام آنے والی جدید صنعتوں کی عدم موجودگی کے باعث بے کار دستکاروں کو مجبوراً زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا اور ملک پہلے سے بہت زیادہ دیہی اور زرعی ہو گیا۔ دستکار نے کسان کا جدید پیشہ اختیار کر کے اپنی معاشی حالت کو قطعی طور پر پہلے سے زیادہ سقیم اور گرا ہوا پایا۔ اس کے برخلاف انگلستان میں اس کے ہم پیشہ بھائی نے نئی فیکٹریوں میں پُر منفعت کام پا کر اپنی مالی حیثیت کو عام طور پر مستحکم کر لیا تھا۔ رہا یہ امر کہ معاشی انقلاب کا اثر ملک پر بحیثیت مجموعی کیا پڑا تو یہ سوال ابھی تک قابل بحث ہے کہ آیا زراعت، آبپاشی اور نقل و حمل کے ذرایع کی ترقی و توسیع کے باوجود گزشتہ سو[2] سال میں قومی مقسوم میں قابل لحاظ اضافہ ہوا یا نہیں[3]۔

ملک کا دیہی صنعت کی جانب روز افزوں میلان جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے،

[1] ہندوستان کے معاشی انقلاب نے تمام تر نقل و حمل ہی کو متاثر کیا اور اس کا اہم ترین نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت داخلہ و خارجہ میں توسیع و ترقی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ زراعت یا صنعت میں پیدائش کے طریقوں میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

[3] دیکھو جلد دوم میں "قومی مقسوم" کے متعلق باب۔

باب ۵ مردم شماری کے ان اعداد و شمار سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے جو زراعت پر گزارہ کرنے والے لوگوں کی فیصد تعداد سے متعلق ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں اس سال کے قحط کمیشن نے یہ پایا کہ زرعی پیشے پر گزارہ کرنے والوں کی تعداد ان اشخاص سے بدرجہا زیادہ تھی جو زمین کی مکمل کاشت کے لیے مطلوب تھے، اور یہ میلان اس کے بعد سے برابر قوی ہوتا چلا آرہا ہے۔ زمین پر آبادی کا دباؤ سب صوبوں میں بڑھ گیا ہے، صرف پنجاب ہی غالباً

148 ایسا صوبہ ہے جہاں صورت حال میں بہت زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے زرعی آبادی کا فیصد مجموعی آبادی کے مقابلے میں ۶۱ تھا۔ یہ فیصد بڑھ کر ۱۹۰۱ء میں ۶۵٫۲؛ ۱۹۱۱ء میں ۶۹٫۸؛ اور ۱۹۲۱ء میں ۷۰٫۹ ہوگیا۔ اگر ہم ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کو اس بنیاد پر نظر انداز بھی کردیں کہ اس تاریخ کے بعد سے ترتیب اعداد کے طریق میں بہت کچھ تغیرات ہوئے ہیں، تب بھی بعد کی مردم شماریوں کی بنا پر اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ آبادی صنعت سے زراعت میں منتقل ہوئی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں زرعی آبادی (مزدوروں) کے فیصد میں جو ظاہری تخفیف رونما ہوئی ہے اور یہ تناسب گھٹ کر ۶۵٫۲ فیصد تک آگیا ہے اس پر پہلے تنقید کی جاچکی ہے[1]۔ یہ صحیح ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار کو اس لیے قطعی طور پر معتبر نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ان میں بڑے پیشوں اور ذیلی پیشوں کے مابین کوئی نمایاں خط فارق قایم نہیں کیا گیا ہے اور بہت سی گھریلو صنعتیں زراعت کے ذیلی پیشوں کی حیثیت سے جاری ہیں[2]۔ لیکن چونکہ عدم صحت کا یہ عنصر جملہ مردم شماریوں میں مساوی طور پر موجود ہے، اس لیے مقابلے کی اغراض کے لیے مختلف مردم شماریوں کے اعداد سے بلا خوف و خطر کام لیا جاسکتا ہے۔

لیکن جدید طرز کے بڑے پیمانے کی صنعت کا آغاز ہو چکا ہے، اور حکومت چونکہ صنعت کو سرعت کے ساتھ ترقی دینے کی پالیسی کا اعلان کرچکی ہے، اس لیے

---

[1] دیکھو باب ۳ فصل (۵)۔

[2] دیکھو ڈی۔ آر گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا ص ۲۲۱۔

باب۵ آیندہ اس سمت میں ترقی بہت اطمینان بخش ہونی چاہئیے اور اس سے زراعت کی جانب بکثرت میلان اور نقل میں بھی کمی ہو جائے گی جس کی بنا پر راناڈے کو بہت کچھ بدگمانی اور خطرہ محسوس ہوا تھا۔ ملک میں جدید طرز کی صنعتوں کی عظیم الشان ترقی بذات خود، دست کاروں کی دشواریوں کو بڑھا کر ان کی حالت اور بھی زیادہ سنگین کر دے گی۔ چنانچہ آیندہ چل کر ہمیں جن سوالوں کو جانچنا ہوگا۔ ان میں سے ایک یہ ہوگا کہ آیا گھریلو صنعتوں کا نیست و نابود ہو جانا لابدی ہے یا وہ جدید صنعتوں کی توسیع و ترقی کے دوش بدوش برقرار اور خوشحال رہ سکیں گی۔

۲۳۔ گاؤں عبوری دور میں۔

دیہی برادری کی تنظیم اور معاشی زندگی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے، ان میں ان جدید قوتوں کے نتیجے کے طور پر تغیر و تبدل ہو رہا ہے جو نظم و نسق کی مرکزیت، مغربی تہذیب و تمدن کے زیر اثر انفرادیت کی ترقی اور ذرائع نقل و حمل و آمد و رفت کے انقلاب کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔

(۱) نظم و نسق کی مرکزیت۔

"قدیم زمانے میں ہندوستانی دیہات کو مقامی آزادی بڑی حد تک حاصل تھی، اس لیے کہ حکمراں خاندان اور ان کے مقامی نمائندوں کو انفرادی کسانوں سے براہ راست کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ گاؤں کو بحیثیت مجموعی یا کسی بڑے زمیندار کو سرکاری مالگزاری ادا کرنے اور مقامی نظم و امن قایم کرنے کے لیے ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ لیکن دیوانی اور فوجداری کی مقامی عدالتوں کے قایم ہو جانے کی وجہ سے نیز مال اور پولیس کی موجودہ تنظیم کی بدولت اور انفرادی رعیت داری نظام کی بنا پر جو شمالی ہند میں بھی پھیل رہا ہے، اب یہ 147
مقامی آزادی باقی نہیں رہی ہے۔[ل] نظم و نسق کی مرکزیت کا یہ برطانوی اصول بمبئی میں الفنسٹن اور مدراس میں منرو کی سفارشوں کے خلاف اختیار کیا گیا، یہ دونوں اصحاب دیہی برادریوں کو صحت و قوت کی حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے بہتر دو تھے۔ لیکن ان کی رائے کے خلاف اصول اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہی آزادی کے

سلہ۔ اعدام مرکزیت کے کمیشن کی رپورٹ ۱۹۰۹ء۔

ترغیبات مفقود ہو گئے اور تازہ و جدید انتظام مثلاً ضلع واری و تعلقہ واری مجلسوں کے تقرر گاؤں کی محدود لیکن زیادہ موثر حکومت خود اختیاری کے کسی حد تک مذموم بدل ثابت ہوئے۔ باب ۵

نظم و نسق کی موثر مرکزیت دو شرائط پر مبنی ہے۔ (۱) طاقتور مستحکم حکومت کا قیام اور (۲) نقل و حمل اور آمد و رفت کی سہولت۔ یہ دونوں شرائط برطانوی دور سے پیشتر کے زمانے میں مفقود تھے۔ اکثر حکمران خاندان اپنی بقا و حفاظت کے زیادہ اہم مسئلے میں منہمک تھے، لہذا انھوں نے کمترین مقاومت کا اصول اختیار کیا اور دیہی حکومت میں امکانی حد تک کم مداخلت کی۔ بہر صورت یہ ضروری تھا کہ طاقتور سے طاقتور حکومت بھی روزمرہ کے دیہی معاملات میں مداخلت کرنے کے کام کو محض اس وجہ سے ناقابل عمل پاتی کہ آمد و رفت میں قدرتی دشواریاں تھیں اور دیہات مرکزی حکومت کے عہدہ داروں کی رسائی سے باہر تھے۔ ان حالات میں اعدام مرکزیت کے اصول کو مجبوراً اختیار کرنا پڑا اور اس کے فطری نتیجے کے طور پر دیہات کی آزادی کا باقی رہنا لابدی تھا۔ موجودہ متبدلہ صورت حال میں دیہی آزادی کی بحالی صرف اس وقت رونما ہو گی جبکہ مرکزی حکومت اپنے اقتدار سے ارادی طور پر دست بردار ہو جائے گی۔ لیکن گاؤں کو اس کی سابقہ حیثیت پر از سر نو قایم کر دینے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ کل اعتبارات سے قدیم میلان عود کر آئے گا۔ گاؤں کبھی معاشی حیثیت سے اپنی جملہ ضرورتوں کا خود کفیل اور زمانۂ قدیم کی طرح تمام دنیا سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور نہ ہماری یہ خواہش ہونی چاہیے کہ اُسے اس حالت میں دیکھیں۔

(۲) انفرادیت کی ترقی۔

ایک اور سبب جس کا دیہی برادری کی شکست میں حصہ ہے انفرادیت کی ترقی رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں، ہر سمت میں انفرادی قانونی حقوق رونما ہو گئے ہیں اور انھوں نے اجتماعی زندگی کا خون کر کے فرد کی حیثیت نہایت مستحکم کر دی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہ میلان ظاہر ہوا ہے، اور موجودہ زمانے کی ان سب سے زیادہ طاقتور قوتوں میں سے ایک قوت ہے جو ہندوستانی معاشرے کی قدیم عمارت کو مسمار کر رہی ہیں جو

باب ۵

انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر مبنی ہے۔ اس طرح گاؤں میں اجتماعیت کا احساس بہت ضعیف ہوگیا ہے، گو ابھی تک پوری طرح نابود نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ گاؤں میں اتنی طاقت اور جان موجود ہے کہ اس کو اب بھی نظم ونسق کی اولین اکائی شمار
143 کیا جاسکتا ہے اور قدیم عمائدہ مثلاً پٹیل اور محاسب گاؤں اور مرکزی حکومت کو ملانے والی ناگزیر کڑی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہی حکومت خود اختیاری اور اجتماعی زندگی کی تجدید کا مستقبل، امداد باہمی کی تحریک کے اثر کی بدولت روشن ہوگیا ہے، اور دیہی پنچایتوں کی قدر و اہمیت کو حکومت کے تسلیم کرلینے کی وجہ سے اس کی توقع اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ نے اس تحریک کے حق میں مطلوبہ محرک کا کام کیا جو سنہ ۱۹۰۹ء کے اعدام مرکزیت کے کمیشن کی خیر خواہی حاصل کر چکی تھی۔ نئی شراب پرانی بوتلوں میں یا ان کو توڑے بغیر بھرنا آسان نہیں ہے، اور دیہی حکومت کی خود مختاری کی تجدید کا کام، مالیہ اور عملے کے متعلق دشواریوں سے بھرا ہوا ہے، اور جو روایات مردہ ہو چکے ہوں ان کو ایک سو سال کے بدبختانہ وقفے کے بعد زندہ کرنا مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ لیکن ان تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود دیہی حکومت کی خود مختاری کا نصب العین لائق حصول ہے، اور اس کی راہ میں جو مزاحمتیں ہیں وہ رفتار زمانہ کے ساتھ دیہی ہندوستان کی معاشی ترقی، تعلیم کی توسیع اور عوام کی روشن خیالی کی بدولت رفع ہوجائیں گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ خود مختار دیہی حکومت کے تصور کو دیہات سدھار کی ایک جامع تجویز کے طور پر عملی جامہ پہنایا جائے۔

(۳) نقل و حمل میں انقلاب۔

آخری بات یہ کہ انیسویں صدی کے وسط سے ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھ جانے کی وجہ سے نقل وحمل میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کی وجہ سے گاؤں کا علاحدہ وجود باقی نہیں رہا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اہم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔

۴۴۔ گاؤں کی خصوصیات عبوری دور میں۔

(۱) سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ گاؤں خود کفیل نہیں رہا ہے چنانچہ اس وقت گاؤں میں کپڑا، مٹی کا تیل، الومونیم کے برتن، شکر، چائے، دیاسلائی کے بکس، چھتریاں، قینچی، چوڑیاں، آئینہ،

باب ۵

مسالے اور دوائیں، سلائی کی مشینیں وغیرہ باہر ہی سے درآمد کی جاتی ہیں۔ گاؤں کو بیرونی دنیا کا اس طرح روز افزوں دست نگر اور محتاج بنانے میں معیار زندگی کے ان تغیرات نے بھی بڑی حد تک مدد کی ہے جو مغربی اثرات کے تحت رونما ہوئے ہیں۔ گاؤں بیرونی دنیا کے لیے اشیاء بھی تیار کرنے لگا ہے اور اشیا کے مبادلے کی حد تک بیرونی دنیا پر اس کے روز افزوں انحصار کی بدولت ایسے معاشی انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے جو بلحاظ نوعیت نہایت دوررس ہے۔

(۲) گاؤں کی علحدگی کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے قحط کی مصیبت کی نوعیت میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مقامی فصلوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ان علاقوں سے اشیائے خوردنی درآمد کرنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے جہاں پیداوار بہ افراط ہوتی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اشیائے خوردنی اور زر کے قحط کی جگہ محض زر کے کال نے لے لی ہے، چنانچہ اشیا کے قحط کی بنا پر عوام کی بہت بڑی تعداد بھوک اور فاقوں کی شدید تکلیف میں مبتلا نہیں ہوتی بلکہ قلت اشیار کی وجہ سے محض گرانی رونما ہوتی ہے، عارضی طور پر بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے اور زرعی کاروبار رک جاتا ہے۔ علیٰ ہذا فصلوں کے غیر معمولی طور پر عمدہ ہونے کی وجہ سے پیداوار کی افراط اور ارزانی کا جو خوف تھا اس 149
میں بھی داخلی و بین الاقوامی بازاروں کی توسیع کی بدولت کمی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم گاؤں کے غلے کے ذخائر بھی اس لیے عملاً مفقود ہو گئے ہیں کہ گاؤں اب غلے کے ذخائر بہت بڑی مقدار میں ملک کے کسی حصے سے بھی بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔

(۳) ایک اور نمایاں تبدیلی معیشت زر کے رواج کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ قدیم زمانے کے برعکس آج کل بیرونی دنیا سے مبادلات جلد جلد اور روز افزوں ہونے اور زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے نیز اس سبب سے کہ گاؤں کے باہر جا کر کام کرنے والے بھی اپنے وطن کو ترسیل زر کرتے ہیں، دیہات میں زر کی درآمد ہونے لگی ہے۔ غرض زر کی اس روز افزوں رسد نے اس کا موقع بہم پہنچایا کہ زر ہی معمولی آلہ مبادلہ کے طور پر اختیار کر لیا جائے، چنانچہ آج کل مطالبات جنس کی شکل میں بہت کم ادا کیے جاتے ہیں۔ واقعہ

باب

یہ ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کہ جنسی مبادلت کے بدل کے طور پر زر کا رائج ہونا اس بات کی بین علامت ہے کہ قدیم معیشتہ جدید معیشتہ سے بدل رہی ہے، اور تہذیب و تمدن نے ترقی کی نئی منزل میں قدم بڑھایا ہے۔ آجکل مالگزاری اور دوسرے محصول، لگان، قرضے کا سود، اور اجرت، یہ سب زیادہ تر زر نقد کی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں۔ دیہی دستکاروں کو ان کی خدمات کے صلے میں ازروئے رواج غلّہ ادا کیا جاتا تھا، اس طریقے کے بجائے کوئی دوسرا بالکل مختلف طریقہ ابھی تک رائج نہیں ہوا ہے، لیکن قدیم زمانے کے مقابلے میں آجکل اس کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ دیہات میں درآمد کی ہوئی اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے بھی نقد کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) شہروں میں کماکر دیہی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی معاشی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور ریلیں بن گئی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہی آبادی ساکن اور غیر نقل پذیر نہیں رہی ہے۔ قدیم زمانے کی طرح آجکل پیشے معین و مقررہ نہیں ہیں اور ذات اور حیثیت کا اثر ایک حد تک کمزور ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ فیکٹریوں، معدنوں اور بڑے بڑے کارہائے عامہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد کا تناسب مجموعی آبادی کے مقابلے میں کسی وقت دراصل کم اور نظر انداز کرنے کے قابل ہو، لیکن دائمی تغیر پذیری کی وجہ سے جدید عناصر سے متاثر ہونیوالوں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے۔ گاؤں کی "علیحدگی" کا باقی نہ رہنا ان دیہات کی صورت میں خاص طور پر نمایاں ہے جو بڑے اور مرکزی شہروں سے کافی متصل واقع ہیں۔

۲۵- دیہی پیشوں میں تغیر-

(۱) زراعت میں تغیر-

اب دیہی پیشوں کے تغیر کو اجمالاً بیان کرنا مناسب ہوگا چنانچہ زراعت سے آغاز کیا جا سکتا ہے جو گاؤں کی سب سے بڑی اور اہم صنعت ہے اور اس کے بعد دیہی دستکاریوں میں جو تغیر ہوا ہے اس کی جانب توجہ کی جا سکتی ہے۔ زرعی کاروبار کی تنظیم میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ عام طریقہ اب بھی یہی ہے کہ چھوٹے چھوٹے کسان اپنے ذاتی اصل اور محنت سے

باب ۵ پہ چھوٹے پیمانے ہی پر کاروبار کرتے ہیں۔ اگر کوئی بات قابلِ لحاظ ہے تو یہ
ہے کہ زراعت کی جانب ملک کے روز افزوں میلان اور زمین کی تقسیم در تقسیم کی
زیادتی نے چھوٹے کسانوں کی تعداد میں بہت خاصا اضافہ کر دیا ہے۔ علیٰ ہٰذا
قدیم ترین زمانے کا کاشتکاری کا طریقہ اور فن اب بھی بڑی حد تک غیر متاثر ہے
اور زراعت و امداد باہمی کے محکموں کو طریق کاشت اور آلات کشاورزی کی اصلاح و 150
ترقی میں ابھی تک بہت ہی محدود کامیابی ہوئی ہے۔

ہندوستانی زراعت کا عبوری دور چار اہم پہلو رکھتا ہے؛ یعنی (۱) زراعت کا نفع بخش کاروبار بن جانا؛ (۲) کسان کی بے دخلی اور زمین کا غیر کسان ساہوکار یا قرض دہندہ کو منتقل ہو جانا (۳) کھیتوں کی روز افزوں تقسیم اور ان کا انتشار، (۴) دیہی مزدوروں کی قلت۔[1]

(۱) زراعت کے نفع بخش کاروبار بن جانے کا باعث زیادہ تر یہ امر رہا ہے کہ نقل و حمل اور ذرائع آمد و رفت میں اصلاح، توسیع و ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے افتتاح نے زرعی پیداوار کے لیے وسیع اور عالمگیر بازار قائم کرنے میں خاص طور پر مدد دی۔

دنیا کے بازاروں کا کھل جانا اور اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی زراعت کا ایک نفع بخش کاروبار بن جانا، یہ ایسے عامل تھے جو امریکا کی خانہ جنگی کے باعث گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے میں بہت شد و مد کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ چونکہ اس جنگ کی وجہ سے انگلستان میں امریکا سے روئی کی رسد کی درآمد کا سلسلہ رک گیا تھا، لہٰذا لنکاشائر کو مجبوراً مصر اور ہندوستان کی سمت رخ پھیرنا پڑا۔ لنکاشائر کی عظیم طلب نے روئی کے کاروبار میں ایسی گرم بازاری پیدا کر دی کہ اس کی بدولت روئی کا کاشت کرنے والوں اور برآمد کرنے والوں کی جیبیں بھی کچھ مدت کے لیے کثیر نفع سے بھرتی رہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب، صوبہ متحدہ اور دوسرے علاقوں میں بڑے بڑے کارہائے آبپاشی کے اجرا نے وسیع خطہ ہائے زمین کو

---

[1] اس معاملے کی زیادہ مفصل بحث کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا باب ۱۱۔

باب ۵ قابلِ زراعت بنا دیا ہے اور کفافی کاشتکاری کو تجارتی کاشتکاری سے مبدّل کرنے کے حق میں محرک کا کام کیا ہے۔ نقل وحمل اور آبپاشی کے علاوہ لیکن ان ہی سے متعلق ایک اور عامل جو زراعت کو نفع بخش کاروبار بنانے کا ذمہ دار ہے یہ ہے کہ گاؤں میں زر کا استعمال روز افزوں ہوگیا اور محصول، لگان، سود اور اجرت بصورت نقد ادا ہونے لگی۔ مطالبات کی ادائی بصورت نقد کرنے کی ضرورت کسان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کا ایک جزو بلکہ اکثر صورتوں میں بہت بڑا جزو فصل کی کٹائی کے فوراً ہی بعد فروخت کردے اور اُسے عام طور پر خود اپنی ہی فصل کی پیداوار ساہوکار سے واپس خریدنی پڑتی ہے اور ایسی قیمتوں پر جو اس کی قیمت فروخت سے زیادہ ہوتی ہیں۔

زرعی پیدائش کی اس جدید ہئیت کی بدولت مختلف علاقے خاص خاص فصلوں کی تیاری کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں۔ چنانچہ بنگال نے سن کی کاشت کے لیے، بمبئی اور برار نے روئی کے لیے، صوبہ متوسط نے روغن دار تخم کے لیے، پنجاب نے گیہوں کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرلیا ہے۔ اس جدید صورت کی بدولت صنعتی پیداوار اور غیر خوردنی اشیا مثلاً روئی، سن، اور روغن دار تخم وغیرہ کی کاشت کا رقبہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں بیچ والوں، تھوک فروشوں اور برآمد کرنے والوں کی خاص خاص جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں جو بندرگاہوں اور اندرون ملک تقسیم کرنے والے مرکزوں میں روئی، سن، گیہوں وغیرہ جیسی پیداوار کو جلد جلد پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ "زراعت" کے متعلق باب میں ہم یہ بیان کریں گے کہ زراعت کے نفع بخش کاروبار بن جانے کی وجہ سے پیدا کنندہ اور ملک کو بحیثیت مجموعی دراصل کس حد تک فائدہ پہنچا ہے اور زرعی پیداوار کی فروخت کے انتظام میں کسقدر اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے۔ 151

(۲) قدیم کسانوں کی زمین کا ساہوکار کے قبضے اور ملکیت میں چلا جانا دیہی قرضداری کے نتائج میں سے ایک ہے، جس کے حق میں انفرادی حقوق اراضی، انتقال اراضی کی آزادی، زمین کی قیمت کے اضافے، اعتبار کی سہولت اور انتہائی طور پر پیچیدہ دیوانی قانون اور ضابطے نے محرک کا کام کیا ہے۔ ہم کسی دوسرے

باب ۵

مقام پر کسانوں کی قرضداری کے ثانوی اسباب بیان کریں گے اور اس کے ساتھ ان مختلف تدابیر کا بھی ذکر کریں گے جو حکومت نے کسان کے قبضے سے زمین کے نکل جانے کو روکنے کے لیے غیر زرعی طبقوں کی مدافعت میں اختیار کی ہیں۔

(۳) روز افزوں تقسیم و انتشار زمین کا باعث یہ ہے کہ توریث و توارث کے قوانین کے ذریعے سے زمین پر آبادی کا روز افزوں دباؤ پڑتا رہا ہے اور یہ زراعت کی اصلاح و ترقی کے حق میں سخت مضر ہے۔[۱]

(۴) زرعی مزدوروں کی قلت، جس کے متعلق اکثر دیہات میں شکایت عام ہوگئی ہے، خاصکر فصل کی کٹائی کے موقعے پر زیادہ محسوس ہوتی ہے جبکہ ٹٹ پونجیے کسان اور اس کے کنبے والوں کی زائد محنت دستیاب نہیں ہوتی، اور اس کا باعث زیر کاشت رقبے کی زیادتی، شہری صنعت کی ترقی اور متمول زمینداروں کے اس میلان کو قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قیمتوں کے اضافے سے خاص طور پر متمتع ہونے کی وجہ سے اپنے کھیتوں پر خود کام کرنے کی بجائے مزدور سے اجرت پر کام لیتے ہیں۔[۲]

۲۵-(۲) دیہی حرفتوں میں تغیر

اس کے بعد ہم دیہی دستکار کی حیثیت میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کی جانچ کی جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کوئی انقلاب انگیز تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ نجار، آہن گر، دھوبی، جرّاح، کمہار وغیرہ اب بھی دیہی خدمتگاروں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا اور صلہ ادا کیا جاتا ہے، چنانچہ وہ رواجی واجبات پاتے ہیں۔ لیکن رواجی فرائض اب اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی کہ قدیم زمانے میں رکھتے تھے اور موجودہ زمانے کا دیہی دستکار دوسرے مقام پر بہتر ذریعۂ معاش کی تلاش میں منتقل ہونے کے لیے زیادہ مستعد معلوم ہوتا ہے۔ ارزانی و آسانی نقل و حمل نے بیرونی اشیا کی درآمد میں سہولت پیدا کردی ہے اور اس کی وجہ سے گاؤں کے لیے اپنی جملہ احتیاجوں کو مقامی طور سے پورا کرنے کی ضرورت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس

---

[۱] - دیکھو باب ۔

[۲] - دیکھو جی کیٹنگ کی کتاب موسوم بہ "مغربی ہندوستان میں زراعت کی ترقی" صفحہ ۱۴۴ تا صفحہ ۱۴۶۔
(See G. keatinge, Progress of Agriculture in Western India; P P. 144-6)

لحاظ سے گاؤں میں تمام دستکاروں کی مسلسل موجودگی کی اب ضرورت ہی نہیں رہی ہے۔ دستکار کی محنت کا صلہ سالیانہ کی شکل میں ادا کرنے کی بجائے کام کے لحاظ سے ادا کرنے کا طریقہ زیادہ عام ہو رہا ہے' اگرچہ اس اعتبار سے اور دوسرے اعتبارات سے پوری طرح تغیر نہیں ہوا ہے۔ یہی عامل اس بات کا بھی ایک حد تک ذمہ دار ہے کہ پارچہ باف اندر ... گر جیسے بعض دستکار بڑے دیہات اور شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ دیہی دستکار کو بیرونی اور ہندوستانی کارخانوں کی بڑے پیمانے کی پیدائش کی مسابقت نے بھی نقصان پہنچایا' اور اس غیر مساوی مسابقت کے نتیجے کے طور پر بعض دیہی صنعتیں ۱۵۵
تباہ ہو چکی یا ختم ہو گئی ہیں۔

لیکن انقلاب نے مختلف دیہی دستکاروں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے۔ ہاتھ سے سوت کاتنے والے انگلستان کے صنعتی انقلاب کی طرح' یہاں بھی سب سے زیادہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں اور ہر جھونپڑے کا قدیم کتائی کا چرخہ بڑی حد تک بے کار ہو گیا ہے۔ دیہی رنگریزوں کو بھی انیلین رنگوں کی درآمد سے اور کلوں کے بنے ہوئے رنگین سوت کے استعمال سے نقصان پہنچا ہے۔ پارچہ باف کو محض اس لیے نقصان نہیں پہنچا کہ کلوں کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کی زد ان پر پڑی اور ہندوستانی بازار میں ان کی بھرمار ہو گئی' بلکہ ایک حد تک اس وجہ سے بھی کہ غیر ملکی ایشیائی بازار مثلاً جاوا اور ایران' جو پہلے ہندوستان سے اشیا کی درآمد کرتے تھے اب انگلستان سے سامان طلب کرنے لگے۔ لیکن دستی پارچہ بافی ہندوستان میں کسی طرح کلیتہً مفقود نہیں ہوئی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اب بھی ۲۰ لاکھ سے ۳۰ لاکھ تک دستی پارچہ ہندوستان میں کام کر رہے ہیں' دستی پارچہ پر کپڑا بننے والوں کی تعداد تقریباً ۶۰ لاکھ ہے' اور یہ کہ ان کی سالانہ خام آمدنی کی مجموعی مقدار لازمی طور پر قریب ۵۰ کروڑ روپیہ ہوگی[۱]۔ آہنی ہلوں' موسلوں اور دوسرے ترقی یافتہ آلات کشاورزی کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے آہنگر اور نجار کی حیثیت پر اسی طرح مضر اثر پڑا ہے جس طرح پچی کاری کے ظروف اور تلبے

---

[۱] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۲۵۶ اور سی اتھیسن کی کتاب موسوم بہ "صنعت ہند" ضمیمہ (۲)۔

اور پیتل کے برتنوں کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے کمہار کا وجود بڑی حد تک غیر ضروری سا ہو گیا ہے۔ دیہی دباغ کو خام چرم اور کھالوں کی عالمی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اپنی حیثیت حالت کا سنبھالنا دشوار ہو گیا ہے، اس لیے کہ ہندوستانی کھالیں ہر سال بہت کثیر تعداد میں برآمد کی جاتی ہیں اور دباغت کیے ہوئے تیار چمڑے کی درآمد روز افزوں ہے۔ گاؤں میں مٹی کے تیل کے بکثرت استعمال، روغندار تخموں کی برآمد اور شہروں میں تخموں سے تیل نکالنے کی صنعت کے فروغ پانے کی وجہ سے گاؤں کے تیلی پر بھی کاری ضرب لگی۔ جہاں دیہی صنعت کو زوال آیا یا اس میں کساد بازاری رونما ہوئی وہاں بے کار دستکار یا تو خود گاؤں ہی میں وہاں کام کرنے والے مزدوروں کی صف میں داخل ہو جاتا ہے یا بہتر ذریعہ معاش کی تلاش میں شہروں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ دستکاروں نے اپنا موروثی پیشہ عام طور پر صرف اسی صورت میں ترک کیا جبکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے گو بعض صورتوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ انھوں نے آنے والی تباہی کو دیکھ کر اپنی حیثیت بالکل مایوس کن ہو جانے کا انتظار کیے بغیر پہلے ہی سے اپنا پیشہ ترک کر دیا۔

رہے وہ دستکار جو اب بھی اپنی حرفتوں میں کام کیے جا رہے ہیں تو ان کی حالت میں بہت کم تغیر ہوا ہے، بجز اس کے کہ بعضوں نے اپنے پیشے کو پیدائش کے متبدلہ حالات کے مطابق ایک حد تک بنا لیا ہے۔ مثلاً جلاہا آجکل زیادہ تر کلوں کا بنا ہوا سوت استعمال کرتا ہے اور بعض صورتوں میں ڈھرکی (Fly shuttle) سے بھی کام لیتا ہے جیسے مدراس میں۔ آہنگر بنا بنایا لوہا اور ٹین کی چادریں درآمد کرتا ہے،
153 نجار جدید آلات سے اور درزی سلائی کی مشین سے کام لینے لگا ہے۔

اس طرح ظاہر ہے کہ گاؤں کے سب دستکار مساوی طور پر متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ جو لوگ بڑے دیہات میں مرتکز یا شہروں میں منتقل ہونے کے قابل ہوئے انھوں نے اپنی حالت درست کر لی؛ مثلاً نجار اور آہنگر، جن کی مانگ انجینیری کے کارخانوں، عمارت اور فرنیچر سازی کی صنعتوں میں روز افزوں ہے۔ لیکن وہ لوگ جو دیہات چھوڑ نہیں سکتے تھے اور وہاں رہنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار اختیار نہ کر سکتے تھے، انھیں تکلیف و پریشانی اٹھانی پڑی اور معمولی زرعی مزدوری کی جانب رجوع ہونا پڑا۔

باب۵

دیہی دستکاریوں[1] کی حالت تغیر کے مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہی صنعت بحیثیت مجموعی زوال پذیر ہے۔ دستکاروں کی بہت بڑی تعداد تباہی میں آکر معمولی اجرت یاب مزدور بن گئی۔ معدودے چند خوش قسمت دستکاروں نے شہروں میں منتقل ہوکر اپنی معاشی حالت درست کرلی۔ بعضے کسان بن گئے اور جن لوگوں کو اپنے موروثی پیشوں میں جمے رہنا پڑا ان کی حالت عام طور پر بہت ہی نازک ہے چنانچہ یہی لوگ قحط و مصیبت کے زمانے میں کارہائے امداد عامہ پر سب سے پہلے ہجوم کر آتے ہیں۔

۲۶۔ حیثیت اور رواج سے معاہدے اور مسابقت کی جانب تبدیلی۔

ہم معاشرتی و مذہبی رسوم و رواج کے باب میں اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں ذات پات کی تنظیم اور اشتراک خاندانی کے نظام کے تحت حیثیت ابھی تک کیا درجہ رکھتی ہے، اور اس میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندوستانی سماج یا معاشرہ عبوری دور میں سے گزر رہا ہے اور اس کی شکل و صورت بتدریج نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ چنانچہ پہلے رواج کی بنا پر اجرت، لگان اور قیمتوں کا تعین ہوتا تھا اب مسابقت اس کی جگہ بتدریج لے رہی ہے، اور یہ بات خاصکر شہری علاقوں میں صادق آتی ہے۔ مغربی تہذیب کی اشاعت، معیشتہ زر کا رواج اور اس کی توسیع، اور ذرائع نقل و حمل کی ترقی وغیرہ، رواج کے زور کو توڑ رہے ہیں اور ہر جگہ مسابقت کا دور دورہ ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں میں بھی مسابقت کی قوت کو رواج کی قوت کسی حد تک ضعیف کردیتی ہے۔ لیکن رواج کا اثر مغربی یورپ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے گو پوری طرح مفقود نہیں ہے۔ ہندوستان میں رواج کا اثر زیادہ قوی ہے، گو یہ بیان کردینا اہمیت سے خالی نہیں کہ واقعات کی رویہ بتلاتی ہے کہ رواج کی جگہ مسابقت لے رہی ہے اور عام طور پر مغربی حالات سے بتدریج مشابہت پیدا ہو رہی ہے۔

[1] دیہی دستکاریوں میں جو تغیر واقع ہوا ہے اس کے مزید مفصل بیان کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۱۰۵ تا صفحہ ۱۱۸

باب ۵

(ا) مسابقت اور لگان۔ اضافہ آبادی، دیہی زندگی بسر کرنے کا میلان، دوسرے ذرائع معاش کی عدم موجودگی، سن، روئی، گیہوں، روغن دار تخموں وغیرہ جیسی تجارتی فصلوں کی قیمتوں کی زیادتی، زمین کے حق میں روایتی بخش و خروش، امن و امان کا قائم ہونا، اور نقد لگان ادا کرنے کا رواج، ان سب چیزوں نے لگان کے تقرر میں مسابقت کے حصے کو وسیع کر دیا ہے۔ بعض صورتوں میں زمینداروں کے اس رجحان کو کہ وہ کسانوں کی کل پیداوار بطور لگان سختی کے ساتھ وصول کیا کرتے
154 تھے، قوانین لگان منظور کر کے بنگال، مدراس، صوبۂ متحدہ اور صوبہ متوسط وغیرہ میں روکنا پڑا، تاکہ کسان، ان حقوق سے فائدہ اُٹھائے جو اس کو ازروئے رواج ملے تھے اور زمینداروں کی دستبرد سے محفوظ رہے اور اس طرح لگان میں من مانا اضافہ اور کسان کے اخراج کا سدباب ہو جائے۔ رہے شہروں کے مکانوں کے کرائے تو وہ آجکل عام طور پر مسابقت کے ذریعے سے طے پاتے ہیں، اگرچہ گاہ گاہ بمبئی جیسے بڑے شہروں میں ان پر وضع آئین قوانین کے ذریعے سے نگرانی رکھی جاتی ہے۔

(ب) مسابقت اور اُجرت موجودہ زمانے میں ہندوستان میں، خاصکر شہروں کی حد تک، اُجرت کے متعلق یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کا تقرر رواج سے زیادہ مسابقت کی بنا پر ہوتا ہے، گو اس محدود دائرے میں بھی مسابقت کا اثر اس قدر طاقتور نہیں ہے جس قدر کہ مغربی ممالک میں، اُجرت رسد و طلب کے تغیرات کا ساتھ اس قدر تیزی سے نہیں دیتی جس قدر جلد مغرب میں دیتی ہے، اور اس طرح گو اجرتوں کی سطح ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہے، مقابلۃً ثبات پذیر ہے۔ آجکل دیہات میں بھی مسابقت، اجرتوں کی شرح پر مختلف قوتوں کے نتیجے کے طور پر اثر انداز ہوتی ہے؛ مثلاً شہروں میں مزدوروں کی روز افزوں طلب، ذرایع نقل و حمل کی ترقی کی بدولت محنت کی زیادہ نقل پذیری، اور اُجرت کو بصورت نقد ادا کرنے کے طریقے کا رواج۔ دیہی دستکار کو رواجی اُجرت دینے کے طریقے کی اہمیت، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، گھٹتی جارہی ہے، اور یہ بات دیہی آہنگر اور نجار جیسے دستکاروں کی حد تک جن کو شہروں میں بآسانی کام مل جاتا ہے خاص طور پر صادق آتی ہے کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرت کا تعین بھی بڑی

حد تک مسابقت کے ذریعے سے ہوتا ہے، تاوقتیکہ ان مقامات میں جہاں زرعی مزدوروں کی قلت ہے۔ شہروں میں اجرت کا تقرر مزدوروں کی روز افزوں مانگ کی وجہ سے تقریب تقریب پورے طور پر خالص مسابقت کی بنا پر ہوتا ہے۔

(ج) مسابقت اور قیمت

دیہی علاقوں میں قیمتوں کا تقرر طلب و رسد کے توازن کی بنا پر زیادہ سے زیادہ مسابقت کے تابع ہو رہا ہے۔ ذرائع نقل و حمل کی اصلاح و ترقی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کے ایک علاقے میں قیمتوں میں تغیرات ہوں تو وہ دوسرے علاقوں کی قیمتوں کو بہت جلد متاثر کرتے ہیں؛ اور دنیا کے بازاروں سے ملک کا اتصال بڑھ جانے کی وجہ سے قیمتوں کے تقرر میں مسابقت کا حصہ قابلِ لحاظ حد تک بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ شہروں کے مقابلے میں دیہات میں قیمتوں کی اثر پذیری کی رفتار کا زیادہ سست رہنا لازمی ہے اس لیے کہ دیہی آبادی زیادہ قدامت پسند اور جاہل ہے۔

(۲) صنعتوں میں تغیر و تبدل۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ملکی صنعتوں میں کیا تغیر ہوا ہے، ان کے زوال کے کیا اسباب ہیں، اور دیہی پیشے اختیار کرنے کی جانب روز افزوں کیا میلان رہا ہے۔

بقول راناڈے ہندوستان گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے وسط میں صنعتی حیثیت سے انتہائی پستی کی حالت میں تھا۔[۱] لیکن اس زمانے کے بعد سے بڑے پیمانے کی صنعت نے بہت تدریجی مگر قریب قریب کسی خلل کے بغیر ترقی کی۔ جو لوگ ہندوستان میں صنعتی انقلاب سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں انھیں تصویر کا روشن پہلو گاؤں میں نہیں بلکہ ان صنعتی مرکزوں میں تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے موجودہ زمانے میں جنم لیا ہے اور جن میں صنعت کی تنظیم بالکل جدید ترین اصول پر ہوئی ہے۔ چنانچہ بمبئی، کانپور، کراچی اور دریائے ہوگلی کے کناروں پر جا کر 155

[۱] سنہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ زمانے میں حالات نہایت ابتر و ناگفتہ بہ تھے۔ لیکن اس کے بعد ملک نے کروٹ بدلی اور حیات تازہ کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی حالت میں ہندوستان نے پہلا قدم اٹھایا جس نے اس کو موجودہ دور میں خالص زرعی ملک کے بجائے ایک حد تک صنعتی و تجارتی ملک بھی بنا دیا۔

دیکھنا چاہیے جہاں ماہروں کی نگرانی میں مزدور اکھٹے اور کارگزار ہیں۔ ان ہی شہروں میں گرنیوں کی تعمیر اور قیمتی کلوں کی تنصیب میں سرمایہ بہت کشادہ دلی کے ساتھ لگایا گیا ہے۔ یہیں بڑے پیمانے کی پیدائش کے کفایات حاصل ہوئے ہیں اور یہیں ہندوستانی قائدان صنعت پیدا ہوئے ہیں[1]۔ جدید طرز کی صنعت نے سب سے اوّل باغوں اور نخلستانوں میں اپنا قدم جمایا، چنانچہ جدید اصول پر چائے، کافی، نیل اور سن کے کھیتوں اور باغوں میں کام شروع ہوا جو اہل یورپ کے ہاتھ میں تھے اور آج تک ہیں۔ اس جدید نشو ونما کو ۱۸۳۳ء کے قانون منشور (چارٹر ایکٹ) سے بہت تقویت پہنچائی، اس لیے کہ اس کی رو سے وہ سب بندشیں اٹھالی گئیں جو اہل یورپ پر ہندوستان میں بسنے اور کاروبار کرنے کے بارے میں عائد تھیں۔ علاوہ ازیں اس نشو ونما میں جزائر غرب الہند کی غلامی کی منسوخی بھی اس سے بے حد معاون ثابت ہوئی کہ اس کی وجہ سے جزائر غرب الہند کا مزرعہ دار ارزاں محنت کی سہولت سے محروم ہوگیا[2]۔ برطانیہ کے کاروباری اشخاص نے اس بات کی اہمیت محسوس کرنے میں تساہل نہیں کیا کہ جدید اصول پر مصنوعات تیار کرنے کے لیے انواع واقسام کی خام اشیا کثیر مقدار میں حاصل ہو سکتی ہیں اور ان مصنوعات کا مقامی بازار نہایت وسیع تھا۔ اس طرح انھوں نے لارڈ ڈلہوزی کی پیش بینی کو حق بجانب ثابت کیا جنھوں نے اس ترقی کا اندازہ پہلے ہی کرلیا تھا۔ چنانچہ برطانوی اصل اور حوصلہ مندی کی درآمد ہندوستان میں گزشتہ صدی کے وسط کے بعد سے خاص طور پر نمایاں ہوگئی۔

یوروپین کاروباری اشخاص کی مثال نے ہندوستانی تاجروں کے طبقے کو بالخصوص بمبئی میں اسی کے بالمقابل سرگرم جدوجہد کے لیے ابھارا۔ چنانچہ بمبئی میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ اس کی تقلید کی گئی اور بمبئی ہی کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی اس بارے میں رہنمائی کرے۔

---

[1]۔ دیکھو مور لینڈ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷۰ تا صفحہ ۱۷۱۔

[2]۔ دیکھو نادلس کی تصنیف موسوم ”سلطنت ماورائے بحر کی معاشی ترقی“ صفحہ ۲۰۹۔

باب ۵ اور اپنے لیے "ہندوستان کے صنعتی دار السلطنت" کی حیثیت حاصل کرے۔ گو بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کی رفتار سست رہی ہے، لیکن ان کی ترقی کے سلسلے کا ملک میں قائم ہوجانا، دیہی پیشے اختیار کرنے کی اس تحریک کے ایک حد تک ازالے کی علامت تصور کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں راناڈے نے اس قدر افسوس و ملال کا اظہار کیا ہے۔

گزشتہ صدی کے تقریباً وسط میں ہندوستان میں فیکٹریوں کی صنعت رائج ہوئی اور ملک میں صنعتی انقلاب کا قطعی طور پر آغاز ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان کی موجودہ زمانے کی اہم ترین صنعتوں میں سے دو صنعتیں علی الترتیب بمبئی اور کلکتے میں قائم ہوئیں۔ چنانچہ بمبئی کی سوتی کپڑے کی صنعت کو شروع ہی سے ہندوستانی اصل و تنظیم 156
و حوصلہ مندی نے استوار بنیادوں پر قائم کیا اور اس کے برخلاف سَن کی صنعت میں یوروپین اصل و حوصلہ مندی کو غلبہ حاصل رہا۔ صنعتی انقلاب کا اثر معدنی صنعتوں میں بھی ظاہر ہوا، اور اس کے بعد کئی دوسری صنعتوں مثلاً روئی اوٹنے، صاف کرنے اور دبانے کی صنعت، کوئلہ، منگنیز، سونے، ابرق، فولاد اور آہن کی صنعتوں، چاول کا بھوسہ صاف کرنے، آٹا پیسنے اور تیل کی گرنیوں وغیرہ میں بھی پھیل گیا۔ ترقی کی رفتار ابتداءً سست رہی اور وہ بھی ملک میں صرف چند مقامات تک محدود رہی، اور گزشتہ صدی کے آخر سے فیکٹری کی صنعت نے سارے ملک میں ترقی کرنی شروع کی۔ موجودہ صدی کے ابتدائی عشرے میں خاصکر اس سرگرمی اور جوش و خروش کے اثر کے تحت جو "سودیشی" کی تحریک کی بدولت پیدا ہوگیا تھا، اکثر معدنی اور بعض متفرق صنعتوں نے نمایاں حیثیت اختیار کرلی۔ اسی بعد کے زمانے میں ہندوستان میں چھوٹی کلوں اور چھوٹے انجنوں کا رواج بھی شروع ہوا اور ہر جگہ میکانکی آلات کو استعمال کرنے کا میلان عام طور پر بڑھ گیا۔[1] جنگ عظیم نے ہندوستانی مصنوعات کے حق میں عارضی محرک کا کام کیا اور یہ بات بالخصوص سوت اور سَن کی گرنیوں، آہنی، فولادی اور چرمی صنعتوں پر خاص طور پر صادق آتی ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعت کی حالیہ

[1] مزید تاریخی تفصیلات کے لیے دیکھو گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا باب ۴ تا باب ۶ اور باب۔

باب ۵

ترقی پر جس کو "امتیازی تامین" کی پالسی سے منسوب کیا جاسکتا ہے، ہم ہندوستان کے محصول درآمد کے اصول کی بحث کے سلسلے میں مفصل توجہ کریں گے۔

ہندوستانی صنعتوں کی اس عبوری حالت کی دو مذموم خصوصیات کا ذکر کردینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ تغیر کی رفتار بہت سُست اور ناہموار رہی، اور دوسرے یہ کہ جو کچھ تغیر واقع ہوا ہے اس کا محرک غیر ملکی اصل ہے، چنانچہ اس کے نتیجے کے طور پر ملکی صنعتوں میں غیر ملکی اصل کی حیثیت بہت غالب ہوگئی ہے اور وہ ہندوستان کی نوزائیدہ دولت کے بڑے حصے کو جذب کرلیتا ہے۔ گو غیر ملکی اصل اور حوصلہ مندی نے صنعتی ترقی کے حق میں محرک کا کام کیا، لیکن اس کے نتیجے کے طور پر اکثر صورتوں میں ایسے ملکی ذرایع کے ایک حد تک قبل از وقت استحصال کا بھی موقع بہم پہنچایا جو فطری افزایش و بحالی کے عمل کے تابع نہیں ہیں اور طاقتور حقوق قائمہ پیدا کردیے جو سیاسی و معاشی معاملات میں قومی نقطۂ نظر سے بین تضاد و تخالف رکھتے ہیں۔ ہماری صنعت کی سُست رفتار ترقی اور ناہموار نوعیت کی توجیہ کرنے والے اسباب کے منجملہ سب سے نمایاں اور اہم سبب حسب ذیل ہیں:-

(۱) ہندوستانی اصل کی قلت اور اس کا شرمیلاپن یا حجاب۔ ہندوستانی اصل، جدید وضع کی مصنوعات کی تیاری کے بجائے قرضہ دینے میں اور زمین یا تجارت میں مصروف رکھا جاتا ہے یا (۲) بنک کاری کی ناکافی سہولتیں، (۳) قدرتی ذرایع مثلاً کوئلے کی غیر مساوی تقسیم، قدرتی ذرایع کے متعلق عام ناواقفیت اور ان کی مقابلۃً غیر ترقی یافتہ حالت؛ (۴) فنی تعلیم کا فقدان، (۵) ہمارے ماہر اور غیر ماہر مزدوروں کی مقابلۃً ادنیٰ کارکردگی؛ (۶) ماہر مزدوروں اور قائدان صنعت کی قلت؛ (۷) فولاد اور لوہے کی سی اساسی صنعتوں کی غیر ترقی یافتہ حالت؛ اور (۸) حکومت کا تغافل و تساہل اور ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے بارے میں کوئی 157
خاص جدوجہد کرنے سے قاصر رہنا۔ حال ہی میں "تامین" کا جو اصول اختیار کیا گیا ہے وہ بے پروائی کے اس طرز عمل سے انحراف کی ایک خوشگوار علامت ہے جو ہندوستان کی صنعتی ترقی کے بارے میں زمانۂ دراز سے برطانوی پالسی کی امتیازی خصوصیت رہا ہے۔

باب ۵

۲۸۔ صنعتی ترقی کی جانچ کے دو معیار۔

ملک کی صنعتی ترقی کی وسعت دریافت کرنے اور ہندوستان میں معاشی تغیر کا حال معلوم کرنے کے لیے آزمایش کے دو معیار تجویز کیے گئے ہیں، یعنی (۱) تجارت خارجہ کے اعداد و شمار اور (۲) شہروں کی ترقی۔ (۱) سب سے اوّل تجارت خارجہ کے اعداد و شمار سے بحث کرنی چاہیے جو درآمد و برآمد میں مصنوعات کے تناسب سے خاص طور پر متعلق ہیں۔ بقول موریسن "ملک کی دولت اور آبادی کے اضافے کے باعث درآمد و برآمد دونوں میں بڑی حد تک اضافہ ہوا ہے، لیکن اشیائے خام کی برآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے، جس سے مقامی صنعتوں کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ تجارت درآمد میں ہماری توقع کے مطابق اس کے برعکس سمت میں میلان ہے، مصنوعات کی درآمد کے مقابلے میں اشیائے خام کی درآمد میں بدرجہا زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں مصنوعات تیار کرنے کی غرض سے ملک اشیائے خام کی بڑی مقدار درآمد کر تا رہا ہے۔ خود بقول راناڈے سنہ ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۸۹۲ء میں مکمل یا جزوی حیثیت سے مکمل مصنوعات کی برآمد کی قیمت بڑھ کر ۱۶،۴۲ کروڑ روپے ہوگئی جس سے ۲۱۱ فیصد اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ خام پیداوار کی برآمد کی قیمت ۵۹،۶ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۵،۶ کروڑ روپے ہوگئی، لیکن یہ اضافہ مقابلتہً اتنا بڑا نہ تھا، اس لیے کہ اس کا فیصد صرف ۴۳ نکلتا ہے۔ اس کے برخلاف مصنوعات کی درآمد ۲۵،۹ کروڑ سے بڑھ کر ۳۶،۲۴ کروڑ ہوگئی یا ۳۹ فیصد اضافہ ہوا، لیکن خام پیداوار کی درآمد تقریباً دونی ہوگئی یعنی ۱۳،۷۵ کروڑ سے بڑھ کر ۲۶،۳۸ کروڑ ہوگئی یا ۹۱ فیصد اضافہ ہوا۔ چنانچہ ان اعداد کی بنا پر راناڈے اس نتیجے پر پہنچا کہ "گھریلو صنعتوں کی تباہی اور صنعتی پیشے ترک کر کے بتدریج زراعت اختیار کرنے" کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی اس کا آغاز امید افزا تھا۔[1] اسی اصول پر سنہ ۱۸۹۰ء تا سنہ ۱۹۰۰ء کے زمانے کی بابت اس تجزیے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پروفیسر کالے یہ ثابت کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ وہ اس زمانے میں

---

[1] دیکھو کالے کی تصنیف صفحہ ۱۱۱۔

باب ۵

مصنوعات کی درآمد ۹۳ فیصد اور خام اشیا کی درآمد ۱۲۷ فیصد بڑھ گئی؛ اس کے برخلاف مصنوعات کی برآمد میں ۱۳۹ فیصد اور پیداوارِ خام کی برآمد میں صرف ۵۷ فیصد اضافہ ہوا۔ مجموعی درآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی درآمد کا تناسب ۱۸۷۹ء میں ۶۵ فیصد اور ۱۸۹۲ء میں ۵۷ فیصد تھا، لیکن ۱۹۰۷ء میں یہ ۵۳ فیصد تک گر گیا۔ علیٰ ہٰذا مصنوعات کی برآمد کا تناسب مجموعی برآمد کے مقابلے میں ۱۸۷۹ء میں صرف ۸ فیصد اور ۱۸۹۲ء میں ۱۶ فیصد تھا، لیکن ۱۹۰۷ء میں ۲۲ فیصد تک بڑھ گیا۔[1]" اور یہاں یہ بتلا دینا مناسب ہوگا کہ جنگ عظیم نے جو محرک بہم پہنچایا اس کے تحت یہ تناسب ۱۹۱۹ء میں بڑھ کر ۳۶ فیصد ہوگیا۔

138

لیکن جے، ام کینس جیسے نقادوں نے اِن اعداد و شمار کی صحت پر اعتراض کیا ہے۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ "سرکاری گوشواروں میں مصنوعات کی درآمد کے اعداد گمراہ کن ہیں اور اُن کا وہ مفہوم نہیں ہے جو وہ بظاہر پیدا کرتے ہیں؛" اس لیے کہ اس عنوان کی ذیل میں دوسری مدوں کے منجملہ کلوں، نلزا سنت اور فلزی مصنوعات کی کل درآمد داخل نہیں کی گئی ہے۔ علیٰ ہٰذا اشیائے خام کی درآمد کے اضافے کے حسابات بھی مغالطہ پیدا کرتے ہیں۔ برآمد کی حد تک، نیم مکمل مصنوعات مثلاً سوت اور دباغت کیا ہوا چرم، مصنوعات کی برآمد کے مجموعی اعداد کو بڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے صنعتوں کی ترقی اور اس کی رفتار کے متعلق غلط اور مبالغہ آمیز اندازہ قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کی اساسی خصوصیات پر تبصرہ کرتے وقت اس موضوع پر مکرر بحث کی جائے گی۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ تجارتی اعداد و شمار سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ میلان، صنعتی ترقی کی طرف یقینی طور پر پایا جاتا ہے اور مرورِ وقت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ڈاکٹر گلبرٹ سلیٹر کی طرح ترقی کی موجودہ رفتار سے خائف ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اتنی زیادہ سریع اور تیز ہے کہ معاشی و معاشری ثبات پذیری کو دھمکی دے رہی ہے اور موجودہ زمانے کی صنعتی ترقی کی خرابیوں کو روکنے کی جو تدابیر

[1] دیکھو پلے کی تصنیف موسوم بہ "ہندوستان کے معاشی حالات" صفحہ ۲۱۔

اختیار کی جارہی ہیں ان پر سبقت لے جارہی ہے۔ لیکن یہ خیال عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے برخلاف عام اور غالب خیال یہ ہے کہ صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کیا جائے؛ اس لیے کہ موجودہ زمانے میں بھی ہندوستان کی درآمد کا ۳/۴ حصہ مصنوعات پر مشتمل ہے اور دوسری طرف مجموعی برآمد میں اشیائے خام بہ شمول اشیائے خوردنی کا قریب قریب یہی تناسب ہے۔[1]

(۲) اس کے بعد اب ہم آزمائش کے دوسرے مجوزہ معیار یعنی شہروں کی ترقی سے بحث کریں گے۔[2] یہ کہا جاسکتا ہے کہ شہروں کی قلیل تعداد، اور مجموعی آبادی سے شہری آبادی کا حقیر تناسب، اس بات کی علامت ہے کہ ملک صنعتی حیثیت سے پسماندہ حالت میں ہے۔ اس سے پیشتر ایک گوشوارہ دیا جاچکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی شہری آبادی کا تناسب بتدریج ترقی پذیر ہے۔[3] طویل مدت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مجموعی آبادی سے شہری آبادی کا تناسب کم و بیش غیر متغیر رہا ہے، شہری آبادی میں ملک کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں جدید صنعتوں کی ترقی کی بدولت شہری آبادی میں بہ سرعت اضافہ ہوا، چنانچہ وہاں ۸۰ فیصد باشندے شہروں میں رہتے ہیں۔ پس شہروں کی آبادی کی ترقی کے آزمائشی معیار کے لحاظ سے ہندوستان کو ابھی بہت بڑی کمی کو پورا کرنا باقی ہے۔ 159

۴۴۔ شہروں کی ترقی پر اثر ڈالنے والی جدید قوتیں۔

اب ہم ان مختلف قوتوں کو بیان کریں گے جو جدید ہندوستان میں شہروں کی ترقی پر اثر ڈال رہی ہیں۔

---

[1] ۱۳-۱۹۱۲ تا ۳۵-۱۹۳۴ میں مجموعی درآمد سے درآمدہ مصنوعات کا تناسب ۶۲ء۴ فیصد تھا جس کے مقابلے میں زمانۂ قبل از جنگ کا تناسب ۶۷ء۲ تھا۔ اس کے برخلاف ۳۵-۱۹۳۴ تا ۳۶-۱۹۳۵ ہی میں ہندوستان کی مجموعی برآمد سے ہندوستان سے برآمد کردہ مصنوعات کا تناسب ۲۶ء۵ تھا جس کے مقابلے میں زمانۂ قبل از جنگ کا تناسب ۲۲ء۱ تھا۔ دیکھو "تبصرہ بر تجارت ہند" ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا ۳۵-۱۹۳۴ تا ۳۶-۱۹۳۵ جدول (۴) و (۵)۔

[2] دیکھو ڈاکٹر نال کی تصنیف محولۂ بالا باب ۴۔

[3] دیکھو ضمیمہ مطبوعہ اوراق کے صفحہ کا حوالہ دیا جائے۔

باب ۵

(۱) ریلوں اور جہازرانی نے نئے صنعتی مرکز پیدا کر دیئے ہیں اور بعض قدیم مرکزوں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے اولین نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ بڑے بڑے تجارتی مرکز رونما ہوئے، گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانویوں نے ہندوستان میں شہر سازوں کا کام انجام دیا۔ چنانچہ بمبئی، کراچی، مدراس، رنگون، کلکتہ، دہلی، لاہور، ہبلی اور بنگلور جدید تجارتی شہروں کی مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۲) مغرب میں جدید صنعتوں کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے شہروں میں آبادی بہت بڑی تعداد میں مجتمع ہوگئی، چنانچہ یہ واقعہ ہندوستان میں بھی اپنی نظیر سے خالی نہیں۔ ملک کی بڑی صنعتوں نے دیہات ومواضع کو قصبات میں اور قصبات کو شہروں میں مبدل کرنے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی، احمد آباد، شولاپور اور ہبلی، جہاں سوتی گرنیاں اور کارخانے قائم ہیں اور کانپور جہاں اون کی گرنیاں اور چمڑے کی فیکٹریاں قایم ہیں، جدید صنعتی دور کی پیداوار ہیں اور اِن کی وسعت واہمیت کا باعث یہ ہے کہ وہاں ایسی صنعتیں قائم ہوئیں جن سے روزمرّہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ۱۹۱۱ء کے بعد جب ٹاٹا کے آہنی وفولادی کارخانے میں توسیع ہونے لگی تو پھر جمشید پور بھی بہت تیزی سے ترقی کرنے لگا یہاں تک کہ وہ ہندوستان کا ایک غیر معمولی صنعتی کارنامہ سمجھا جانے لگا۔ لیکن ہندوستان میں شہروں کی ترقی پر صنعتی ترقی کا اس قدر طاقتور اثر نہیں پڑا جس قدر کہ مغربی ممالک میں پڑا تھا۔ چنانچہ یہ اس واقعے سے ثابت ہے کہ موجودہ ۳۴ ہندوستانی شہروں کے منجملہ جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے متجاوز ہے کم از کم ۲۲ شہر ایسے ہیں جن کی اہمیت کا باعث کم از کم ایک حد تک صنعتی یا تجارتی کاروبار کے سوا دوسرے اثرات ہیں۔ اور اس کا مزید ثبوت اس واقعے سے بھی جو ۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے، ہم پہنچتا ہے کہ ان شہروں کے صرف ۳۰ فیصد باشندے صنعتی پیشہ کرتے تھے۔

(۳) دیہی آبادی میں کمی اور شہری آبادی میں اضافہ جن اسباب کی بنا پر ہوتا ہے ان میں سے ایک قحط ہے۔ ممکن ہے کہ اس اضافے کا ایک جزو شہری پیشوں میں

باب ۵ مستقلاً جذب ہو جائے، گو عام طور پر اس اضافے کا بیشتر حصہ اس لیے یقیناً کم ہو جاتا ہے کہ اکثر لوگ بارش کے شروع ہوتے ہی اپنے اپنے دیہات کو واپس چلے جاتے ہیں۔

(۴) دیہات میں بے زمین مزدوروں کی جماعت کا نمودار ہونا کئی اسباب کا نتیجہ ہے، مثلاً قحطوں کا واقع ہونا، قدیم ملکی کاشتکاروں کا بے دخل کیا جانا اور

160 دستکاروں کا اجرت پانے والوں کی حیثیت میں تبدیل ہو جانا۔ اس جماعت کا وجود شہری آبادی کے اضافے میں ایک حد تک مدد دیتا ہے، اس لیے کہ بے زمین مزدور کو اگر شہروں میں کام مل جائے تو وہاں عام طور پر بخوشی جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

(۵) شہری زندگی کی گوناگوں دلچسپیاں، متمول زمینداروں اور دوسرے باحیثیت اشخاص کو شہروں میں جا بسنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ضمناً "پرباس زمینداری" کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

(۶) نظم و نسق کی مرکزیت نے دیہات کے مقابلے میں تعلقے کے قصبے کی اور تعلقے کے قصبے کے مقابلے میں ضلع کے مستقر کی اہمیت بڑھا دی ہے؛ علیٰ ہذا یہی بات ڈویژن کے صدر مقام، صوبائی پایۂ تخت، مرکزی حکومت کے دارالسلطنت اور ریاست کے مرکزی شہر کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔

(۷) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں عملاً بڑے شہروں تک محدود ہیں اور والدین اپنے بچوں کی تعلیم کی غرض سے عام طور پر ان ہی شہروں کو سکونت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔

۳۰۔ شہروں کے زوال کے اسباب

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شہروں کی اس روز افزوں ترقی کے دوش بدوش قدیم شہروں میں آبادی کی کمی کا میلان بڑھ رہا ہے۔

(۱) محل وقوع کی اہمیت کے تغیرات اور تجارتی شاہراہوں کی تبدیلی اکثر صورتوں میں ایسے شہروں کے زوال کا باعث ثابت ہوئی ہے جن کی سابقہ خوشحالی و سرسبزی کا منبع یہ تھا کہ وہ دریائی یا بری تجارتی راستے پر واقع تھے لیکن اب ریلوں کی توسیع کی وجہ سے ان راستوں کی اہمیت باقی نہیں رہی؛ مثلاً مرزاپور ساحل گنگا پر، پٹنا، ساگر وغیرہ۔ ریلوے انجینئر ہمیشہ ایسا خاکہ مرتب نہیں کر سکتا کہ ریل کی

باب ۶

پڑی قدیم شہری مرکزوں کے قریب سے ہو کر گزرے۔ چنانچہ شاہراہ سے دور اور الگ تھلگ ہو جانے کی وجہ سے بعض شہروں کی اہمیت فطری طور پر گھٹ گئی ہے۔

(۲) قدیم شاہی درباروں کے اجڑ جانے اور یوروپین مسابقت کے رونما ہونے کی وجہ سے شہر کی دستی صنعتوں کو زوال آیا جس کی بنا پر قدیم ہندوستانی شہروں مثلاً ڈھاکہ، مرشدآباد، مانڈلے، تنجور وغیرہ کی آبادی میں کمی ہو گئی۔ حتیٰ کہ گیا اور بنارس جیسے مقدس شہروں کی آبادی اور اہمیت بھی گھٹ رہی ہے، اس لیے کہ ان شہروں کی قدیم صنعتوں کی پیداوار کی طلب زائرین اور جاتریوں میں کم ہو رہی ہے۔

(۳) طاعون اور ہیضہ جیسی وبائیں جو میعادی طور پر نازل ہوتی رہتی ہیں شہروں کو مرگھٹ بنا جاتی ہیں اور آبادی کو ملک کے کھلے ہوئے حصّوں میں منتقل کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی نقل و حرکت بہ لحاظ نوعیت صرف عارضی ہوتی ہے، چنانچہ شہروں میں صحت و تندرستی کے معمولی حالات و شرائط عود کر آنے سے آبادی پھر شہروں کو واپس آجاتی ہے۔

شہروں کے عروج و زوال کے دو متضاد میلانات کا لحاظ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب تک ایک میلان دوسرے کو زائل کرتا رہا یا دونوں میں ایک حد تک توازن قائم رہا، گو حالیہ سالوں میں شہری آبادی کی ترقی کا میلان خفیف حد تک غالب اور نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ یہ حالت انگلستان میں صنعتی انقلاب کے زمانے کے واقعات سے نمایاں طور پر تضاد رکھتی ہے۔ وہاں جنوبی ملک کے

161 شہر قلیل سی مدت میں اجڑ گئے، لیکن ان کا زوال شمال کے بدرجہا زیادہ آباد مرکزی شہروں کے سریع عروج کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

۱۴ - مقامی معیشۃ سے بین الاقوامی معیشۃ میں اچانک تغیر۔

پروفیسر واڈیا اور پروفیسر جوشی اس ارتقا کو، جسے ہم "معاشی تغیر" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں "مقامی معیشۃ سے بین الاقوامی معیشۃ میں اچانک تغیر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں[۱]۔ اس کے ذریعے سے بظاہر صرف یہ مفہوم ادا کرنا مقصود ہے کہ گاؤں بیرونی دنیا سے اچانک طور پر ملحق ہو گیا، یہ کہ داخلی تجارت کے مقابلے میں

[۱] - دیکھو واڈیا اور جوشی کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۵۸ تا صفحہ ۱۶۰

باب ۵ بین الاقوامی تجارت نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر لی؛ یہ کہ چونکہ یہ تجارت بالکل غیر منظم تھی، اس لیے اس کی بنا پر ملک کی معاشی زندگی کی یکطرفہ اور بہ حیثیت مجموعی ضرر رساں ترقی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کے بہت موافق اور صنعت کے مخالف رجحان پیدا ہو گیا؛ یہ کہ یہ ترقی و تغیر افریقہ و ایشیا کے براعظموں کے غیر ترقی یافتہ علاقوں کے اس عام استحصال کا جزو تھا جو یورپ کی بڑی حکومتوں کے ہاتھوں عمل میں آ رہا تھا؛ اور یہ کہ ملک کی حکومت نے اس کو جائز قرار دیتے ہوئے حقیقی قومی اغراض کو ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ اگر ان تمام امور کی کوئی مختصر تعریف ضروری یا مفید خیال کی جائے تو، غالباً یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ "خود کفالت کی حالت سے بین الاقوامی مبادلے کی جانب اچانک تغیر واقع ہوا"۔ اس لیے کہ "بین الاقوامی معیشتہ" کی اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ ایک "عالمی ارادہ یا مقصد" موجود ہے جو "قومی ارادوں یا مقاصد سے مافوق اور ان پر حاوی ہے۔" لیکن موجودہ زمانے میں ایسا کوئی "عالمی ارادہ"، یا مقصد موجود نہیں ہے، اور بین الاقوامی تعلقات نسل انسانی کے نصب العین کے مطابق نہیں بلکہ متعلقہ قوموں کے ارادوں اور مقاصد کے لحاظ سے منظم ہوتے ہیں[1]۔ "قوم اب بھی معاشی اکائی ہے اور ہم بین الاقوامی معیشتہ کا لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتے جب تک کہ "قومی نقطۂ نظر عالمی یا بین الاقوامی ملحوظات سے مُتبدل نہ ہو جائے[2]"۔ بین الاقوامی معیشتہ میں کسی خاص قوم کو جو قربانی کرنی پڑے گی اس کو خود متعلقہ قوم اپنی رضا و رغبت سے قبول کرے گی اور اس پر کوئی دوسری قوم مکر یا قوت سے عائد نہ کرے گی۔ علاوہ ازیں ایسی قربانی انجام کار بہ لحاظ اس امر کے ہمیشہ حق بجانب ثابت ہو گی کہ قربانی کرنے سے نہ صرف عام طور پر مملکت عالم کو انجام کار فائدہ پہنچے گا بلکہ خود عارضی طور سے قربانی کرنے والی انفرادی مملکت کو بھی۔

پھر بھی جہاں ہمیں "بین الاقوامی معیشتہ" کی اصطلاح پر اعتراض ہے وہاں، عام طور پر اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوستان کی معاشی حالت کے تغیر کے

۱۔ دیکھو جے گرنزل کی کتاب "معاشی تامینیت" صفحہ ۳ تا صفحہ ۴ -

۲۔ دیکھو سینگ من کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۸۱ تا صفحہ ۸۲ -

باب ۵
162

دوش بدوش متعدد قابلِ افسوس خصوصیات بھی رونما ہوئیں۔ گو اس ارتقا کے نتیجے کے طور پر رونما ہونے والی تبدیلی سب کی سب خراب نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک اچھی بھی ہے، تاہم وہ اپنے ساتھ بعض یقینی خرابیاں بھی لائی، مثلاً ہندوستانی تجارتِ خارجہ کی انتہائی یکطرفہ نوعیت، ملکی صنعتوں کا بہ سُرعت زوال، اس کی معاشی زندگی میں غیر ملکی اصل کا ناواجب دخل، اور زمین پر آبادی کا حد سے زیادہ دباؤ وغیرہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نازک حالت میں مُلک کی معاشی سدھار کے لیے حقیقی قومی معیشتہ کو ترقی دینا نہایت ضروری اور اہم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ قومی معیشتہ اپنا نصب العین لازمی طور پر "خود کفالت" نہیں قرار دیتی اور نہ تجارت ماموں یا تجارت آزاد کی کسی مخصوص پالسی سے خود کو وابستہ کرتی ہے؛ بلکہ وہ اپنے طریق کار کا خود ہی انتخاب کر لیتی ہے، خواہ طریق کار کچھ ہی ہو، اور اس کا واحد نصب العین یہ ہوتا ہے کہ قومی مفاد اور خوشحالی کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔

۳۲۔ کیا ہندوستان کا صنعتی حیثیت سے ترقی کرنا مناسب ہے

ہندوستان میں صنعتوں کی ترقی و توسیع کی تحریک اچھی خاصی شروع ہو چکی ہے۔ اگرچہ رائے عامہ کا میلان اس کی رفتار کو تیز کرنے کی تائید میں ہے، پھر بھی بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو بس چلے تو اس کو اسی ابتدائی حالت میں اس لیے کچل دینا چاہتے ہیں کہ وہ ملک کے لیے نہایت نامبارک امکانات سے پر ہے۔ صنعتوں کی توسیع و ترقی کی مخالفت ایک حد تک ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی اور کام کو ناگزیر طور پر ادنیٰ، ذلیل، خشک اور بے مزہ بنا دیتی ہے۔ وہ صنعت کے سادہ اور دقیانوسی نظام کے دلدادہ ہیں جس کے تحت مشینوں کے دور کے مقابلے میں زیادہ ہوا اور روشنی ملے گی، چلنے پھرنے کی زیادہ گنجایش ہوگی اور زیادہ آزادی کے ساتھ کام کیا جا سکے گا۔ لیکن انتہائی طور سے سادہ معاشی زندگی کا یہ خیال ایک شاعرانہ خواب ہے جو حقیقت اور معقولیت سے بالکل مُعرا ہے؛ چنانچہ ہمیں تحقیق طور پر معلوم ہے کہ یہ خیال کسی زمانے اور کسی مقام میں کبھی پورا ہوا ہی نہیں۔ اس کے برخلاف ہم یہ جانتے ہیں کہ دستی محنت بہت سست رفتار، بوجھل اور وحشی بنانے والی ہوتی ہے اور یہ کہ جب سے انسانی وحیوانی محنت کی جگہ کلوں نے لی ہے، انسان کی معاشی حیثیت میں گونا گوں

اصلاح وترقی ہوگئی ہے اور انسان نے قدرت پر اپنے قابو کو بڑھا کر زمین کو زیادہ آرام دہ اور خوشگوار مسکن بنالیا ہے، چنانچہ انسانی وحیوانی محنت کی جگہ کلوں کو استعمال کرنے کا حقیقی مقصد یہی ہے۔

بعض لوگ اگرچہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں کی محنت کے ساتھ ساتھ کلوں کو بھی استعمال کرنا ایک حد تک ضروری ہے، پھر بھی وہ ایک ایسی حد قائم کرنا چاہتے ہیں جس سے تجاوز کر کے قدرت پر انسان کے قابو کو بڑھانے کو وہ جائز نہیں قرار دیتے۔ مثلاً وہ پن چکی یا ہوائی چکی یا سادہ چوبی ہل یا کتائی کے چرخے تک اپنی ترقی کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے کہ قدرت پر اپنا قابو بڑھانے کے لیے انسان نے جو شروعات کی ہیں ان کا سلسلہ آگے بڑھا کر اپنے تسلط کو اور زیادہ مکمل کیوں نہ کیا جائے۔

اس بات کا یقیناً قرینہ ہے کہ جدید طرز کے بڑے پیمانے کے کاروبار اور کلوں 163
کے رواج کے نتیجے کے طور پر بعض بہت ہی شدید خرابیاں رونما ہوں، مثلاً آبادی کی حد سے زیادہ کثرت، کمزور کا طاقتور کے ہاتھوں تباہ ہونا، ناگفتہ بہ حالات اور صحت کش لئے مضر اور گندہ ماحول میں مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کا بے سروسامانی، تنگدستی، تکلیف و مصیبت کے ساتھ، زندگی بسر کرنا۔ تاہم یہ صحیح نہیں ہے کہ ان خرابیوں کو رفع کرنے کا واحد علاج ہی یہ ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعت کے جدید طریقوں کو ترک کیا جائے یا ان سے اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ مغرب کے تجربے سے ظاہر ہے، ان خرابیوں کو مناسب سرکاری پالیسی کے ذریعے سے اور آئین وقوانین وضع کر کے رفع کرنا بڑی حد تک ممکن ہے۔ اور یہ بہت ہی معنی خیز بات ہے کہ گو مغرب میں موجودہ معاشی نظام کے خلاف سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے پھر بھی کسی باثر شخص نے کلوں کو رواج سے کلیتہً خارج کر دینے کی تحریک یا تجویز ہی پیش نہیں کی۔ جو بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے وہ زیادہ تر بڑے پیمانے کی پیدائش کے طریق کے خلاف نہیں بلکہ پیدا کی ہوئی دولت کی تقسیم کے طریقے کے خلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں زندگی کے مادی پہلو پر ناواجب زور دینے سے احتراز

باب ۵

کرنا چاہئے۔ لیکن ہندوستان جیسے مفلس ملک کے لیے یہ واضح طور سے ضروری ہے کہ فی کس دولت کی مقدار میں اضافہ کیا جائے اور اس کے کروڑوں باشندوں کو محض زیست کے افکار اور پریشانیوں سے نجات دلائی جائے تاکہ ان کے لیے کسی قسم کا بہتر طرز بود و باش ممکن و میسّر ہو سکے[1]۔ اور یہ پیدائش کے جدید ترین طریقوں کو استعمال کیے بغیر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ذہن نشیں رکھنا چاہئے کہ ہندوستان اب بقیہ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، خواہ وہ اس کا خواہاں ہی کیوں نہ ہو، اور وہ صرف اس صورت میں غیر ملکی مسابقت کی زد سے بچ کر نکل سکتا ہے جبکہ جدید صنعتی ترقی کے آلات خود بنائے۔ ایف، ایس، مارون نے کلوں کی تائید میں نہایت پُرزور استدلال حسب ذیل کیا ہے:۔ "مشین، قدرت پر انسان کی طبیعی قوت اور دسترس بڑھادیتی ہے، اس کو اس قابل بناتی ہے کہ زیادہ دماغی محنت کر سکے، اپنی انگلیوں سے زیادہ دیر تک اور زیادہ نزاکت و صفائی سے کام لے سکے اور اس کے رگ پٹھوں میں زیادہ قوت پیدا کرتی ہے۔ جو شخص اس کا اصولاً مخالف ہے وہ نوع انسانی کی ترقی کا دشمن ہے؛ وہ کوئی حد فاصل قایم کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں تک انسان کا اپنی قوت کو بڑھانا حق بجانب ہے لیکن اس سے تجاوز کرنا درست نہیں۔ کیا یہ حد قوت محرکہ سے چلنے والے ہل پر قائم کرنی چاہئے یا اس قدیم ترین اور سادہ ترین لکڑی پر جو زمین کھرچنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، فولادی میکانی فصل تراش تک اس کو محدود رکھنا چاہئے یا حجری دور کی پتھر کی کلہاڑی تک؛ ان میں کمال اور قوت کے مدارج کے سوائے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ اصل اعتراض تو کسی دوسری ہی چیز پر ہے جو اس سے مختلف ہے یعنی صنعتی شہر پر، فیکٹری کے نظام پر اور اس چیز پر جس کو "اجرت کی غلامی" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب معاشری انتظامات ہیں جن میں حسب دلخواہ و مرضی ترمیم و اصلاح کی جاسکتی ہے، تاہم وہ قدرت پر انسانی دسترس کے اضافے سے کسی طرح لازماً وابستہ نہیں ہیں۔"

[1] ہندوستان کی مادی ترقی کے بارے میں زیادہ مناسب طریق کار اختیار کرنے کی عمدہ بحث کے لیے دیکھو ام، ال ڈارلنگ کی کتاب موسوم بہ "دیہاتی کی کہانی خود اس کی زبانی" صفحہ ۲۷۴۔

باب ۵ 164

جو لوگ ہندوستان کو صنعتی ملک دیکھنے کے مخالف ہیں بعض اوقات وہ ایک نرالے انداز میں استدلال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں کو فروغ دینا صرف اس حالت میں ممکن ہے جبکہ ہندوستان کی عظیم ترین صنعت یعنی زراعت کا خون کیا جائے۔ اس استدلال پر اُس باب میں بحث کی جائے گی جس میں ہندوستان کی صنعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سردست ہم یہ کہنے پر قناعت کریں گے کہ صنعتی ترقی، ہمارے ملک کی زرعی ترقی کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس پر مفید و نفع رساں اثر ڈالتی ہے۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستان کو بسرعت صنعتی ملک بنانا ضروری اور مناسب ہے روز افزوں قوت حاصل کرتا جا رہا ہے اور اس میلان کے مخالفوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بے سُود اور لاحاصل سعی کر رہے ہیں۔ انھیں صنعتی ترقی کے امنڈ نے والے سیلاب کو روکنے کی کوشش میں اس سے زیادہ کامیابی کا موقع نہیں ہے جتنا کہ مسز پارٹنگ ٹن جیسی نیک نفس خاتون کو بحر اطلانطک سے بے انداز زور آزمائی کرنے میں اور اس کو اپنی کوچی سے ڈھکیلنے کی دلیرانہ کوشش میں تھا۔

165

باب ۶

زراعت

پیداوار اور برآمد

ا۔ زراعت کی حیثیت معاشیات ہند میں۔

ہندوستان کی معاشی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے سب پیشوں کے مقابلے میں زراعت کا پلّہ بہت بھاری ہے۔ چنانچہ انسانوں کا ایک انبوہ کثیر جو ملک کی تین چوتھائی آبادی کے برابر ہے، کھیتی باڑی میں اپنی زندگی اور محنت وقف کیے ہوئے ہے۔ یہاں کی زرعی پیداوار میں وہ سب خوردنی اجناس شامل ہیں جو ملک میں صرف کیے جاتے ہیں؛ اور روئی سَن، روغن دار تخم وغیرہ جیسی اشیائے خام کثیر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں جو بڑی صنعتوں میں کام میں آتی ہیں۔ تاہم ہندوستانی زراعت کی موجودہ حالت کی تحقیق، حکومت ہند کے مشیر زراعت ڈاکٹر کلاوسٹن کے حزن انگیز الفاظ کی پوری پوری تصدیق کرتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف

بابٹ

فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں جس طرح نیچ طبقے موجود ہیں، اسی طرح نیچ صنعتیں بھی پائی جاتی ہیں، چنانچہ بدقسمتی سے زراعت ان ہی صنعتوں میں سے ایک ہے"[1] خواہ کسی معیار سے جانچیے، کھیت کی وسعت و ترکیب، آلات کشاورزی اور کھاد، دوری فصلوں کا طریق، تخموں کی خوبی، آبپاشی کی سہولتیں اور دوسری قسم کی ارضی اصلاح و ترقی، کاشتکاری کے حیوانات، انتظام فروخت پیداوار، ذیلی دیہی پیشے وغیرہ، ہر اعتبار سے ہماری زراعت انتہائی پسماندہ حالت میں ہے۔ یہ بات اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ فی ایکر پیداوار انتہائی کم مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دوسرے ملکوں کی پیداوار کے مقابلے میں اس کی مقدار زیادہ سے زیادہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی ہوتی ہے[2]، اور خشک سالی و قحط کے زمانے میں یہ بھی گھٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔

۲۔ زراعت کو ترقی دینے کی ضرورت۔

متعدد اعتباروں سے زرعی اصلاح و ترقی کی شدید ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وہ عوام کی معاشی حالت درست کردے گی، ان کے معیار زندگی کو بڑھا دے گی، اور ملک کی آبادی کے لیے غذا کی رسد یقینی طور پر بہم پہنچائے گی۔ زراعت کی اصلاح و ترقی کا جو اثر صنعت پر پڑے گا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ دیہی آبادی کی قوت خرید میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے ایک وسیع گھریلو بازار وجود میں آئے گا جس میں ملکی مصنوعات کی کھپت ہوگی۔ زرعی اصلاح و ترقی کے معنی لازمی طور پر یہ بھی ہوں گے کہ اس سے مختلف عملوں میں کلوں کا استعمال بڑھ جائے گا، اور یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے[3] کہ 166
کشاورزی کے آلات اور کلیں تیار کرنے والے مختلف بڑے کارخانے قائم ہوجائیں گے۔

لیکن یہاں دو امور کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اولاً جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، یہ کہ زراعت کی اصلاح و ترقی کے استدلال کے معنی یہ نہیں ہیں کہ

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ روئداد شہادت، جلد اوّل، حکومت ہند کے عہدہ داروں کی شہادت۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، روئداد شہادت جلد اوّل، عہدہ داران حکومت ہند کی شہادت۔

[3] دیکھو صنعتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۴۔

باب ۵

قسامِ ازل نے ہندوستان کی قسمت میں سراسر زرعی ملک ہونا لکھدیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی حیثیت ایسی ہے کہ اس میں سرسبز زراعت کے ساتھ ساتھ خوشحال صنعتیں بھی رہ سکتی ہیں۔ دوسری یہ کہ ہمیں اس واقعے کو بخوبی ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ہم اپنے زرعی مسائل کو اپنے صنعتی مسائل سے الگ رکھ کر حل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے زمانے میں زراعت و صنعت دونوں میں ساتھ ساتھ تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی کو مدد ملی۔ بحالت موجودہ ہندوستان کی دیہی و زرعی آبادی کی کثرت ایسی خرابیاں ہیں جو محض زرعی ترقی کے کسی نظام کے ذریعے سے رفع نہیں کی جاسکتیں۔ زمین پر آبادی کا جو دباؤ پڑرہا ہے اس کو کم کرنے اور شہروں اور صنعتوں سے اصل کو بتدریج ہٹا کر زمین میں مصروف ہونے کا موقع بہم پہنچانے کے لیے زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت کو بھی ترقی دینی چاہئے۔

ہندوستان کی موجودہ بیداری کو زراعت میں اس عالمگیر دلچسپی کا ایک رخ تصور کیا جاسکتا ہے جو جنگ عظیم کے بعد سے رونما ہوئی ہے۔ غالباً زمانہ قبل از جنگ میں زراعت کی انتہائی اہمیت کو فراموش کردینے کا میلان نمایاں تھا۔ لیکن جنگ کے تجربے نے خام پیداوار اور اشیائے خوردنی کی حد تک بیرونی رسد پر بھروسہ کرنے کے خطرات ظاہر کرکے اس تغافل کا خاتمہ کردیا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی قومی صنعت ہونے کے اعتبار سے زراعت نے اپنی حیثیت پھر قایم کرلی ہے اور اس کی تنظیم جدید و ترقی کے بارے میں قریب قریب ہر ملک میں بحثیں کی جارہی ہیں اور مضامین تحریر کیے جارہے ہیں یہاں تک کہ انگلستان بھی جو مصنوعات تیار کرنے والی حرفتوں کا زمانہ قدیم سے مرکز رہا ہے اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۳ - برطانوی ہند میں مختلف فصلوں کی کاشت کے رقبوں کے اعداد و شمار۔[۱]

جدول (۱)

رقبے کی نوعیت	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد
خالص رقبہ فنی مساحت کے لحاظ سے	۵۵۲٫۹۲	۰	۶۶۷٫۳۳	۰

[۱] - زرعی اعداد و شمار برائے برطانوی ہند از سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء (عارضی) صفحہ ۲ تا صفحہ ۳

باب ۶

سلسلہ جدول نمبر (۱)

رقبہ کی نوعیت	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	دیہی کاغذات کے مطابق خالص رقبے کا فیصد
دیہی کاغذات کے لحاظ سے خالص رقبہ	۵۵۳٫۷	۰	۶۶۶٫۸۶	۰
رقبہ زیر جنگلات	۶۶٫۳۶	۱۲٫۰	۸۹٫۰۷	۱۳٫۴
ناقابل زراعت	۱۳۷٫۹۶	۲۴٫۹	۱۴۴٫۶۵	۲۱٫۶
قابل زراعت افتادہ زمین	۱۰۷٫۵۲	۱۹٫۴	۱۵۳٫۵۹	۲۲٫۹
بنجر زمین	۴۲٫۱۵	۷٫۶	۴۷٫۴۵	۷٫۱
خالص رقبہ زیر کاشت	۱۹۹٫۷۱	۳۶٫۱	۲۳۲٫۱۰	۳۵٫۰
مجموعی زیر کاشت رقبہ (اس میں وہ رقبہ بھی شامل ہے جس پر ایک سے زائد مرتبہ کاشت ہوئی ہے)	۲۲۰٫۳۵	۰	۲۶۷٫۰۲	۰
رقبہ زیر آبپاشی	۳۲٫۵۸	۰	۵۰٫۵۱	۰

167

جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے۔	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
رقبہ جس پر اشیائے خوردنی کی کاشت ہوتی ہے				
چاول	۷۰٫۰۷	۳۱٫۸	۸۰٫۲۹	۳۰٫۰

باب ۶

سلسلہ جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
گیہوں	۱۸،۶۱	۸،۴	۲۷،۶۰	۱۰،۴
جو	۶،۲۲	۲،۴	۶،۷۲	۲،۵
جوار	۲۱،۸۲	۹،۸	۲۱،۴۰	۸،۰
باجرا	۱۳،۲۰	۵،۹	۱۳،۱۴	۵،۰
راگی	۳،۷۵	۱،۷	۳،۷۳	۱،۴
مکائی	۶،۲۰	۲،۸	۶،۰۵	۲،۳
چنا	۹،۷۸	۴،۴	۱۶،۵۴	۶،۲
دوسرا غلہ اور دالیں	۲۷،۳۵	۱۲،۴	۳۰،۶۱	۱۱،۵
میزان اجناس خوردنی	۱۷۷،۰۰	۸۰،۰	۲۰۶،۰۸	۷۷،۳
رقبہ دوسرے اشیائے خوردنی کے تحت (جس میں ترکاریاں، میوے، مسالے، متفرق غذا کی فصلیں وغیرہ شامل ہیں):-	۸،۰۳	۳،۷	۸،۰۸	۳،۰
شکر	۲،۶۰	۱،۳	۳،۳۶	۱،۳
مجموعی اشیائے خوردنی	۱۸۷،۶۳	۸۵،۰	۲۱۷،۵۲	۸۱،۶

باب

سلسلہ جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
رقبہ زیر کاشت روغن دار تخم:-				
السی	۲٫۲۷	۱٫۰	۲٫۰۷	٫۰۸
تل	۳٫۷۵	۱٫۷	۴٫۲۱	۱٫۶
سرسوں اور رائی	۲٫۸۸	۱٫۳	۳٫۳۲	۱٫۳
مونگ پھلی	.	.	۵٫۹۵	۲٫۲
ناریل	.	.	٫۶۴	۰٫۲
ارنڈی	.	.	٫۴۷	۰٫۲
دوسرے روغن دار تخم	۳٫۰۷	۱٫۴	۱٫۱۳	۰٫۴
میزان روغن دار تخم	۱۱٫۹۷	۵٫۴	۱۷٫۷۹	۶٫۶
ریشہ دار پودوں کی کاشت کا رقبہ:- 168				
روئی	۱۰٫۳۰	۴٫۷	۱۴٫۵۰	۵٫۴
سن	۲٫۲۸	۱٫۰	۲٫۵۰	٫۰۹
دوسرے ریشے	۰٫۵۶	٫۰۲	٫۰۶۳	۰٫۲
مجموعی ریشہ دار پودے	۱۳٫۱۴	۵٫۹	۱۷٫۶۳	۶٫۵

باب ۶
163

سلسلہ جدول (۱) الف

مختلف اجناس جن کی کاشت کی جاتی ہے	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد	ایکڑ (بحساب ملین) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	مجموعی زیر کاشت رقبے کا فیصد
ان فصلوں کا رقبہ جو بطور غذا استعمال نہیں ہوتیں:۔				
نیل	۰،۷۹	۰،۴	۰،۰۴	۰،۰۲
افیون	۰،۶۱	۰،۳	۰،۰۲	۰،۰۱
کافی	۰،۱۲	۰،۰۵	۰،۱۰	۰،۰۴
چائے۔	۰،۴۹	۰،۳	۰،۷۸	۰،۳۰
تمباکو	۰،۹۵	۰،۴۵	۱،۰۸	۰،۴۰
چارے کی فصلیں	۲،۹۴	۱،۴	۱۰،۲۱	۳،۸۴
متفرق فصلیں	۱،۷۱	۰،۸	۱،۸۵	۰،۶۹
میزان ناقابل خوردنی اشیا	۳۳،۷۲	۱۵،۰	۴۹،۵۰	۱۸،۴۰
مجموعی زیر کاشت رقبہ	۲۲۰،۳۵	۰	۲۶۷،۰۲	۱۰۰،۰۰
(بہ شمول اس رقبے کے جس پر ایک سے زیادہ مرتبہ کاشت ہوئی)	۲۰،۶۴	۰	۳۴،۹۲	۰

باب ۶

۴ - اہم فصلوں (دیسی ریاستوں کو شامل کر کے) کی پیداوار اور رقبۂ زیر کاشت کا اندازہ[1]

جدول (۲)

فصلیں		پیداوار (ملین) ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء	پیداوار (ملین) ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء	رقبہ (ملین ایکڑ) ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء
چاول	ٹن	۱۹٫۲۱	۳۰٫۷۹	۸۲٫۷۰
گیہوں	״	۶٫۰۹	۹٫۳۶	۳۶٫۰۶
جوار	״	.	۶٫۱۸	۳۲٫۱۶
باجرا	״	.	۲٫۱۳	۱۳٫۴۴
چنا	״	.	۳٫۳۷	۱۷٫۲۳
گڑ	״	۲٫۰۲	۵٫۹۰	۳٫۳۱
چائے	پاؤنڈ	۱۹۱٫۳۰	۳۸۳٫۲۶	۰٫۸۱
روئی	(۴۵۰ پاؤنڈ کے گانٹھ)	۳٫۵۶	۵٫۰۰	۲۳٫۹۲
سَن	(״ ״ ״)	۷٫۴۳	۷٫۹۹	۲٫۵۱
السی	ٹن	۰٫۳۵	۰٫۳۸	۳٫۲۶
سرسوں اور رائی	״	۰٫۹۵	۰٫۹۶	۶٫۰۷
تل	״	۰٫۳۵	۰٫۵۴	۶٫۲۱
تخم ارنڈی	״	.	۰٫۱۴	۱٫۵۴

[1] - دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان کی اہم فصلوں کی پیداوار اور زیر کاشت رقبے کا اندازہ از ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء" صفحہ ۸ اور صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۴۲ -

سلسلہ جدول نمبر (۲)

فصلیں		پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۰۲	پیداوار (ملین) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴	رقبہ (ملین ایکڑ) سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴
مونگ پھلی	ٹن	۰٫۰۶	۳٫۳۱	۸٫۰۶
نیل (ہنڈرڈ ویٹ)	"	۰٫۱۱	۰٫۰۱	۰٫۰۴
کافی	پاؤنڈ	۱۵٫۵۷	ـلہ	ـلہ
ربر	"		۱۴٫۲۵	۰٫۱۸

۵۔ کاشت عمیق اور کاشت وسیع کی گنجائش۔

جدول (۱) سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی رقبے کے ۳۵٫۰ حصے پر (بہ شمول جنگلات) کاشت نہیں ہوتی، یہ کہ صرف ۳۵٫۰ فیصد زیر کاشت ہے اور یہ کہ موجودہ بنجر زمین
169 اور قابل زراعت افتادہ زمین کو ملایا جائے تو مجموعی رقبے کے منجملہ ۳۰٫۰ فیصد حصہ ہندوستان میں توسیع زراعت کے لیے دستیاب ہوسکتا ہے۔ برطانوی ہند کے مختلف صوبوں میں توسیع زراعت کے لیے جو رقبہ دستیاب ہوسکتا ہے اس کا حال مندرجۂ ذیل جدول (۳) سے معلوم ہوگا جس میں سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ کے مزروعہ و غیر مزروعہ رقبے کو ہر صوبے میں الگ الگ ملین ایکڑ کے حساب سے بتایا گیا ہے۔ ـــہ

ـلہ: اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے سنہ ۱۹۲۲ تا سنہ ۱۹۲۳ کے لیے کافی کی بابت اعداد و شمار ۳۲٫۴۹ ملین ٹن (پیداوار) اور ۱۱۷۶۷۰۰ ایکڑ (رقبہ) تھے۔

ـــہ۔ دیکھو "زرعی اعداد و شمار" از سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ (عارضی) صفحہ ۴۔

باب ۶

جدول (۳)

صوبہ	[illegible]	مزروعہ: خالص رقبہ زیر کاشت	مزروعہ: بنجر زمین بحالت موجودہ	غیر مزروعہ: قابل زراعت افتادہ زمین	غیر مزروعہ: ناقابل زراعت رقبہ	جنگلات
مدراس	۹۱٫۰۰	۳۳٫۸۶	۱۰٫۳۸	۱۳٫۱۸	۱۹٫۸۸	۱۳٫۶۹
بمبئی	۷۸٫۸۸	۳۳٫۲۵	۱۰٫۴۶	۶٫۵۸	۱۹٫۸۲	۹٫۲۷
بنگال	۴۸٫۵۵	۲۴٫۰۰	۴٫۷۶	۶٫۲۶	۸٫۹۴	۴٫۶۱
یوپی	۶۷٫۹۷	۳۶٫۰۱	۲٫۵۰	۱۰٫۲۸	۹٫۹۰	۹٫۳۸
پنجاب	۶۰٫۱۷	۲۸٫۶۸	۲٫۴۶	۱۴٫۲۰	۱۲٫۸۶	۱٫۹۷
برما	۱۵۵٫۸۵	۱۸٫۲۴	۳٫۶۵	۵۹٫۷۶	۵۲٫۰۴	۲۲٫۱۶
بہار و اوڑیسہ	۵۳٫۱۳	۲۴٫۱۸	۶٫۹۳	۶٫۹۵	۸٫۰۱	۷٫۰۶
سی پی و برار	۶۴٫۰۹	۲۴٫۹۹	۳٫۷۷	۱۴٫۱۱	۴٫۹۵	۱۶٫۲۷
آسام	۳۵٫۴۸	۵٫۸۸	۱٫۸۷	۱۹٫۲۱	۴٫۵۷	۳٫۹۵
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۸٫۵۸	۲٫۲۹	۰٫۵۳	۲٫۷۱	۲٫۷۰	۰٫۳۵
اجمیر میرواڑہ	۱٫۷۷	۰٫۳۵	۰٫۱۶	٫۰۲۸	۰٫۸۸	۰٫۱۰
کورگ	۱٫۰۲	٫۰۱۴	۰٫۱۷	۰٫۰۱	۰٫۳۳	۰٫۳۶
دہلی	۰٫۳۷	۰٫۲۲	۰٫۰۱	۰٫۰۶	۰٫۰۸	۰
میزان	۶۶۶٫۸۶	۲۳۲٫۱۰	۴۷٫۴۵	۱۵۳٫۵۹	۱۴۴٫۶۵	۸۹٫۰۷

ظاہر ہے کہ مزید کاشت کی گنجائش، خاصکر برما، آسام، سندھ، پنجاب اور صوبۂ متوسط میں بہت ہے۔ لیکن اس مسئلے کی گہری جانچ لازمی طور پر اس نتیجے پر

پہنچاتی ہے کہ کاشت وسیع کے مواقع ہندوستان میں بحیثیت مجموعی بہت محدود ہیں۔ باب ۶
بنگال، صوبۂ متحدہ، مدراس اور بمبئی جیسے قدیم صوبوں میں کاشت فطری طور پر کم ترین مقاومت کے اصول پر ہوتی رہی ہے، اور بہترین قسم کی زمینیں زیر کاشت آچکی ہیں اور بڑی حد تک صرف ادنیٰ زرخیزی کی زمینیں کاشت کے لیے باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں ان پر کاشت صرف اُس وقت ممکن ہوسکتی ہے جبکہ آبپاشی کی کافی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ علیٰ ہذا پنجاب، صوبۂ متوسط، آسام، برما اور سندھ جیسے جدید صوبوں میں بھی اسی کے مشابہ صورت حال بتدریج ترقی پارہی ہے۔ چنانچہ یہاں گو اعلیٰ زرخیزی کی زمینیں ابھی تک پوری طرح زیر کاشت نہیں آئی ہیں، پھر بھی مختلف قسم کی دقتوں کا سامنا رہتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں کاشت کی توسیع کا دارومدار زیادہ تر آبپاشی پر ہے جس کا انتظام یہاں دوسرے علاقوں مثلاً بمبئی دکن اور صوبۂ متوسط کے مقابلے میں بہت آسان ہے لیکن مالی اور طبیعی مشکلات کی وجہ سے وہ بہرحال ہر جگہ محدود ہی ہے۔ آسام میں مضر صحت آب وہوا سے قطع نظر کرتے ہوئے سب سے بڑی مزاحمتیں یہ ہیں (۱) محنت کے ناموافق حالات اور (۲) اس کے نتیجے کے طور پر محنت کی مطلوبہ رسد کو حاصل کرنے کی دشواری "برما برمیوں کے لیے" کا نعرہ برما میں قومی صوبہ واری احساس کو ظاہر کرتا ہے جو زراعت کی تیز رفتار توسیع کے لیے ایک سنگ راہ ہے اس لیے کہ موجودہ حالات میں صرف محنت کی بیرونی رسد ہی کی مدد سے زراعت ترقی کرسکتی ہے۔ پس ان صوبوں میں بھی جہاں قابل زراعت افتادہ زمین کا وسیع رقبہ موجود ہے زراعت کی کسی نمایاں توسیع کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اس نتیجے کی تصدیق مندرجۂ ذیل اعداد سے ہوتی ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قریب کے زمانے میں برطانوی ہند کے زیر کاشت خالص رقبے میں بہت دھیمی اور تدریجی رفتار کے ساتھ توسیع وترقی رونما ہوئی ہے۔

زیر کاشت رقبہ

سال	خالص رقبہ زیر کاشت (ملین ایکڑ)
سنہ ۱۸۹۲ تا سنہ ۱۸۹۴	۱۹۵ ء ۹۱

باب ۶

سال	خالص رقبہ زیرکاشت (ملین ایکڑ)
سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء	۱۹۹٫۷۱
سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء	۲۲۳٫۰۶
سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۲ء	۲۲۳٫۱۸
سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۵ء	۲۲۳٫۸۶
سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء	۲۲۸٫۱۷
سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء	۲۲۹٫۰۹
سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء	۲۲۸٫۸۴
سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء	۲۳۲٫۱۰

ہندوستان کے زرعی مسئلے کا زیادہ امید افزا حل کاشت عمیق کے طریق میں مضمر ہے۔ کاشت عمیق کے امکانات کی تمثیل کے طور پر ہم جاپان کی مثال پیش کر سکتے ہیں جہاں پانچ کروڑ ۶۰ لاکھ آبادی کی کفالت ایک کروڑ ستر لاکھ ایکڑ مزروعہ رقبے کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ گویا ہندوستان کے $\frac{5}{6}$ ایکڑ فی کس کے مقابلے میں یہاں کا اوسط تقریباً $\frac{1}{12}$ ایکڑ فی کس ہے۔[1]

ہندوستان میں ابھی تک جدید سائنسی اصول پر کاشت عمیق کا آغاز کرنے کی 171
بمشکل کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے، حالانکہ کاشت وسیع کے طریقے زرعی آبادی کی کثرت اور چھوٹے کھیتوں کی موجودگی کی وجہ سے انتہائی طور پر ناموزوں ہیں۔

۶۔ فصلوں کی اضافی اہمیت۔

ہندوستان کی زرعی پیداواروں میں فصلوں کی کاشت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لوگ زیادہ تر نباتات پر گزر کرتے ہیں اور اشیائے برآمد میں تخم اور ریشوں کو بہت

[1] دیکھو۔ ایم دس ویس دسیا کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان کی تنظیم جدید" صفحہ ۱۷۴۔

باب ۶

اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستانی کسان فصلیں اگاتا ہے اس کے مویشی اس کو صرف کاشت ہی میں مدد نہیں دیتے بلکہ اس کے کنبے والوں کی غذا کی ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ گوشت، اون اور دودھ دہی مکھن پنیر وغیرہ ملک سے برآمد نہیں کیے جاتے۔[1] مختلف فصلوں کی کاشت کا رقبہ یہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان میں زرعی پیداوار انواع و اقسام کی ہوتی ہے اور مختلف فصلیں اضافی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ مختلف پیداواروں کی کاشت ہندوستان کو اس قابل بناتی ہے کہ اپنے جملہ اشیائے خوردنی اور انواع و اقسام کی اشیائے خام کی کثیر رسد کی صورت میں اپنی جملہ ضرورتوں کا خود کفیل رہے۔ اشیائے خوردنی کی بہت زیادہ مقدار میں کاشت کی جاتی ہے چنانچہ مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۷ ر ۸۱ فیصد حصے پر ان ہی کی کاشت کی جاتی ہے، اور ناقابل خوردنی اشیا کی کاشت کے رقبے کا فیصد ۳ ر ۱۸ ہے، گو عالمی قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل خوردنی اشیا مثلاً روئی، سن، روغن دار تخم وغیرہ کی کاشت کا رقبہ اشیائے خوردنی کی کاشت کے رقبے کے مقابلے میں بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ اشیائے خوردنی کی فصلوں میں چاول کا نمبر سب سے اوّل ہے؛ اس کے بعد کے درجے میں گیہوں، جوار، باجرا، اور چنے کی کاشت ہوتی ہے۔ ناقابل خوردنی فصلوں میں ریشے (روئی سن وغیرہ) سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۵ ر ۶ فیصد پر ان کی کاشت ہوتی ہے۔ روئی ان ریشوں میں سب سے زیادہ اہم پیداوار ہے۔ اس کے بعد روغن دار تخموں کا نمبر ہے، چنانچہ مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ ۶ ر ۶ فیصد حصے پر ان کی کاشت ہوتی ہے۔

۷۔ ہندوستان کی اہم فصلوں کی جانچ[2]

(الف) اشیائے خوردنی کی فصلیں۔

(۱) چاول۔ ہندوستان کی سب سے بڑی پیداوار چاول ہے جو اکثر باشندوں کی غذا کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چاول کی کاشت مجموعی زیر کاشت رقبے کے ۳۰ فیصد حصے پر ہوتی ہے، چنانچہ اس کا مجموعی رقبہ ۷۰ر۲۲ ملین ایکڑ ہے

[1] دیکھو اے ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں فصلوں کی تیاری" صفحہ ۶۱

[2] اس جانچ کے لیے ہم نے حسب ذیل تحریروں سے مدد لی:۔

(۱) ہندوستان کے زرعی کاروبار پر تبصرہ۔

باب ۶ جس سے ۳۳-۱۹۳۲ء تا ۳۴-۱۹۳۳ء میں ۹ء۳۰ ملین ٹن پیداوار حاصل ہوئی۔ دنیا کی چاول
کی مجموعی پیداوار میں ہندوستان کا حصّہ تقریبًا ۴۰ فیصد ہے اور وہی دنیا کا سب
172 سے بڑا چاول کی برآمد کرنے والا ملک ہے، اگرچہ اس کی اوسط برآمد کی مقدار اس
کی مجموعی پیداوار کے ۲ یا ۸ فیصد سے شاذ ہی متجاوز ہوتی ہے۔ چاول کی کاشت
ہندوستان کے بڑے حصے میں ہوتی ہے اور خاصکر ان حصوں میں جو مرطوب
اور نم ہیں۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل اعداد سے مختلف صوبوں میں چاول کی کاشت کا
حال معلوم ہوگا:۔ بنگال ۶۷ء۲۱ ملین ایکڑ، بہار و اوڑیسہ ۲۳ء۱۳، برما ۸۵ء۱۲،
مدراس ۷ء۱۱، صوبۂ متحدہ ۹۵ء۵، صوبۂ متوسط ۴۶ء۶، آسام ۷۲ء۴ اور بمبئی ۹۱ء۲۔
چاول مشرقی صوبوں اور برما میں اصل غذا کے طور پر بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ گو
برما میں مجموعی زیر کاشت رقبے کے منجملہ چاول صرف ۵ فیصد حصے پر بویا جاتا ہے
پھر بھی برما کو چاول کی برآمد کی تجارت میں کم و بیش اجارہ حاصل ہے اور ہندوستان
کے دوسرے علاقوں کے مقامی صرف کے لیے رسد میں قلت ہو تو اس کو بھی پورا
کردیتا ہے۔ اس لیے کہ برما میں چاول کے زیر کاشت رقبے کا تناسب آبادی کے
مقابلے میں اس قدر بڑا ہے کہ اس کی قابل برآمد زائد پیداوار بنگال، بہار یا
مدراس کی قابل برآمد زائد پیداوار کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے۔ گو موخرالذکر
صوبوں میں برما کے مقابلے میں چاول کی زیادہ مقدار کاشت ہوتی ہے لیکن
ان کو اندرونی طلب نسبتًا بہت کثیر مقدار میں پوری کرنی پڑتی ہے۔ برما کی
چاول کی تجارت، برما کی مجموعی برآمد کے ۸۸ فیصد یا اس کی مجموعی پیداوار کے
تقریبًا ۵۰ فیصد کی نمایندگی کرتی ہے۔ ۳۵-۱۹۳۴ء تا ۳۶-۱۹۳۵ء میں بنگال اور مدراس نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ (۲) ہندوستان کی اہم فصلوں کی پیداوار اور ان کے رقبے کا اندازہ ۳۳-۱۹۳۲ء تا ۳۴-۱۹۳۳ء
(۳) ہندوستان کی فصلوں کا نقشہ ۲۵-۱۹۲۴ء۔
(۴) کاٹن کی کتاب موسوم بہ "تجارتی معلومات کا خلاصہ"۔ دوسرا اڈیشن ۲۴-۱۹۲۳ء۔
(۵) ہاورڈ کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں فصلوں کی تیاری"
(۶) زرعی کمیشن کی رپورٹ۔

باب ۶

علی الترتیب ۶ اور ۵ فیصد برآمد کیا۔ برما کی برآمد نسبتاً بڑھ رہی ہے لیکن اس کے برخلاف ہندوستان کی برآمد کا تناسب گھٹ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان نے ۲،۳۲۶،۰۰۰ ٹن چاول برآمد کیا جس کی قیمت ۳۱،۵۰ کروڑ روپے تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ء میں برآمد کی ہوئی پیداوار کی مقدار ۲،۲۷۹،۰۰۰ ٹن تک اور اس کی قیمت ۲۵،۹۷ کروڑ روپے تک گر گئی۔ چاول کی قیمت کی کمی، جو زیادہ تر تجارتی کساد بازاری کا نتیجہ تھی، چاول کی تجارت کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ہندوستان (بہ شمول برما) کی برآمد مجموعی پیداوار کا ۵ فیصد رہی۔ بعد کے سالوں میں برآمد کی مقدار اور قیمت میں مزید کمی رونما ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ء میں برآمد کی مقدار ۱،۷۴۸ ٹن اور قیمت ۵،۷۰ ۱۰ کروڑ روپیہ اور سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں مقدار ۱،۶۰۶ ٹن اور قیمت ۱۰،۳۷ کروڑ روپے تھی۔ غیر ملکی بازاروں میں ہندوستانی چاول کی مانگ کی کمی ایک حد تک اس بنا پر زائل ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی چاول کو سلطنت متحدہ میں ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں ہندوستان سے انگلستان کو جو چاول برآمد ہوا اس میں ۱۰۰،۱ ٹن سے ۸۴،۰۰۰ ٹن تک اضافہ ہوا۔ کچھ سال ادھر سے سیام، فرانسیسی انڈو چین اور جاپان سے ہندوستان میں چاول کی درآمد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں درآمد کی مقدار سال ماسبق کے ۸۸،۴۰۵ ٹن کے مقابلے میں، ۳۹۴،۰۵۱ ٹن رہی۔ یہ درآمدہ چاول جو زیادہ تر مدراس گیا کنکی کی شکل میں تھا اور گرانی کے کاروبار کی ذیلی پیداوار تھا۔ اس نے مقامی قیمتوں کو بڑی حد تک گھٹا دیا۔ اسی لیے تاینی تدبیر کے طور پر کنکی (ٹوٹے ہوئے چاول) پر ۱۲ آنہ فی من کا محصول درآمد اپریل سنہ ۱۹۳۵ سے ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۳۶ تک عاید کیا گیا۔

چاول سرمائی فصل ہے جو زیادہ تر دسمبر اور جنوری میں کٹتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف مقامی حالات اور معلومات کی بنا پر مختلف قسم کا دھان پیدا ہوتا ہے۔ غالباً مسئلے کی پیچیدگی اور وسعت ہی کے باعث محکمۂ زراعت نے اب تک 173
اس فصل کے بارے میں بہت کم ترقی کی ہے۔[۱] لیکن کچھ سال ادھر سے زرعی

[۱]۔ دیکھو میکنا کی کتاب موسومہ بہ "ہندوستانی زراعت"

باب ۶

تحقیق کی شاہی کونسل کی سرپرستی میں تحقیقاتی کام کے نتائج زیادہ بہتر رہے ہیں۔

(۲) گیہوں رقبے کے لحاظ سے چاول کی کاشت کے بعد گیہوں کا نمبر ہے جو مجموعی زیر کاشت رقبے کے ہنجلہ ۱۰ فیصد پر بویا جاتا ہے۔ ہندوستان میں گیہوں فصل ربیع ہے جو اکتوبر تا دسمبر میں بوئی جاتی ہے اور مارچ تا مئی میں کٹتی ہے پنجاب، صوبۂ متحدہ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے باشندوں کی غذا گیہوں ہے۔ دوسرے مقامات پر وہ زیادہ تر برآمد کی غرض سے کاشت کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں گیہوں کی کاشت کا رقبہ ہندوستان میں ۳۶٫۰۶ ملین ایکڑ تھا۔ ہندوستان کے گیہوں پیدا کرنے والے اہم صوبے پنجاب (۹٫۷۷ ملین ایکڑ) صوبۂ متحدہ (۸٫۴۵ ملین ایکڑ)، صوبۂ متوسط و برار (۳٫۴۴ ملین ایکڑ)، ریاستہائے وسط ہند (۲٫۰۸ ملین ایکڑ)، بہار و اڑیسہ (۱٫۲۲ ملین ایکڑ) اور بمبئی (۳٫۲۳ ملین ایکڑ) ہیں۔ پنجاب اور صوبۂ متحدہ کا رقبہ مجموعی رقبے کا $\frac{1}{2}$ اور ان کی پیداوار کا $\frac{3}{4}$ ہے۔ بقول کاٹن "ہندوستان دنیا کی مجموعی پیداوار کا تقریباً ۱/۱۰ گیہوں پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ میں دنیا کے گیہوں برآمد کرنے والے پانچ اہم ملک بہ لحاظ مقدار برآمد علی الترتیب ریاستہائے متحدہ امریکا، روس، کنیڈا، جمہوریہ ارجن ٹائن اور ہندوستان تھے۔ پیداوار کی حد تک ہندوستان تیسرے نمبر پر ہے۔" بڑی جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے گیہوں کی کاشت کے رقبے میں قابل لحاظ توسیع ہوئی، چنانچہ رقبہ ۲۸٫۴۷ ملین ایکڑ سے ۳۵٫۴۸ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا، جس کا باعث یہ واقعہ تھا کہ حکومت نے کثیر مقدار میں خریداری کی تھی۔ گیہوں کی تجارت برآمد ۱۸۷۰ء میں نہر سویز کے کھل جانے کے بعد سے ترقی کر رہی تھی۔ لیکن گیہوں کی برآمد کی مقدار میں ہندوستان اور بیرونی ممالک کے موسموں کی نوعیت کے لحاظ سے تغیرات ہوتے ہیں۔ قحط کے زمانے میں مقامی قیمت عام طور پر اتنی اعلیٰ ہو جاتی ہے کہ برآمد کی مقدار بہت گر جاتی ہے۔ بڑی جنگ سے پیشتر کے پانچ سالوں میں اوسط برآمد ۳۰۸٫۰۰۰ ٹن ہوئی جس کی قیمت ۳٫۹۶ کروڑ یا گیہوں کی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تھی۔ اس کے بعد سے خاصکر زمانۂ بعد از جنگ میں گیہوں کی برآمد میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ کچھ زمانے سے ہندوستان کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ دنیا کے

باب ٦ بازار میں گیہوں کی بہت ہی تھوڑی مقدار بھیج رہا ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی
مقدار قریب قریب ۱۰,۰۰۰ ٹن اور اس کی قیمت ۱۰,۵ لاکھ روپے تھی جس کے
مقابلے میں ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں مقدار ۲۰,۲۰۰ ٹن اور قیمت ۱۵ لاکھ روپے تھی،
اور زمانۂ بعد از جنگ کے پہلے پنجسالہ دور میں مقدار کا اوسط ۲۳۷,۰۰۰ ٹن اور قیمت
کا اوسط ۷,۳۲ کروڑ روپے تھا۔ بڑی جنگ کے بعد سے مالی امداد اور درآمد کی روک
174 کی پناہ میں برآمد کرنے والے اور درآمد کرنے والے ملکوں میں زراعت کی غیر معاشی
توسیع نے گیہوں کے بین الاقوامی مسئلے کو ایک چیستان بنا دیا ہے۔ کچھ سال ادھر سے
شدید مسابقت اور ادنیٰ قیمتوں کی موجودگی میں ہندوستان اس بات پر مجبور
ہوا ہے کہ نہ صرف بین الاقوامی بازار سے الگ رہے بلکہ اپنے گیہوں بونے والوں
کے اغراض کے تحت دوسرے ممالک کے ارزاں گیہوں اور گیہوں کے آٹے کی درآمد
پر محصول عائد کرے۔ قانون محصول درآمد گندم کی رو سے مارچ ۱۹۳۱ء سے محصول درآمد
کی مقدار دو روپے فی ہنڈرڈ ویٹ تھی، اس محصول کو اپریل ۱۹۳۵ء میں ایک روپیہ
آٹھ آنے تک کم کر دیا گیا، اس لیے کہ ہندوستانی گیہوں اور ہندوستان میں درآمد
آسٹریلیائی گیہوں کی قیمتوں کا درمیانی فرق گھٹ گیا تھا۔ یہ محصول ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء تک
نافذ رہنے والا تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں گیہوں کی درآمد کی مقدار ۸,۳۰۰ ٹن تھی، اس کے
مقابلے میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں مقدار صرف ۷,۴۰۰ ٹن اور قیمت ۵ لاکھ روپے رہی۔
ملک میں باہر سے جو گیہوں آ رہا تھا اس پر محصول درآمد کی روک قائم ہونے کی وجہ
سے ہندوستانی گیہوں کی قیمتیں صورت حال پر اثر ڈالنے والے بیرونی عاملین سے
زیادہ اندرونی طلب سے متاثر ہوتی رہی ہیں[١]۔

نقل و حمل اور آبپاشی کی اصلاح و ترقی نے گیہوں کی کاشت کے حق میں بہت
بڑے محرک کا کام کیا ہے۔ یہ بات پنجاب کی جدید نہری نو آبادیات کے بارے میں
خاص طور پر صادق آتی ہے۔ ایک زمانے میں ہندوستانی گیہوں ناقص مشہور تھا،
لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کو بے احتیاطی کے ساتھ کوٹا یا رکھا جاتا تھا بلکہ

---

[١]۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستانی تجارت پر تبصرہ" ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۰۰ تا صفحہ ۱۰۲ (Review of the Trade of India)

زیادہ تر یہ تھی کہ انگریزی تجارت کے طریقے کے مطابق گیہوں میں جان بوجھ کر آمیزش کی جاتی تھی ۱۹۰۸ء کے بعد سے اس اعتبار سے بہت کچھ اصلاح و ترقی رونما ہوئی ہے۔ محکمۂ زراعت کی قرار دادہ قسم پوسا نمبر ۱۲ نے غلے کی خوبی کی اصلاح کر دی ہے، لیکن اس خوبی کو مزید ترقی دینا اور برقرار رکھنا چاہیے تاکہ ہندوستانی گیہوں عالمی بازاروں میں وہی قیمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جو کنیڈا اور امریکا کے گیہوں کو حاصل ہوتی ہیں۔

(۳) جو ۔ یہ زیادہ تر صوبۂ متحدہ اور بہار میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان صوبوں میں اس کے زیر کاشت رقبہ علی الترتیب ۲۷ر۴ ملین ایکڑ اور ۳۱ر۱ ایکڑ ہے۔ جو کی برآمد اس لیے بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہے کہ اندرون ملک اس کی طلب بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۰۰ر۱۴ ٹن تھی جس کی قیمت ۳ر۹ لاکھ روپے وصول ہوئی۔ انسان اور جانور دونوں کے لیے جو بطور غذا استعمال ہوتا ہے۔

(۴) کنگنی ۔ ہندوستانی کنگنی کی دو قسمیں ہیں، جوار اور باجرہ ۔ اور یہ مدراس، بمبئی (دکن) اور سلطنت حیدرآباد کے ملحقہ علاقوں کے باشندوں کی خوراکی فصلوں کی اہم قسم ہیں۔ زرعی مویشی کے لیے بھی وہ قابل قدر چارہ بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کو گیہوں کی طرح خاص 175
احتیاط کے ساتھ کاشت کرنے کی ضرورت نہیں اور کھاد تو شاذ ہی دینا پڑتا ہے۔ ان کے زیر کاشت بہت بڑا رقبہ ہے۔ جوار کل ہندوستان میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۱۰ر۳۴ ملین ایکڑ پر کاشت کی جاتی تھی اور باجرا ۰۷ر۱۸ ملین ایکڑ پر۔ جوار پیدا کرنے والے اہم علاقے یہ ہیں :- حیدرآباد دکن ۳۶ر۹ ملین ایکڑ، بمبئی ۲۱ر۸ ملین، مدراس ۵۳ر۴ ملین ایکڑ، صوبۂ متوسط و برار ۳۱ر۴ ملین ایکڑ، اور صوبۂ متحدہ ۳۸ر۲۔ علی ہذا باجرے کی کاشت بھی بہت وسیع رقبے پر ہوتی ہے۔ مثلاً بمبئی ۱۱ر۵ ملین ایکڑ، مدراس ۸۳ر۲ ملین ایکڑ، پنجاب ۴۰ر۳ ملین ایکڑ، اور صوبۂ متحدہ ۱۸ر۲ ملین ایکڑ۔ باجرا فصل خریف میں پیدا ہوتا ہے، اس کے برعکس جوار خریف اور ربیع دونوں فصلوں میں کاشت ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں اجناس میں سے کسی کی بھی برآمد قابل لحاظ مقدار میں نہیں ہوتی۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں جوار اور باجرا ۰۰ر۵ ٹن قیمتی ۱۳ر۲۵ لاکھ روپے ہندوستان سے برآمد ہوا جس کے مقابلے میں ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۰۰ر۴ ٹن تھی اور قیمت صرف ۱۴ر۴ لاکھ روپئے وصول ہوئی۔

باب ۶

(۵) دالیں۔ ان کی کاشت ہندوستان کے طول و عرض میں بہت وسیع رقبے پر ہوتی ہے اور باشندوں کی غذا میں ان کا بہت نمایاں حصّہ ہے۔ دالیں زیادہ تر صوبۂ متحدہ، پنجاب، بمبئی، صوبۂ متوسط، بنگال وغیرہ میں کاشت کی جاتی ہیں۔ چنا، ہندوستان کی سب دالوں میں بلاشبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں کم از کم ۳۳ء۷ ملین ایکڑ رقبہ اس کے زیر کاشت تھا، اور صوبۂ متحدہ اس لحاظ سے اہم ترین علاقہ ہے کہ وہاں اس کا رقبہ ۵ء۳۰ ملین ایکڑ ہے۔ ملک کے اندر دالوں کی مانگ کثیر ہونے کی وجہ سے ان کی برآمد ایک حد تک محدود ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں دالوں کی برآمد کی مقدار ...۱۱۲ٹن تھی اور ان کی قیمت ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے وصول ہوئی۔

(۶) دوسری خوراکی فصلیں۔ ان میں پھل، ترکاریاں، مسالے، اور متفرق خوراکی پیداواریں شامل ہیں۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ان کی کاشت کا مجموعی رقبہ برطانوی ہند میں ۸۰ء۸ ملین ایکڑ تھا۔ میووں، ترکاریوں، ساگ پات اور جڑیلو پودوں کی کاشت ۵۸ء۴ ملین ایکڑ پر کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں انواع و اقسام کے میوے پیدا ہوتے ہیں مثلاً آم، سیب، سنگترہ، آلوچہ، شفتالو، خوبانی اور ناسپاتی۔ رسد کی قلت کے سبب سے یہ میوے بہت گراں ہیں چنانچہ یہ گرانی اور باشندوں کا عام افلاس میووں کے کاروبار کی قابل لحاظ ترقی میں مانع رہا۔ ہندوستان میں مختلف و متعدد اقسام کی ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً آلو، پیاز، بیگن، کرم کلا، پھول گوبی، شلغم، ٹماٹے وغیرہ۔ اگر آبپاشی کی مناسب سہولتیں خاصکر بڑے شہروں سے متصل علاقوں میں بہم پہنچائی جائیں تو میووں اور ترکاریوں کی کاشت کے رقبے میں قابل لحاظ توسیع عمل میں آسکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی زراعت کے محکمے میووں اور ترکاریوں کی وافر رسد کے دورِ جدید کے توقعات کو پورا کرنے کے اب تک قابل نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن پشاور کی وادی میں بہت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے، اور اب جبکہ چار دوسرے صوبوں کے زرعی محکموں میں ماہران باغبانی موجود ہیں ہم یہ توقع کرسکتے ہیں کہ میووں کی کاشت کی جانب زیادہ باقاعدہ توجہ مبذول کی جائے گی۔ تجارتی باغبانی کی پیداوار کے لیے بڑے مرکزی شہر بہت وسیع بازار مہیا کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں نقل و حمل کی مشکلات ان شہروں کی طلب سے فائدہ اٹھانا غیر ممکن

بنا دیتی ہیں۔ نقل و حمل کی سہولتوں کی ترقی، احتیاط کے ساتھ پھلوں کا توڑنا، سلیقے کے ساتھ باب ۶
جوڑ کر بھیجنا، میووں کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام جیسی اصلاحیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔[1]
سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں بگھار کی اشیا اور مسالوں کی کاشت ۱ء۷۴ ملین ایکڑ پر ہوئی۔ 176
مسالے زیادہ تر انتہائی جنوبی ہند میں پیدا ہوتے ہیں گو بعض انواع کی کاشت ہر جگہ ہوتی ہے۔ سیاہ مرچ ملیبار، ٹراونکور، جنوبی کنٹرا[2] کورگ اور کسی حد تک بنگال وغیرہ میں ہوتی ہے؛ مرچیں، زیادہ تر مدراس، مشرقی و شمالی بنگال اور برما و بمبئی کے بعض علاقوں میں؛ ادرک، ساحل ملیبار، اور بمبئی کے علاقوں یعنی تھانہ اور سورت میں، اور بنگال و صوبہ متحدہ کے بعض اضلاع میں؛ الائچی جنوبی و مغربی ہندوستان کے مرطوب جنگلوں میں، مدراس، ٹراونکور، میسور، کورگ اور بمبئی خاصکر کنٹرا میں؛ سپاری جنوبی ہند اور برما میں؛ دارچینی جنوبی ہند میں مغربی گھاٹ میں؛ لونگ، زیادہ تر مدراس پریزیڈنسی میں مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں کے دامن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی ہندوستان کے اہم مسالے ہیں۔ اِن میں کسی حد تک تجارت برآمد بھی ہوتی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں ان کی مقدار ۲۸۶۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ اور قیمت ۳۴ء۷۷ لاکھ روپے تھی۔

(۷) شکر۔ ہندوستان نیشکر کی کاشت کا غالباً سب سے قدیم ملک ہے اور نیشکر کی کاشت کا رقبہ یہاں سب سے بڑا ہے۔ لیکن فی ایکڑ اوسط پیداوار اس قدر کم ہے اور زیادہ تر نباتات پر گزر کرنے والی آبادی کی مانگ اس قدر کثیر ہے کہ ملک کا انحصار کچھ سال ادھر تک بڑی حد تک ارزاں بیرونی شکر پر تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ میں ہندوستان نے ہر قسم کی شکر ۱۲،۰۰،۰۰۰ ٹن درآمد کی جس کی قیمت ۱۵،۷۷ کروڑ روپے تھی۔ ہندوستانی شکر کمیٹی کے قول کے مطابق ہندوستان کی حقیقی شکر کی پیداوار فی ایکڑ، کیوبا کی پیداوار کا ایک ثلث، جاوا کا $\frac{1}{6}$ اور ہوائی کا $\frac{1}{2}$ ہے۔ آسٹریا اور جرمنی کی چقندر کی شکر کو ان ممالک کی حکومتیں مالی امداد دیتی تھیں جس کی وجہ سے یہ شکر بہ کفایت ہندوستان کو برآمد کی جاتی تھی لیکن

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تنقید بر زرعی کاروبار ہندوستان سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸" صفحہ ۴!
[2] ایضاً برائے سنہ ۱۹۲۸ تا سنہ ۱۹۲۹ صفحہ ۶۵ تا صفحہ ۶۷ اور زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۵۱۵ تا ۵۱۹۔

باب

ہندوستان میں ۱۹۰۲ء سے اس پر محصول درآمد عائد کیا جانے لگا، چنانچہ اس محصول کی بدولت اس شکر کی جگہ بتدریج جاوا اور موریشس کی نیشکر کی شکر نے لے لی۔ اس غیر ملکی مسابقت نے ہندوستانی نیشکر پر کاری ضرب لگائی، اور بڑی جنگ سے پیشتر کے سالوں میں زیر کاشت رقبے میں کچھ کمی ہو گئی۔ لیکن یہ کمی زمانۂ جنگ کی گرانی کے محرک کے تحت ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں کسی حد تک رفع ہو گئی۔ نیشکر کی کاشت کا رقبہ مسلسل کئی سالوں سے ایک حالت پر قائم ہے اور گزشتہ بیس سال میں اوسط (۲۸،۴۰،۰۰۰) ایکڑ رہا۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں نیشکر کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۲ء۷۸ ملین ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں نیشکر پیدا کرنے والے اہم صوبے صوبہ متحدہ (۱ء۷۱ ملین ایکڑ)، پنجاب (۰ء۴۷ ایکڑ)، بہار و اڑیسہ (۰ء۴۲ ملین ایکڑ)، مدراس (۰ء۱۲ ملین ایکڑ)، بمبئی (۰ء۰۷ ملین ایکڑ) 177
اور آسام (۰ء۳۵ ملین ایکڑ) تھے۔ اس طرح شمالی ہند کو اس کی کاشت میں نمایاں دلچسپی ہے۔ گو جنوبی ہند کا رقبہ چھوٹا ہے پھر بھی یہاں جو نیشکر اگتی ہے وہ شمالی ہند کے مقابلے میں بہت موٹی اور شیریں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر سفید شکر تیار نہیں کی جاتی۔ رس کو راب نکالے بغیر اس قدر جوش دیا جاتا ہے کہ وہ جم جاتا ہے، اور اس پیداوار کو جسے گڑ کہتے ہیں اسی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آجکل نیشکر کو قدیم طریقے کے بجائے زیادہ تر جدید اصول پر مشینوں کے ذریعے سے دبایا جاتا ہے۔ سفید شکر کئی فیکٹریوں میں خاصکر صوبۂ متحدہ اور بہار اور اڑیسہ میں تیار کی جاتی ہے۔ بمبئی میں بھی حال حال میں اسی قسم کا کاروبار شروع ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء سے پیشتر نیشکر کے ۳۱ کارخانے تھے۔ شکر کا مقام ہے کہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء میں تاہین کی منظوری کے بعد ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۲۶ نئے کارخانوں کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کے سال میں ۶۵ کارخانے کھولے گئے جس کی وجہ سے نیشکر کے کارخانوں کی مجموعی تعداد ۱۲۲ ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کی بابتہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان کارخانوں کے منجملہ ۱۱۲ کارخانوں میں کام ہوتا رہا۔ ان کارخانوں کے علاوہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۱۱ گڑ سازی کے کارخانے بھی تھے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ترقی کی رفتار قدرے سست ہو گئی، چنانچہ ۱۹ نیشکر کے کارخانے اور ۲ گڑ سازی کے کارخانے تعمیر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء میں نیشکر اور گڑ سے

۹۹،۰۸۸ ٹن شکر تیار کی گئی۔ یہ مقدار بڑھ کر سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ۱۵۱،۶۵۰ ٹن سنہ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۳۷۰،۲۸۳ ٹن اور سنہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۶۲۰،۰۰۰ ٹن (عارضی اندازہ) ہوگئی۔ سنہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں تیار شدہ شکر کی مقدار، قند سازی[1] کے کارخانوں کی پیداوار کو ملا کر ۶۷۹،۰۰۰ ٹن تھی۔ زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کے ماہر شکر سازی نے اندازہ لگایا ہے کہ سنہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء پر ختم ہونے والے تین سالوں میں شکر کے اوسط کی مقدار گڑ کو الگ کر کے ۹۲۱،۰۰۰ ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۲۳،۰۰۰ ٹن شکر درآمد ہوئی جس کی قیمت ۴ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے ادا کی گئی۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے سالوں کے مقابلے میں درآمد میں بہت بڑی حد تک کمی ہوگئی ہے۔

لیکن ہندوستان میں صاف شکر بنانے کا کاروبار حال حال تک ترقی یافتہ حالت میں نہیں تھا جس کا باعث کئی مشکلات تھیں مثلاً (۱) غیر ملکی شکر کی مسابقت، نیشکر کی فی ایکڑ کم پیداوار، رس نکالنے کے جدید ترین طریقوں کی غیر موجودگی، راب کا کم مقدار میں نکلنا، فیکٹری کے متصل کافی بڑی مقدار میں نیشکر حاصل کرنے کی دقت اور کاروبار چلانے کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت۔ باوجود اس امر کے کہ ہندوستان میں تامینی محصول وقتاً فوقتاً بڑھا کر عائد کیا جاتا رہا، زمانۂ بعد از جنگ میں شکر کی قیمت کم رہی اور اس نے بھی صنعت کی مشکلات کو بڑھا دیا۔ قیمت کی کمی کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ موثر طلب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور اس کے مقابلے میں
جنگ عظیم کے حالات کی وجہ سے پیداوار بہت کثیر مقدار میں تیار ہوئی۔ چنانچہ 178
ان ہی حالات نے کیوبا اور جزائر غرب الہند کے دوسرے علاقوں میں نیشکر کی عمیق کاشت کے حق میں محرک کا کام کیا تھا۔ علاوہ ازیں شکر کی قیمت میں اور بھی زیادہ کمی اس وجہ سے ہوگئی کہ دوسرے کئی ملکوں میں تامینی محصول عائد کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ہندوستان میں شکر کی قیمت غیر نفع بخش سطح تک گھٹ گئی جس کا باعث یہ تھا کہ ہندوستانی بازار میں جاوا کی شکر کی بھرمار ہو رہی تھی اور جاوا سے چین کی بجائے ہندوستان کو شکر بھیجے جانے کی وجہ یہ تھی کہ چین اور جاوا کے

[1] قند سازی کے کارخانوں میں سفید شکر تیار کرنے کے لیے دیسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس کو "بیل" کا طریقہ کہتے ہیں۔

باب ۶

معمولی باہمی تجارتی تعلقات میں چاندی کی قیمتوں کی کساد بازاری کی وجہ سے خلل پڑ گیا تھا۔ اس طرح ہندوستانی کاشتکار پر بہت مضر اثر پڑا۔ بڑی جنگ کے بعد سے یورپ کی چقندر کی شکر کی صنعت کو بھی کثیر مالی امداد اور تامینی محصول کی بھاری شرح کے محرک کے تحت پورے جوش و خروش کے ساتھ زندہ کیا جا رہا ہے اور یورپ دنیا کے بازاروں میں اپنی پیداوار کی بھرمار کر رہا ہے۔

حکومت نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء سے نیشکر کی خوبی اور رسد کی اصلاح و ترقی کے خیال سے مسئلے کی باقاعدہ تحقیق کی جا رہی ہے۔ چنانچہ حال میں مدراس کے ضلع کوئمبتور میں جدید اصول پر ترقی یافتہ نیشکر کا ایک مزرعہ قائم کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں حکومت ہند نے ایک "شکر کمیٹی" قائم کی تاکہ ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کی تنظیم و ترقی کے امکان کی تحقیق کی جائے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ شایع کی جس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ جاوا کے نمونے پر شکر سازی کی صنعت کی تنظیم مناسب ترمیم کے ساتھ کی جائے اور اس غرض کے لیے ایک "شکر بورڈ" قائم کیا جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ ایک مرکزی ادارہ بنام شاہی ادارہ تحقیق (Imperial Research Institute) قائم کیا جائے جس کی تین شاخیں ہوں یعنی (۱) زرعی (۲) کیمیائی (۳) انجینیری؛ اور جو مختلف صوبوں کے تحقیقاتی مرکزوں کے کام کی نگرانی کرے۔ شکر بورڈ، ادارہ تحقیق کی نگرانی کرے اور شکر سازی کی صنعت کے بارے میں جملہ معاملات میں حکومت کو مشورہ دے۔ علاوہ ازیں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ شکر سازی کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جائے جو ادارہ تحقیق کا جزو لاینفک ہو اور طلبہ کو کھیتوں اور کارخانوں میں تربیت دے اور کام سکھائے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں حکومت ہند نے نو ماموری زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کی سفارشوں کی بنا پر[1] شکر سازی کی صنعت کو تامین دینے کے مسئلے کو ٹیرف بورڈ کے پاس غور و خوض کے لیے بھیجا اور ایسا کرنے کا دہرا مقصد تھا۔ (۱) ایک تو یہ کہ ہندوستان کو غیر محدود غیر ملکی مسابقت سے محفوظ رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ

[1] دیکھو باب ۱۱۔

ملکی صنعت شکر سازی کو فروغ دیا جائے۔ کونسل نے اپنی "شکر کمیٹی" کے مشورے کے
مطابق عمل کیا جو محض ہندوستان کی شکر سازی کی صنعت کی امداد کی غرض سے تدابیر باب ۶
اور مشورے پیش کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ٹیرف بورڈ نے اپنی رپورٹ شایع شدہ
مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میں سفارش کی کہ اس صنعت کو تامین دی جائے اور اس بات پر
اپنا اطمینان ظاہر کیا کہ اس بارے میں ہندوستانی مالی کمیشن کے مقرر کیے ہوئے
شرایط شکر سازی کی صنعت کی حد تک پورے کیے گئے تھے۔ ٹیرف بورڈ نے یہ
خیال بھی ظاہر کیا کہ قومی مفاد کے مدِ نظر نیشکر کی کاشت کے رقبے کو کم نہ ہونے
دینا چاہیے اور سفید شکر بنانے کی صنعت کی توسیع کی ہمت افزائی کر کے نیشکر کی
کاشت کی ترقی کا ایک اور راستہ نکالنا چاہیے۔ بورڈ نے یہ خوف ظاہر کیا کہ اگر
اس صنعت کی ترقی کی تدابیر اختیار نہیں کی گئیں تو گڑ کی تباہ کن کساد بازاری شروع
ہو جائے گی جس سے زرعی طبقہ بہت بُری طرح متاثر ہوگا۔[1] بورڈ نے انتظامی وجوہ 179
سے مالی امداد کو ناپسند کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ سات روپے چار آنے
فی ہنڈرڈ ویٹ کا تامینی محصول ابتدائی سات سال کے لیے اور چھے روپے چار آنے
فی ہنڈرڈ ویٹ کا محصول اس کے بعد کے آٹھ سال کے لیے عائد کیا جائے اور اس
طرح اس صنعت کو پندرہ سال تک تامین دینے کا یقین دلایا۔ محصول میں ایک روپیہ
چار آنے فی ہنڈرڈ ویٹ کا یہ فوری اضافہ سنہ ۱۹۳۱ء تا سنہ ۱۹۳۲ء کے موازنے میں زائد
آمدنی وصول کرنے کی عارضی تدبیر کے طور پر شریک کر لیا گیا، اور ٹیرف بورڈ کی
سفارش تک اس کا استقلال عمل میں نہیں آیا۔ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء[2] میں یہ محصول مستقل
طور پر نافذ ہوا جبکہ مرکزی مجلس قانون ساز نے قانون تامین صنعت شکر سازی
بابتہ سنہ ۱۹۳۲ء[3] منظور کیا۔ سات روپے چار آنے کا تامینی محصول ابتدائی سات سال یعنی
۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۳۸ء تک نافذ رہے گا، لیکن اس قانون کے جاری رہنے کے زمانے میں

---

[1] دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ شکر سازی کی صنعت کے بارے میں باب (۲) خاص کر فقرہ ۴۴، ۴۵ و ۴۶ تا ۴۶۔
[2] دیکھو باب متعلقہ بحث "مالیات و تحصیل (ٹیکس)" جلد دوم۔
[3] (Suger Industry Protection Act)

باب ۶

اگر ضرورت ہو تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے صنعت کے حق میں بہت بڑے محرک کا کام کیا ہے اور اس کی بدولت صنعت میں تیزی سے ترقی و توسیع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ ہندوستان چند سال کے اندر اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی شکر کی ضرورت کو بتمام و کمال پورا کرے۔ لیکن مرکزی حکومت کی آمدنی میں دوسرے عاملین کے منجملہ شکر کی کم مقدار درآمد ہونے کی وجہ سے جو کمی ہو گئی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے بدقسمتی سے اپریل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کارخانوں کی بنی ہوئی شکر پر محصول چنگی عائد کرنا پڑا[1]۔ اسی کے ساتھ مرکزی مجلس قانون ساز میں "قانون نیشکر" منظور ہوا جس کی بنا پر صوبائی حکومتیں اس قابل ہوئیں کہ کارخانے کی جانب سے کسان کو ادا کی جانے والی اقل قیمت مقرر کرنے کی تجاویز کو عملی جامہ پہنائیں۔ حکومت ہند نے بھی یہ وعدہ کیا کہ ایک آنہ فی ہنڈرڈ ویٹ کی معاول رقم یعنی ۷ لاکھ روپے الگ رکھے جائیں گے اور اس فنڈ کو سفید شکر بنانے والے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا تاکہ نیشکر اُگانے والوں میں امداد باہمی کی انجمنیں بنائی اور چلائی جائیں جن سے اس طبقے کو واجبی قیمتیں وصول کرنے میں اور اسی مقصد کے تحت دوسرے کاموں میں مدد ملے[2]۔

ٹیرف بورڈ نے تاہم سے متعلق اپنی تجویز کی کامیابی کے لیے یہ ضروری خیال کیا کہ اس صنعت کے زرعی اور سائنسی پہلو بہت نمایاں رکھے جائیں۔ چنانچہ اس نے یہ سفارش کی کہ زرعی تحقیق کی شاہی کونسل کو نیشکر کی کاشت کی تحقیق کی غرض سے دس لاکھ روپے سالانہ کی منظوری دی جائے۔ حکومت کی جانب سے قرضہ دیئے جانے کی حد تک بورڈ کو کوئی اعتراض نہیں ہے، بشرطیکہ ایسی شکل میں امداد دینا

180 کسی خاص صورت میں مناسب معلوم ہو، اور اس تحفظ کے تابع ہو کہ اس قسم کی کوئی

---

[1] قانون (محصول چنگی) شکر بابتہ ۱۹۳۴ء یکم اپریل ۱۹۳۴ء سے حسب ذیل شرح سے نافذ کیا گیا:-

(۱) قند سازی کے کارخانوں کی شکر پر ۱۰ آنے ہنڈرڈ ویٹ اور (۲) پالمائی راشکر کے علاوہ دوسری شکر پر ایک روپیہ ۵ آنے فی ہنڈرڈ ویٹ۔ نیز دیکھو جلد دوم باب "مالیات" جس سے محصول چنگی کی مزید تفصیلات اور اس پر کی ہوئی تنقیدات کا حال معلوم ہوگا۔

[2] دیکھو رکن مالیہ کی موازنہ (۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء) کی تقریر۔

باب ٦ امداد یا مالی اعانت یا کوئی دوسری سہولت شکر سازی کے کسی ایسے کارخانے کو بہم نہ پہنچائی جائے گی جس کی مجلس نظما میں ہندوستانی اغراض کی مناسب نمایندگی نہ ہو اور جو ہندوستان کے شغل اہل کرنے والوں کو نئی کمپنیوں کے سرمایے کے حصے خریدنے کے مواقع بہم نہ پہنچائے[1]۔ یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ خام گڑ ہندوستان میں بکثرت اور بڑے پیمانے پر تیار اور صرف کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں اس کی مقدار ۵،۸۵۰۰۰ ملین ٹن تھی۔ اسی وجہ سے اس بات کی ضرورت ہے کہ دیسی گڑ کی صنعت کے ساتھ ساتھ ارزاں سفید شکر کی تیاری کی جانب بھی توجہ مبذول کی جائے۔ محکمہ جات زراعت اور خاصکر کومبٹور کا نیشکر کا شاہی مزرعہ عمدہ قسم کی نیشکر کی کاشت کا تجربہ کرکے اس کی پیداوار کو بڑھانے کی جانب اپنے مساعی کو مرتکز کر رہا ہے۔ نیشکر کی ترقی یافتہ قسموں کی کاشت کا رقبہ تمام صوبوں میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں (۱،۸۴۵،۷۸۸) ایکڑ تھا جس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں بڑھ کر (۲،۱۳۹،۱۱۶) ایکڑ ہوگیا۔ اس کو دراصل عمدہ قسموں کی کاشت ہی کا نتیجہ کہنا چاہیے کہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں نیشکر کی کاشت کا رقبہ ۳،۴۷ ملین ایکڑ ہوگیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۷ فیصد اضافہ ہوا؛ اور پیداوار میں جو ۵،۰۴ ملین ٹن بتلائی جاتی ہے ۴۵ فیصد اضافہ ہوا[2]۔ اس قسم کے کام کے متعلق یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسئلے کے دونوں پہلوؤں کے لیے مشترک ہے۔ یہ لکھنے کی بمشکل ضرورت ہے کہ خام شکر کی برآمد بہت کم مقدار میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں دو ہزار ٹن بہ قیمت ۲،۴۳ لاکھ روپے برآمد ہوئی اور سیلون، اسٹریٹ سٹل منٹ اور فی جی کو وہاں کی ہندوستانی آبادی کے لیے روانہ کی گئی۔

(ب) غیر غذائی اشیا۔

(۱) قہوہ۔ ہندوستان میں کافی کے کاروبار کا آغاز کب ہوا اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان سے اس کا تعارف سولھویں صدی میں ایک شخص بابا بڈن نے کہ کے حج سے واپس ہو کر کرایا۔ پھر بھی کافی کی باقاعدہ

---

[1]۔ دیکھو ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (صنعت شکر سازی) شایع شدہ ۱۹۳۱ء پیراگراف (۱۰۵)۔

[2]۔ دیکھو انڈین ایربک شایع شدہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۸۸۔

باب ۶

کاشت کا آغاز صرف ۱۸۳۰ء سے ہوا چنانچہ میسور، کورگ، اور نیلگیری پہاڑی کے ایک بڑے رقبے پر کافی کی کاشت ہونے لگی۔ ۱۸۶۲ء میں اس کا کاروبار معراج ترقی پر پہنچ گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے ٹڈیوں کی تباہ کاری کے باعث زوال شروع ہوا۔ بعد میں چل کر یورپ کے بازاروں میں برازیل کی ارزاں کافی کی درآمد کی وجہ سے بھی ہندوستانی کافی کی کاشت پر مضر اثر پڑا، اور پیداوار کی مقدار بہت کم ہو گئی۔ کافی کی کاشت کے بعض رقبوں میں، کافی کی جگہ چائے نے لے لی ہے۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں کل ہندوستان میں کافی کے زیر کاشت رقبہ ۱،۷۶،۷۰۰ ایکڑ تھا جس میں بڑے علاقے حسب ذیل تھے۔ ریاست میسور ۹۵،۳۰۰ ایکڑ، مدراس ۴۰،۱۰۰ ایکڑ، کورگ ۳۸،۶۰۰ ایکڑ، ٹراونکور ۸۰۰ ایکڑ اور کسی حد تک برما اور بمبئی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۱،۴۱،۰۰۰ ہنڈرڈویٹ کافی جس کی 181
قیمت ۳۷ لاکھ روپے تھی برطانوی ہند سے برآمد کی گئی جس کے مقابلے میں ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپے قیمت کی ۲،۹۳،۰۰۰ ہنڈرڈویٹ کافی برآمد کی گئی۔ ہندوستانی کافی کے اہم بازار حسب معمول سلطنت متحدہ اور فرانس ہی رہے۔ مرکزی مجلس قانون ساز نے ہندوستانی کافی کے کاروبار کو اس کی موجودہ مشکلات میں سہارا دینے کی غرض سے ستمبر ۱۹۳۵ء میں "قانون ابواب کافی" منظور کیا۔ ان ابواب سے ۸ آنے فی ہنڈرڈویٹ کے حساب سے حاصل ہونے والے فنڈ کا انتظام "ہندوستانی کافی کی ابواب کمیٹی" کے سپرد کیا گیا، اور اس فنڈ کو نہ صرف پروپگنڈا کے لیے بلکہ فروخت کے انتظام کی اصلاح و ترقی زرعی و فنی تحقیق اور کاروباری ترقی کے دوسرے اغراض کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

(۲) چائے۔ ہندوستان، غالباً چین کے واحد استثناء کے ساتھ، دنیا کا سب سے بڑا چائے پیدا کرنے والا ملک ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصے میں چین کی چائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت برآمد کا اہم اور نفع بخش شعبہ تھی۔ اس صدی کے آخر میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہندوستان میں اس رسد کے متبادل ذریعے کو ترقی دی جائے۔ لیکن لارڈ ولیم بنٹنک کی خواہش پر صرف ۱۸۳۴ء میں اس معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ آسام میں سرکاری مزرعے قائم کیے گئے جہاں چینی تخم بویا جاتا تھا، اس لیے کہ آسام میں دیسی پودے کی موجودگی کا اس وقت تک علم نہ ہوا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں یہ قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ لندن کے بازار میں ہندوستانی چائے

چینی چائے کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ جب اِس کاروبار کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی تو حکومت باب ۶
نے اس سے اپنا تعلق ۱۸۶۵ء میں منقطع کر لیا اور اس کے بعد سے اس کی تنظیم و
اعلیٰ نگرانی یورپ کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ چائے کے اندرونی صرف
اور بیرونی برآمد کی روز افزوں ترقی کی بدولت اس کا کاروبار زمانہ دراز سے
ترقی یافتہ حالت میں ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ۸۱۶٬۰۰۰ ایکڑ زمین چائے کے زیر کاشت تھی
جس کے منجملہ آسام کا حصہ ۴۳۰٬۳۰۰ ایکڑ، بنگال کا ۱۹۹٬۸۰۰ ایکڑ، مدراس کا ۷۵٬۰۰۰
ایکڑ، پنجاب (کانگڑا) کا ۹٬۶۰۰ ایکڑ، صوبہ متحدہ کا ۶٬۲۰۰ ایکڑ اور ٹراونکور کا ۷۶٬۳۰۰
ایکڑ تھا، اور مجموعی پیداوار ۴۸۲٬۲۶ ملین پاؤنڈ تھی۔ ہر باغ، خواہ وہ کتنی ہی حیثیت
رکھتا ہو، اپنے کارخانے رکھتا ہے جہاں بازار کے لیے چائے تیار کی جاتی ہے، اس
لیے کہ یہ بہت ضروری ہے کہ پتا توڑ لینے کے فوراً ہی بعد مختلف تدریجی عمل انجام
دیے جائیں۔ جو فیکٹریاں منظم اور اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہی ہیں وہاں اعلیٰ درجے کی
مخصوص کلیں موجود ہیں اور ماہر چائے سازوں کی نگرانی میں کام ہو رہا ہے۔ چائے
کی تجارت برآمد خاصکر سلطنت متحدہ سے بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، چنانچہ
۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی برآمد کا ۸۵ فیصد حصہ صرف سلطنت متحدہ گیا۔
۱۹۲۹ تا ۱۹۳۰ء میں ۳۶۳٬۷۶ ملین پاؤنڈ چائے ۲۶ کروڑ روپے قیمت کی برآمد
کی گئی۔ لیکن ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار ۳۲۴٬۸۵ ملین پاؤنڈ تک گھٹ
گئی جس کی قیمت صرف ۲۰٬۱۳ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ اس کمی کا باعث یہ
تھا کہ صارفوں کی قوتِ خرید گھٹ گئی تھی اور تجارت خارجہ پر بندشیں عائد 182
کی گئی تھیں۔ لیکن مئی ۱۹۳۳ء میں چائے کی برآمد کی تنظیم کے بارے میں بین الاقوامی
تجویز اختیار کر لیے جانے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی چائے کے کاروبار میں ویسی
کساد بازاری رونما نہیں ہوئی جیسی کہ اکثر دوسری صنعتوں میں ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء
میں برآمد میں ہندوستان کا حصہ رسدی ۳۳۰ ملین پاؤنڈ تھا۔ اس طرح چائے ایک
اہم ضرورت کی شے ہے جو برآمد کی جاتی ہے۔ شکر ہے کہ ہندوستانی چائے کی انجمن[1] کی

[1] Indian Tea Association.

مساعی کی بدولت ہندوستان میں بھی چائے کا صرف تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ باب ۶
سنہ ۱۹۰۳ء سے ہندوستان سے برآمد کی ہوئی ہندوستانی چائے پر ایک چھوٹا سا محصول عائد کیا جا رہا ہے اور اس محصول کی مجموعی رقم چائے کا کاروبار کرنے والوں کی درخواست پر ہندوستانی چائے کی انجمن کو دیدی جا رہی ہے۔ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء میں محصول کی شرح ۸ آنے فی صد پاؤنڈ سے بڑھا کر ۱۲ آنے فیصد پاؤنڈ کر دی گئی۔ انجمن مذکور اس رقم کا ایک جزو غیر ملکی بازاروں خاصکر ریاستہائے متحدہ امریکا میں ہندوستانی چائے کی فروخت کو فروغ دینے کے کام میں لاتی ہے۔

(۳) روغن دار تخم۔ ہندوستان میں انواع و اقسام کے روغن دار تخم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً السی، تل، سرسوں، رائی، مونگ پھلی، ناریل، ارنڈی، بنولہ، موٹھ رام تِل، دھنیا، زیرہ، اجوائن اور کاردی۱؎۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں برطانوی ہند میں اِن سب کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۱۷،۷۹ ملین ایکڑ تھا۔ ہر سال ان کی کثیر مقدار برآمد ہوتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان سے برآمد کی ہوئی ہمہ اقسام کی اشیا میں روغن دار تخموں کا نمبر پانچواں تھا۔ زمانۂ قبل از جنگ کی برآمد کے اوسط (یعنی مقدار ۱،۴۵۴،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۲۴،۳۷ کروڑ روپے) کے مقابلے میں مختلف قسموں کے روغن دار تخموں کی برآمد میں نمایاں کمی ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۳ء میں مقدار ۷۳۳،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۱،۳۱ کروڑ روپے تھی، سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں مقدار ۱،۱۲۴،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۳،۶۶ کروڑ روپے تھی اور سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں مقدار ۸۷۵،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۰،۵۴ کروڑ روپے رہی۔ یوروپین ممالک خاصکر جرمنی، فرانس اور اٹلی میں درآمد پر جو بندشیں یا نگرانی قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی روغن دار تخموں کی طلب بہت گھٹ گئی۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں جو اصلاح و ترقی ہوئی اس کا باعث یہ تھا کہ ہندوستانی السی کثیر مقدار میں برآمد ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ارجن ٹائن میں اس کی پیداوار کی مقدار کم تھی اور میثاق اوٹاوا کی بنا پر ہندوستان کو سلطنت متحدہ کے بازار میں ۱۰ فیصد محصول کی ترجیح حاصل ہو گئی تھی۔

۱؎ Kardi

لیکن ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ارجن ٹائن میں فصلوں کی پیداوار بہت اچھی رہی اور باب ٦
سلطنت متحدہ سے بھی مانگ چھوٹے پیمانے پر ہوئی۔ سلطنت متحدہ کو ہندوستانی السی کی برآمد ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء میں ۲۴،۰۰۰ ٹن ہوئی تھی، یہ مقدار ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۷۶،۰۰۰ ٹن تک بڑھ گئی، لیکن ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں اس میں ۲۳،۰۰۰ ٹن تک کمی ہوگئی۔ روغن دار تخموں کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں برآمد کی ہوئی مقدار کا تناسب مختلف تخموں کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً السی زیادہ تر برآمد کے لیے بوئی جاتی ہے۔ لیکن رائی اور سرسوں اور تل کی برآمد کا اوسط زمانۂ قبل از جنگ میں ۴۳ فیصد اور ۲۵ فیصد تھا، ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں یہ اوسط گھٹ کر علی الترتیب ۱۴ فیصد اور ۱ فیصد ہوگیا۔ مونگ پھلی کی برآمد کا پنجسالہ اوسط زمانۂ قبل از جنگ میں مجموعی پیداوار کے مقابلے میں ۳۵ فیصد تھا، جنگ کے زمانے میں یہ گھٹ کر ۱۲ فیصد ہوگیا اور ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں یہ دوبارہ بڑھ کر ۲۷ فیصد ہوگیا۔ چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی برآمد کی مقدار ۳۱۲،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۳ر۵۲ کروڑ روپے تھی جس میں نمایاں طور پر قطعی اضافہ ہوا اور 183
مقدار ۱۷۴،۰۰۰ ٹن اور قیمت ۱۶ر۳۹ کروڑ رہی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں برآمد کی مقدار گھٹ کر ۲۱۱،۵۰۰ ٹن ہوگئی جس کی قیمت ۵ر۹۲ کروڑ روپے وصول ہوئی، گویا یہ مقدار اس سال کی مجموعی پیداوار کا ۲۷ فیصد تھی۔ اس طرح روغن دار تخموں میں آجکل سب سے اول نمبر مونگ پھلی کا ہے۔

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان اپنے روغن دار تخموں کے ذرایع سے ابھی تک بہترین طریقے پر فائدہ حاصل نہیں کرتا، اگرچہ تخموں کو پیل کر تیل نکالنے کی مقامی صنعت کو ترقی دینے کی کوششیں کی گئی ہیں[1]۔ مغرب میں آجکل نباتی تیل سے مختلف کام لیے جاتے ہیں۔ مثلاً امریکا میں بنولہ کو کوٹ کر تیل نکالا جاتا ہے، تیل کو کھانے کے اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کھلی کو کھادیا جانوروں کی غذا کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں بنولہ کی بہت بڑی مقدار برآمد کی جاتی ہے۔ روغن دار تخموں کی تجارت برآمد زیادہ تر براعظم کے

لہ دیکھو باب متعلقہ "ہندوستانی صنائع"۔

باب ۶ ملکوں سے ہوتی ہے، اور بڑی جنگ کی پیدا کردہ قوتوں سے اس پر بڑی حد تک اثر پڑا ہے۔ یورپ کی مانگ کی کمی سے قطع نظر کرتے ہوئے بڑی جنگ نے روغن دار تخموں کی تجارت کے حالات میں تغیر پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے صاف کرنے کے عملوں کی ترقی کے حق میں محرک کا کام کر کے ایک تیل کے بجائے دوسرا تیل استعمال ہونے کے مواقع بہت زیادہ بڑھا دیئے ہیں۔ مثلاً قابل خور و لوش تیلوں میں کھجور اور سرسوں کے تیل کا اسی طرح اضافہ ہوا۔ بڑی جنگ نے روغن دار تخموں کے دوسرے کئی ذرائع کو بھی ترقی دی جس کی وجہ سے زمانہ قبل از جنگ میں ہندوستان کی موافق صورت حال پر مضر اثر پڑا۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی السی کو ارجن ٹائن کی السی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس کا رقبہ گزشتہ بیس سال سے جنگ سے غیر متاثر رہ کر بتدریج بڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ہندوستانی السی کو ۱۹۳۲ء سے سلطنت متحدہ میں دس فیصد ترجیح حاصل ہے۔ ہندوستانی برآمد کرنے والوں کو تل میں چین سے اور مونگ پھلی میں مغربی افریقہ سے مسابقت کرنی پڑتی ہے۔ دوسری نباتی پیداوار بھی جو چین، جنوبی امریکا، اور مغربی افریقہ میں ہوتی ہے، تیل تیار کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ آخر میں یہ کہ سرسوں اور رائی کی جگہ مونگ پھلی نے لے لی ہے[1]۔

ہندوستان میں جو اہم روغن دار تخم پیدا ہوتے ہیں ان کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) السی۔ السی کی کاشت اس کے تخم حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے نہ کہ ریشے کے لیے۔ تخم کی بہت بڑی مقدار، تخم کا تیل، اور کھلی برآمد کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں السی کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۳ء۲۶ ملین ایکڑ تھا[2]۔ جس کے منجملہ صوبہ متوسط میں ۰ء۹۳، بمبئی میں ۰ء۱۲، بہار و اوڑیسہ میں ۰ء۶۳، صوبہ متحدہ میں ۰ء۱۸ اور بنگال میں ۰ء۱۲ ملین ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۲۷۹,۰۰۰ ٹن السی برآمد ہوئی

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا چودھواں ایڈیشن "تیل اور چربی" کا بیان اور گاڈگل کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۲۲۲ تا صفحہ ۲۲۴۔

[2] اس میں صوبہ متحدہ کی مخلوط پیداوار کا ۰ء۵۹ ملین ایکڑ رقبہ بھی شامل ہے۔

باب ۶
184

(چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی مقدار بھی اتنی ہی تھی) جس کی قیمت ۴ء۵ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ میں ۲۳۸۰۰۰ ٹن السی ۳ء۰۰ کروڑ روپے قیمت پر برآمد کی گئی۔

(ب) تل جسے جنجلی بھی کہتے ہیں، قریب قریب سب صوبوں اور خاصکر حسب ذیل علاقوں میں کاشت ہوتی ہے۔ برما (۱ء۵۷ ملین ایکڑ)، مدراس (۰ء۸۴ ملین ایکڑ)، صوبۂ متوسط (۰ء۵۵ ملین ایکڑ)، بمبئی (۰ء۲۰ ملین ایکڑ) ریاستہائے بمبئی (۰ء۴۶ ملین ایکڑ)، حیدرآباد دکن (۰ء۵۸ ملین ایکڑ)، صوبۂ متحدہ (۱ء۳۰ ملین ایکڑ)، پنجاب (۰ء۰۹ ملین ایکڑ)، اور بنگال (۰ء۱۶ ملین ایکڑ)۔ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں مجموعی رقبہ ۶ء۲۲ ملین ایکڑ تھا[1]۔ دنیا کی رسد کا ۵۰ فیصد سلطنت برطانیہ مہیا کرتی ہے اور ہندوستان کا حصہ اس میں بقدر نصف ہے۔ حالیہ سالوں میں برآمد بہت گر گئی ہے، چنانچہ زمانۂ قبل از جنگ کی اوسط برآمد ۱۱۹۰۰۰ ٹن اور قیمت ۲ء۴۸ کروڑ کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ میں اس کی مقدار صرف ۲۴۰۰۰ ٹن اور مالیت ۳۷½ لاکھ روپے تھی۔

(ج) سرسوں اور رائی۔ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں سرسوں اور رائی ملاکر ۶ء۰۷ ملین ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا جس میں صوبۂ متحدہ کی مخلوط کاشت کے ۲ء۵۹ ملین ایکڑ بھی شامل ہیں؛ اور اہم صوبے حسب ذیل ہیں:- صوبۂ متحدہ بشمولِ مخلوط کاشت ۲ء۸۱، بہار و اوڑیسہ ۰ء۶۰، بنگال ۰ء۶۹، پنجاب ۱ء۱۳، بمبئی ۰ء۱۹، آسام ۰ء۳۳ ملین ایکڑ۔ زمانۂ قبل از جنگ میں مجموعی پیداوار کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ برآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تناسب ۱۰ فیصد سے بھی کم ہوگیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں ۸ فیصد اور سنہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ میں ۴ فیصد تھا۔ موخرالذکر سال میں برآمد کی مقدار صرف ۳۶۹۰۰ ٹن اور قیمت ۲۴½ لاکھ رہی۔

(د) مونگ پھلی۔ یہ سب سے اہم روغن دار تخموں میں سے ایک ہے، اور حالیہ سالوں میں اس کی کاشت کے رقبے میں نمایاں توسیع ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ تا ۱۹۱۹ میں مجموعی زیر کاشت رقبہ ۱ء۴۰ ملین ایکڑ تھا، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ میں

[1] اس میں صوبۂ متحدہ کی مخلوط پیداوار کا ۰ء۰۶ ملین ایکڑ رقبہ بھی شامل ہے۔

وہ بڑھ کر ۸٫۰۶ ملین ایکڑ ہوگیا، اور اس کی تقسیم مختلف صوبوں میں حسب ذیل تھی :- مدراس باب ۶
۳٫۴۸ ملین، بمبئی ۱٫۲۶ ملین، برما ۰٫۶۱ ملین اور حیدرآباد ۱٫۳۸ ملین۔ بعض صوبوں میں اس فصل کی معاشی اہمیت بہت بڑھ رہی ہے اور وہ کپاس کی مدِ مقابل بن گئی ہے۔ گزشتہ صدی کے آخر میں دیسی اقسام میں نمایاں خرابی پیدا ہوجانے کی وجہ سے برآمد اور رقبے میں بہت کمی ہوگئی۔ لیکن سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد سے سینیگل اور موزمبیق سے مرض کی مدافعت کرنے والے غیر ملکی انواع کی درآمد اور کامیاب کاشت کی بدولت بحالی رونما ہوگئی ہے اور اس کے رقبے میں بتدریج توسیع ہو رہی ہے۔ لیکن موجودہ تجارتی کساد بازاری کے باعث کسی قدر کمی رونما ہوئی ہے۔ مجموعی پیداوار کا قریب قریب ۳/۴ حصہ ملک کے اندرونی صرف کے لیے رکھ لیا جاتا ہے اور بقیہ کو برآمد کیا جاتا ہے۔ برآمد کے اعداد اوپر پیش کیے جا چکے ہیں۔ اب تک فرانس ہی ہندوستانی مونگ پھلی کا سب سے بڑا بازار تھا، لیکن اس کو جتنی مقدار برآمد کی جاتی ہے اس میں بہت نمایاں کمی ہوگئی ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۱۸۰۰۰۰ ٹن اور اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۹۹٫۰۰۰ ٹن برآمد ہوئی۔ اس کا باعث حصہ رسدی کے طریقے پر عملدرآمد ہے جس کی رو سے فرانسیسی بازار میں ۵۰ فیصد حصہ فرانسیسی نوآبادیات کی پیداوار کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے۔ محکمۂ زراعت، مونگ پھلی کی پیداوار کو کم زرخیز زمینوں میں بڑھانے
185 میں بھی کامیاب ہوا ہے، چنانچہ یہ پایا گیا ہے کہ ان زمینوں پر وہ اچھی طرح اگتی ہے۔

(۴) ریشے۔ یہ بھی زرعی پیداوار کی ایک اہم قسم ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں برطانوی ہند کے کل زیر کاشت رقبے کے منجملہ ان کی کاشت ۶٫۵ فیصد زمین پر ہوئی؛ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء میں یہ تناسب صرف ۵٫۱ فیصد تھا۔

(۱) کپاس۔ کپاس ہندوستان کی سب سے اہم ریشے کی پیداوار ہے۔ ان کے اعداد و شمار سے حیرت انگیز ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ محض برطانوی ہند میں سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۶ء میں زیر کاشت رقبہ ۱۸٫۱۸ ملین ایکڑ اور سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۱۴٫۲۰ ملین ایکڑ تھا۔ اور اگر بڑی بڑی دیسی ریاستوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو رقبہ ۲۸٫۰۴ اور ۲۳٫۸۳ ملین ایکڑ علی الترتیب تھا۔ انہی دونوں سالوں میں پیداوار کی مقدار ۶٫۲۱ اور ۵٫۰۰ ملین گانٹھ علی الترتیب تھی جس میں سے ہر گانٹھ کا وزن ۴۰۰ پاؤنڈ تھا۔ کپاس کی تجارت

باب ۶

برآمد بہت کثیر مقدار میں ہوتی ہے چنانچہ ۶۰ فیصد سے زائد پیداوار باہر بھیجی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اشیائے برآمد میں کپاس کا نمبر اوّل ہے، اور تجارتی کساد بازاری سے بیشتر کے زمانے میں برآمد کی قیمت میں بہت نمایاں اضافہ ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۵ تا سنہ ۱۹۱۶ میں ۴۴٬۰۰۰ ٹن کپاس قیمتی ۲۴٫۹۷ کروڑ روپے برآمد کی گئی۔ سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۲۶ میں ۹۵ کروڑ روپے کی کپاس وزنی ۴۷٬۰۰۰ ٹن باہر بھیجی گئی اور یہی سب سے بڑی مقدار تھی جو برآمد ہوئی۔ اس کے بعد سے کئی اسباب کی بنا پر روئی کی برآمد کیا بلحاظ خوبی اور کیا بلحاظ قیمت کم ہوگئی ہے۔ یہ اسباب حسب ذیل تھے، مثلاً: تجارتی کساد بازاری، جاپان کا مالی بحران، ہندوستانی گرنیوں میں روئی کا زیادہ صرف، بعض کرگھوں کے لیے امریکی روئی کے مقابلے میں ہندوستانی روئی کی گرانی۔ زمانۂ بعد از جنگ میں سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳ کا ایک سال ایسا تھا جس میں کمترین مقدار یعنی ۳۶۸٬۰۰۰ ٹن روئی برآمد ہوئی جس کی قیمت ۲۰٫۳۷ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ سے کسی حد تک بحالی رونما ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ میں جاپان نے ہندوستان کے اس فیصلے کے خلاف کہ وہ سنہ ۱۹۰۴ کے تجارتی معاہدے کو منسوخ کرنا چاہتا تھا انتقامی کارروائی کے طور پر ہندوستانی روئی کا قریب قریب چھے ماہ تک مقاطعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی میں روئی کا بازار ایک زمانے تک تنزلزل کی حالت میں رہا۔ جب نیا ہندوستانی جاپانی تجارتی معاہدہ طے پایا تو جنوری سنہ ۱۹۳۴ میں جاپان نے مقاطعہ موقوف کیا۔ اس جدید معاہدے کے تحت ہندوستان میں درآمدہ جاپانی سوتی اشیا اور جاپان کی خریدی ہوئی ہندوستانی روئی کی مقداروں میں ربط و تعلق قائم کیا گیا۔ چنانچہ اگر جاپان، ہندوستان کو ۳۲۵ ملین گز جاپانی سوتی اشیا برآمد کرے تو جاپان کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس کے معاوضے میں ہندوستان سے خام روئی کے ایک ملین گانٹھ خریدے۔ سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں ہندوستانی روئی کی برآمد کی مقدار ۸۹۴٬۰۰۰ ٹن تھی اور قیمت ۲۶٫۵۹ کروڑ روپے وصول ہوئی، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ میں برآمد کی مقدار ۶۱۵٬۰۰۰ ٹن تھی اور قیمت ۳۴٫۰۵ کروڑ روپے وصول ہوئی۔

بعض علاقوں میں اشیائے خوردنی کی کاشت گھٹا کر روئی کے زیر کاشت رقبے کو ترقی دی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۵ تا سنہ ۱۹۰۰ کے چھے سالوں کا اوسط ۱۳٫۸۶ ملین ایکڑ تھا۔

باب ۶ اس کے برخلاف ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء میں کپاس کے زیر کاشت کل رقبہ صرف ۲۸،۴۰ ملین
186 ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں روئی کی کاشت کے رقبے کا اندازہ ۲۳،۹۲۵،۰۰۰ ایکڑ
کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کپاس پیدا کرنے والے اہم صوبے بمبئی (۶،۳ ملین ایکڑ) صوبۂ متوسط و برار (۴،۸ ملین ایکڑ)، حیدرآباد (۳،۷ ملین)، پنجاب (۳،۵ ملین)، ریاستہائے وسطی ہند (۱،۱ ملین)، اور مدراس (۲،۲ ملین) تھے۔ جہاں تک روئی کے زیر کاشت رقبے اور مجموعی پیداوار کا تعلق ہے وہاں تک، ہندوستان کا نمبر تمام دنیا میں دوسرا ہے یا ریاستہائے متحدۂ امریکا کو الگ کر کے سب سے اوّل ہے۔
امریکا اور مصر کی کپاس کے مقابلے میں ہندوستانی کپاس میں ریشہ زیادہ تر بہت کم اور چھوٹا ہوتا ہے اور روئی موٹی اور گاڑھی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ حال حال تک ویسے مہین تاروں کے کپڑوں کی تیاری کے لیے موزوں نہیں تھی جیسے کہ لنکاشائر کی گرنیوں میں تیار ہوتے ہیں۔ کچھ سال اِدھر سے ہندوستانی روئی کے سب سے بڑے گاہک جاپان اور براعظم یورپ اور سلطنت متحدہ ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی روئی کی مجموعی برآمد کا ۶۱،۱ فیصد حصہ جاپان نے لیا، قریب قریب ۲۲ فیصد حصہ براعظم یورپ کو گیا، اور ۹،۹ فیصد سلطنت متحدہ نے خریدا لیکن ہندوستان میں روئی کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے، یعنی جہاں ریاستہائے متحدۂ امریکا میں ۱۸۰ پاؤنڈ اور مصر میں ۳۰۰-۴۰۰ پاؤنڈ ریشہ نکلتا ہے وہاں ہندوستان میں ۷۵ اور ۱۰۰ پاؤنڈ کے مابین ریشہ نکلتا ہے۔ محکمۂ زراعت، جو ابتداءً دراصل لنکاشائر کی تحریک پر قائم ہوا تھا، چند سالوں سے روئی کی خوبی کی اصلاح و ترقی اور دیسی انواع کی پیداوار فی ایکڑ کو بڑھانے کی جانب اپنے مساعی مرتکز کر رہا ہے۔ محکمۂ مذکور نے غیر ملکی انواع خاصکر لانبے ریشے کی روئی کو یہاں رائج کرنے اور مخلوط قسم کی پیداوار حاصل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بدیسی انواع کی کاشت کے لیے حالات موافق نہیں ہیں، اور اسی لیے دیسی انواع کی اصلاح و ترقی کی جانب زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ مصر اور شمالی امریکا کی کپاس کی سندھ میں کاشت کی گئی ہے اور موخرالذکر کی کامیابی کی بہت کچھ توقع ہے۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ

باب ۶ سکر بند کی آبرسانی کی تجویز کے مکمل ہونے پر اس قسم کی کپاس کے زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوجائے گا۔ ایک اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے مدراس میں کیمبوڈیائی کپاس کی کاشت ہو رہی ہے۔ بمبئی پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں بھی امریکی کپاس بوئی جا رہی ہے۔ کچھ سال ادھر سے متوسط درجے کے ریشوں کی کپاس کی پیدائش میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوئی ہے اور مزید اصلاح و ترقی کے مواقع بہت شاندار ہیں، لیکن ایک خطرہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسان، اس کپاس کی قیمت کم وصول ہونے کی وجہ سے چھوٹے ریشے کی ہندوستانی کپاس کی کاشت کی جانب عود کر جائیں جس کی طلب مستقل ہے، گو کہ اس میں کسی بڑی توسیع کا امکان نہیں ہے۔ حال حال میں لنکاشائر میں جو تجربے کیے گئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہندوستانی کپاس کی بعض بہترین قسمیں مثلاً بہترین "پنجابی امریکی قسم"، "مدراسی کیمبوڈیائی" قسم اور "سورتی قسم" کو مہین اور اعلیٰ درجے کا سوتی تار کاتنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ امر غالباً اہمیت سے خالی نہیں کہ ۱۹۳۲ء میں "لنکاشائر کی ہندوستانی کپاس کمیٹی" قائم ہونے کے بعد سے اور اس کمیٹی کی کوششوں کی بدولت آجکل لنکاشائر کی گرنیوں میں ہندوستانی روئی کی کھپت پہلے سے زیادہ ہو رہی ہے۔ لنکاشائر دنیا کے مختلف ملکوں سے جتنی روئی لیتا ہے اس کی مجموعی مقدار میں ہندوستان کا حصہ ۸ فی صد سے کچھ زیادہ سے ۱۹ فی صد تک بڑھ گیا ہے۔ 187
"بمبئی لنکاشائر معاہدۂ پارچہ بافی" بابتہ ۱۹۳۴ء میں بھی جو عام طور پر "موڈی لیز پیمان" کے نام سے موسوم ہے، اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سلطنت متحدہ میں ہندوستانی خام روئی کے استعمال کو عام اور وسیع کیا جائے اور فروغ دیا جائے[۱]۔

بڑی جنگ نے اس مسئلے کو بہت نمایاں کر دیا ہے کہ سلطنت برطانیہ کو اپنی روئی کی رسد کی حد تک کس طرح خود کفیل بنایا جائے اور دوسرے اسباب کے منجملہ بڑی جنگ ہی نے حکومت ہند کے لیے ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہندوستانی کپاس کمیٹی مقرر کرنے کا موقع بہم پہنچایا، تاکہ وہ ہندوستان میں لانبے ریشے کی کپاس کی

۱۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" بابتہ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء و ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء۔

باب ۶

رسد کو بڑھانے کے امکانات کو جانچے، روئی اوٹنے اور صاف کرنے کے موجودہ طریقوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مشورے دے اور کپاس میں آمیزش کرنے اور اس کو نم کرنے کے طریقے کو روکنے کے بارے میں سفارشیں پیش کرے۔ کمیٹی مذکور کی رپورٹ اپریل ۱۹۱۹ئ میں شایع ہوئی اور دو شعبوں میں منقسم تھی۔ ایک زرعی، دوسرا تجارتی۔ زرعی شعبے میں روئی کی پیداوار اور خوبی کی اصلاح و ترقی کے طریقوں پر بحث کی گئی تھی اور نباتی کام اور کاشتکاری کے طریقوں کی اصلاح و ترقی کے بارے میں خاص طور پر زور دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی گئی کہ محکمۂ زراعت کی تنظیم اور توسیع کی جائے اور لانبے ریشے کی روئی کے زیر کاشت رقبے کو خاصکر سندھ، پنجاب، شمال مغربی صوبۂ سرحدی، صوبۂ متحدہ اور کسی حد تک جزیرہ نما میں آبپاشی کے ذریعے وسیع کیا جائے۔ کمیٹی نے اس خیال سے کہ کسان کو خاصکر خالص اور اعلیٰ درجے کی روئی کی معقول قیمت وصول ہو، متعدد مفید سفارشیں پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ برار کے نمونے پر کھلے بازار قائم کیے جائیں، تاکہ خریدار کو بخوبی معلوم ہو جائے کہ وہ کس قسم اور نوعیت کا مال خرید رہا ہے، امداد باہمی کے اصول پر فروخت کی انجمنیں قایم کی جائیں، روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کے لیے سرکاری اجازت نامے جاری کیے جائیں، روئی میں آمیزش کرنے اور اس کو نم کرنے کے مذموم طریقوں کو روکنے کے لیے نقل و حمل پر بندشیں عائد کی جائیں۔ علاوہ ازیں کمیٹی نے روئی کے متعلق پیش اندازوں اور دوسری اعدادی معلومات کی اصلاح و ترقی کے بارے میں مشورے پیش کیے۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ بمبئی میں ایک انجمن بنام "مرکزی انجمن برائے تجارت پنبۂ ہند" Central Eest India cotten Trade Association قائم کر کے روئی کی تجارت کی اصلاح و توسیع کی جائے۔ آخر میں یہ رائے پیش کی گئی کہ محکمۂ زراعت اور کپاس کی تجارت کے مابین زیادہ قریبی تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک مستقل "مرکزی کپاس کمیٹی" قایم کی جائے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ ایک کمیٹی جو بارہ سرکاری اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ہو، مشاورتی مجلس کے طور پر قائم کی جائے جس سے حکومت کسی مجوزہ آئین سازی اور اجرائے اجازت نامہ جات کے عمل کے بارے میں مشورہ کرے۔ کمیٹی مذکور کا یہ کام ہو کہ وہ روئی کے نئے انواع کی قیمتوں کا

مستند طریقے پر تخمینہ کرے اور مختلف قسم کی کتائی کی جانچ کرے۔ کچھ باب ۶
تاخیر کے بعد کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا گیا، چنانچہ ۱۹۲۲ء 188
میں ایسٹ انڈیا کاٹن ٹریڈ اسوایشن قائم ہوئی۔ مرکزی کپاس کمیٹی نے اپنا پہلا اجلاس
سال ۱۹۲۱ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ روئی کی آمیزش کو روکنے کے لیے کمیٹی مذکور نے
سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک قانون بنام کاٹن ٹرانسپورٹ ایکٹ (قانون نقل وحمل پنبہ) نافذ کرایا۔
یہ قانون پہلے بمبئی میں نافذ ہوا جہاں اس کو ہمت افزا کامیابی ہوئی، اس کے بعد اس کو
مدراس میں بھی جاری کیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک قانون بنام کاٹن جننگ انڈ پریسنگ
فیکٹریز ایکٹ (روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانوں کا قانون) جو نقل وحمل کے قانون کا
ضمیمہ تھا، نافذ ہوا۔ ہندوستان کی مرکزی کپاس کمیٹی نے بمبئی میں ایک فنی تجربہ خانہ قائم
کیا ہے جہاں سوت کات کر روئی کی خوبی کی آزمایش کی جاتی ہے۔ ریاستہائے وسطی ہند
سے تعاون کرکے کمیٹی کپاس کے بارے میں تجربات کا کام آغاز کر چکی ہے اور اس کے لیے
ایک تحقیقاتی مرکز بنام انسٹی ٹیوٹ آف پلانٹ انڈسٹری بمقام اندور قائم ہو گیا ہے۔
علاوہ ازیں مختلف صوبوں میں بھی یہی کمیٹی خاص خاص تحقیقاتی تجاویز کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے
اس کمیٹی کو اپنے جملہ کاروبار انجام دینے کے لیے دو آنے فی گانٹھ کے اس چھوٹے سے محصول
سے مالی مدد ملتی ہے جو برطانوی ہند کی گرنیوں میں استعمال ہونے والی روئی پر عائد کیا
جاتا ہے۔ بمبئی میں سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک قانون بنام کاٹن مارکٹس ایکٹ (روئی کے بازار کا
قانون) منظور ہوا، اور اس قانون کے شرایط حکومت بمبئی کی جانب سے شایع کیے
جا چکے ہیں۔ بمبئی پریزیڈنسی کے ایک یا دو کپاس کے مرکزوں میں اس قانون کو نافذ
کر دیا گیا ہے۔ اسی کے مشابہ قوانین صوبہ متوسط اور مدراس میں "صوبہ متوسط کی روئی کے
بازار کا قانون" اور "مدراس کی تجارتی فصلوں کے بازار کا قانون" کے نام سے منظور ہوئے ہیں۔
ہم یہاں جو تنقید ضروری سمجھتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ خود ملک کے اندر کپاس کی ترقی یافتہ
انواع کے استعمال کیے جانے کے بارے میں تدابیر پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ ملک کا
انحصار بیرونی پارچوں پر کم ہو جائے۔ ہندوستان اپنی خام روئی کی وافر رسد کے باوجود اپنے
کپڑوں کی مجموعی طلب کے قریب قریب ایک تہائی تک غیر ملکوں کا محتاج رہا کرتا ہے۔
کسان کی معاشی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے کمیٹی جو بھی تدابیر اختیار کرے اس کا

یقیناً خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کمیٹی لانبے ریشے کی روئی کے بارے میں لنکاشائر کی طلب کو پورا کرنے کی تدابیر اختیار کرے تو اس میں کمیٹی کی کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ اس کو تو چاہئے کہ اسی کو اپنا واحد اور سب سے بڑا مقصد قرار دے۔

(ب) سَن کپاس کے بعد اہم ترین ہندوستانی ریشہ سَن ہے۔ ہندوستان کو سَن کی پیداوار میں تمام دنیا میں واحد اجارہ دار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی کاشت بنگال میں گنگا و برہم پتر کے ڈلٹا، صوبۂ آسام اور کوچ بہار کی ملحقہ دیسی ریاست اور اوڑیسہ تک محدود ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز دریائی مٹی ہے جو دریاؤں کے سیلاب کے ساتھ آکر تہ بہ تہ جم گئی ہے اور سَن جیسی فصل کی کاشت کے لیے جو زمین سے بہت قوت کھینچکر اس کو کمزور کر دیتی ہے موزوں ہے اور کھاد کے مصارف برداشت نہیں کرنے پڑتے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں سن کے زیر کاشت مجموعی رقبہ ۳۳۴۹ر۲۰۰ ایکڑ تھا، جس کے مقابلے میں 180
سنہ ۱۹۳۴ء میں کاشت کے رقبے کا اندازہ ۲ر۴۹۷ر۰۰۰ ایکڑ کیا گیا تھا۔ اگرچہ قیمتوں کے گر جانے اور سَن کی مصنوعات کی کساد بازاری کے باعث موجودہ زمانے کا رقبہ کچھ سال پیشتر کے رقبے سے بہت کم ہے، لیکن صورت حال کی اصلاح و ترقی کی تحریک بہت زوروں پر ہے۔ چنانچہ حکومت بنگال نے ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء کو اس تجویز کا اعلان کیا کہ سنہ ۱۹۳۵ کی فصل کی ارادی طور پر روک تھام کی جائے گی، تاکہ خام سَن کی قیمت کو بحال کرنے میں مدد ملے۔ سنہ ۱۹۳۴ میں سَن کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۲ر۱۸۶ر۱۰۰ ایکڑ تھا، جس میں بنگال کا بہت بڑا حصہ تھا، باقی صوبے بہار و اوڑیسہ (۱۲۵ر۶۰۰ ایکڑ)، اور آسام (۱۴۵ر۳۰۰ ایکڑ) تھے۔ سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸ میں مجموعی زیر کاشت رقبے کے زائد از ۳۳ فی صد حصے پر زیادہ پیداوار دینے والے اور مرض کی مقاومت کرنے والے دو اہم قسم کے ریشوں کی کاشت ہوتی تھی۔ صوبۂ متحدہ کے ایک علاقہ گنجر نامی میں سَن کی نئی نئی کاشت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں سن کی کاشت کے رقبے اور ریشے کی پیداوار میں بہت بڑی حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ سَن کی برآمد اہمیت کے لحاظ سے کپاس سے صرف دوسرے درجے پر ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ تا سنہ ۱۹۲۹ میں ۸۹۸ر۰۰۰ ٹن خام سن جس کی قیمت ۳۲ر۳۵ کروڑ روپے تھی اور سن کی مصنوعات جس کی قیمت ۵۶ر۹۰ کروڑ روپے تھی، برآمد ہوئیں۔ اس کے بالمقابل سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ کے اعداد خام سن کے بارے میں ۸۰۷ر۰۰۰ ٹن تھے جس کی قیمت

باب ۷ ۱۷ء۲۷ کروڑ روپے وصول ہوئی اور مصنوعات کے اعداد ۹۳ء۱۵ کروڑ روپے تھے۔ اس کمی کا باعث یہ تھا کہ ہندوستان اور دوسرے خریدار ملکوں میں سَن کی صنعت میں انتہائی کساد بازاری رونما ہوئی تھی۔ بعد کے سالوں میں کساد بازاری اور بھی بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء میں برآمد کیے ہوئے سَن کی مقدار صرف ۵۶۳،۰۰۰ ٹن تھی جس کی قیمت ۲ء۹ کروڑ روپے وصول ہوئی۔ اس کے بعد سے برآمد کیے ہوئے خام سَن کی مقدار میں کچھ زیادتی ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ء میں ۷۸۰،۰۰۰ ٹن اور سنہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء میں ۷۵۲،۰۰۰ ٹن ہو گئی برآمد میں ۴۰۰۰ ٹن سے زاید مقدار کا اضافہ ہونے کے باوجود باہر بھیجے ہوئے خام سَن کی قیمت ۱۰ء۸۷ کروڑ روپے وصول ہوئی جو پچھلے سال کے مقابلے میں زائد از ۶ لاکھ روپے کم تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء میں خام سَن اور سَن کی مصنوعات کی برآمد کی مجموعی مقدار ۱،۴۳۷،۰۰۰ ٹن تھی جس سے ۳۲½ کروڑ روپے وصول ہوئے۔ آجکل غیر ملکی بازاروں میں خام سَن یا سَن کی اشیا کے آزادانہ داخلے پر جو بندشیں عائد کی جارہی ہیں ان کی بنا پر ممکن ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد متاثر ہو۔

جرمنی اور سلطنت متحدہ، ہندوستان کے خام سَن کے سب سے بڑے خریدار ہیں، اور درآمد کرنے والے دوسرے ملک اسپین، فرانس، جاپان، چین، ریاستہائے متحدہ امریکا، اٹلی اور بلجیم ہیں۔ یوں تو خام سَن کی برآمد سنہ ۱۷۹۵ء ہی میں شروع ہو چکی تھی، لیکن مقدار ابتدا بہت قلیل رہی۔ سنہ ۱۸۳۲ء تک قوت سے چلنے والے ڈنڈی کے کرگھوں کی طرف سے طلب میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ لیکن بنگال کی دستی کرگھوں کی صنعت میں سنہ ۱۸۵۰ء تک اتنی کافی طاقت تھی کہ خام سَن کی برآمد کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد کی زیادتی یقینی تھی۔ جنگ کریمیا کے زمانے میں سلطنت متحدہ کو روسی سَن کی برآمد کا سلسلہ رک گیا اور نہایت اہم تجارتی ریشہ ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی خام سَن کی برآمد میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۰۹ء میں مجموعی طور پر ۹۰۰،۰۰۰ ٹن سَن برآمد ہوا، جس کے دو بڑے خریدار سلطنت متحدہ اور جرمنی تھے۔ بڑی جنگ کے زمانے میں برآمد میں بہت بڑی کمی ہو گئی، گو جنگ ختم ہو جانے کے بعد سے یہ کمی ایک حد تک رفع ہو گئی ہے۔ سَن کی مصنوعات کی ترقی کا حال کسی دوسری جگہ بیان ہوگا، یہاں صرف یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ اس صنعت کی ترقی عمل کے بغیر جاری رہی جس کا

سلسلہ موجودہ زمانے کی تجارتی کساد بازاری تک قائم رہا۔ زمانۂ قبل از جنگ میں ہندوستانی سن کی مصنوعات کی برآمد میں خام سن کی برآمد سے زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی، اور اس میلان کے حق میں جنگ عظیم نے مزید محرک کا کام کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ء میں سن کی مصنوعات کی برآمد زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلے میں تھیلوں کی حد تک ۱۴ فی صد اور بنے ہوئے ٹاٹ کی حد تک ۵۵ فی صد زیادہ رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ اور اس کے بعد کے سالوں کی کساد بازاری کا حال کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے[1]۔

(۵) نیل۔ نیل کی سرگزشت بہت ہی رنگ برنگی ہے جو تقریباً عیسوی سنہ کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ "ابتداءً صنعت مغربی ہندوستان میں پرتگالیوں کے ہاتھوں میں تھی، لیکن سنہ ۱۷۷۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں اس میں نئی جان ڈالی اور اس کے بعد بیس سال تک اس کی براہ راست ہمت افزائی کرتی رہی۔ چنانچہ جب سنہ ۱۸۳۷ء میں یہ صنعت ترہٹ اور صوبۂ متحدہ میں منتقل ہوئی تو ہندوستان نے دنیا کے نیل پیدا کرنے والے ملکوں کی پہلی صف میں اپنی جگہ دوبارہ قائم کرلی جہاں سے اس کو جزائر غرب الہند نے عارضی طور پر ہٹا دیا تھا۔ ہندوستان مسابقت کی زد سے اس وقت تک بالکل محفوظ رہا جس وقت تک کہ جرمنی کے تجربے خانوں نے سنہ ۱۸۹۷ء میں آخر کار یہ دریافت نہیں کرلیا کہ نیل تجارتی اصول پر تیار کیا جاسکتا ہے[2]۔ جو مصیبت مجیٹھ اور لاکھ کی صنعتوں پر آچکی تھی اس سے بہار کے کارخانے خطرے میں پڑ گئے"[3]۔ ہندوستانی نیل کی برآمد بری طرح متاثر ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۷ تا سنہ ۱۹۰۸ برآمد کئے ہوئے نیل کی قیمت، رنگائی اور دباغت کی اشیا کی برآمد کی قیمت کے نصف سے زائد کی نمایندگی کرتی تھی، لیکن سنہ ۱۹۱۳ تا سنہ ۱۹۱۴ میں یہ تناسب گھٹ کر ۱/۵ ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۸۹۶ تا سنہ ۱۸۹۷ میں نیل کے زیر کاشت رقبہ ۱۶۸۸۹۰۱ ایکڑ تھا، لیکن سنہ ۱۹۱۳ تا سنہ ۱۹۱۴ میں یہ ۱،۱۲،۶۰۰ ایکڑ تک گھٹ گیا اور برآمد ۱،۶۹،۵۲۳ ہنڈرڈ ویٹ سے ۱۰،۹۳۹ ہنڈرڈ ویٹ تک گر گئی۔ بڑی جنگ نے قدرتی نیل کی صنعت کے حق میں عارضی محرک کا کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیر کاشت

[1] دیکھو جلد دوم باب (۲) "ہندوستانی صنعتیں، قدیم و جدید"۔

[2] اگرچہ بیچ پوچھو تو نیل کی ترکیب کا تجربہ تیس سال قبل کیا جاچکا تھا۔

[3] دیکھو کاٹن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۲۶۴۔

رقبے میں کچھ زیادتی ہوئی چنانچہ ۱۹۱۶ تا ۱۹۱۷ء میں رقبہ بڑھ کر ۷۷۰ر۰۰۰ ایکڑ ہو گیا
اور ۱۹۱۵ تا ۱۹۱۶ء میں برآمد بڑھ کر ۴۱ر۹۳۲ ہنڈرڈ ویٹ ہو گئی، پھر بھی بڑی جنگ کے
موقوف ہونے کے بعد سے مکرر کمی رونما ہوئی ہے اور برآمد جس کی اہمیت گھٹ گئی ہے
۱۹۳۴ تا ۱۹۳۵ء میں صرف ۵۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تھی اور اس کی قیمت ۱ر۰۰ لاکھ روپے
وصول ہوئی۔ اس صنعت کے آیندہ توقعات کے بارے میں مختلف رائیں قایم کیجاتی ہیں
اور صنعت کا مستقبل روشن نہیں معلوم ہوتا بلکہ غیر یقینی ہے۔ اس کو تباہی سے بچانے 191
کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی کاشت اور مصنوعات کی تیاری کے مصارف
کم کیے جائیں۔ ۱۹۱۵ء میں دہلی کانفرنس میں اس صنعت کی امداد کا مسئلہ زرعی تحقیقاتی
اور تجارتی تین نقطۂ ہائے نظر سے زیر غور بحث رہا۔ ۱۹۱۸ء میں نیل کی برآمد پر ایک
محصول عائد کیا گیا اور طے پایا کہ حکومت ہند اس کے ماحصل کو نیل کی کاشت اور
مصنوعات کی تیاری کے سلسلے میں تحقیقاتی کام پر صرف کرے۔ چنانچہ پوسا کے
تحقیقاتی مرکز (Pusa Research Institute) میں حکومت ہند کے مقرر کردہ ماہر کیمیا
نیل کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ء میں نیل کے زیر کاشت مجموعی رقبہ
صرف ۴۱ر۹۰۰ ایکڑ تھا جس میں مدراس، صوبۂ متحدہ، بہار اوڑیسہ، بمبئی اور بنگال کا بڑا
حصہ تھا۔ تجارت خارجہ کے نقطۂ نظر سے بہار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے چنانچہ
یہیں اہل یورپ کی نگرانی میں رنگ باقاعدہ طور پر نکالا اور تیار کیا جاتا ہے اور اس کی
قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ بہار کے کارخانوں میں جو نیل تیار ہوتا ہے اس کی برآمد
کلکتے سے زیادہ تر یونان، سلطنت متحدہ، فرانس، تیونس، اور مصر کو ہوتی ہے۔

(۶) افیون ۱۹۰۷ء میں حکومت ہند کا چین سے اور آخر کار ۱۹۳۵ء میں
دوسرے تمام ملکوں سے جو معاہدہ طے پایا اس کے تحت حکومت ہند نے چین کو افیون
کی برآمد موقوف کرنے کی پالیسی اختیار کی جس کے نتیجے کے طور پر اور اندرونی صرف پر
سرکاری نگرانی قائم ہو جانے کی وجہ سے افیون کے زیر کاشت رقبے میں تدریج کمی
ہو گئی ہے۔ برطانوی ہند میں ۱۹۰۶ تا ۱۹۰۷ء میں رقبہ ۶۱۴ر۸۷۹ ایکڑ تھا جو ۱۹۳۳ تا
۱۹۳۴ء میں ۴۲ر۵۶۲ ایکڑ تک گر گیا۔ پوست کی کاشت سرکاری اجازت ناموں کے

باب ۶ طریقے کے تحت ہوتی ہے اور آجکل یہ زیادہ تر صوبہ متحدہ تک محدود ہے، جہاں ۱۵۹۵۲ ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے۔ افیون کی برآمد کا پنجسالہ اوسط زمانہ قبل از جنگ میں ۵۱۰۰۰ ہنڈرڈویٹ تھا، اس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء میں ۲۳۸۲ پیٹی یا ۲۴۵۲۵ ہنڈرڈویٹ اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۴۴۶۴ پیٹی یا ۲۵۰۸ ہنڈرڈویٹ افیون برآمد کی گئی۔[1]

(۷) تمباکو۔ تمباکو کے پودے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے اوائل میں پرتگالیوں نے ہندوستان کو اس سے روشناس کرایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے ہی سے حکومت کی یہ کوشش رہی کہ بڑھیا تمباکو کاشت کیا جائے اور اس کو سکھانے اور تیار کرنے کے دیسی طریقوں کو اصلاح و ترقی دی جائے۔ تمباکو کی صنعت کے تین اہم مرکز ہیں، یعنی (۱) مشرقی و شمالی بنگال (۲) جنوبی ہند اور (۳) جنوبی برما۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کے اندازے کے مطابق تمباکو کے زیر کاشت مجموعی رقبہ ۱۱۸۳۰۰۰ ایکڑ تھا جس میں سب سے بڑا حصہ مدراس، بنگال، بہار، اڑیسہ، بمبئی، برما، صوبہ متحدہ اور پنجاب کا تھا۔ ہندوستان میں جتنا تمباکو پیدا ہوتا ہے اُس کا بیشتر حصہ ملک ہی میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن غیر مصنوعہ تمباکو زیادہ تر مدراس اور رنگون سے برآمد کیا جاتا ہے
192 جس سے معقول قیمت وصول ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں ۲۶ ملین پاؤنڈ وزنی تمباکو باہر گیا جس سے ۸۰ لاکھ روپیہ وصول ہوا۔ جہاں تک تمباکو کی مصنوعات کا تعلق ہے وہاں تک درآمد کی قیمت ہمیشہ برآمد کی قیمت سے بڑھی رہی ہے اور یہ فرق حال میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگیا ہے کہ یہاں سگرٹیوں کے استعمال میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں ۳٫۵ ملین پاؤنڈ وزن کے سگریٹ جن کی قیمت ۲ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے اور ۴۸٫۸ ملین پاؤنڈ تمباکو جس کی قیمت ۷۵ لاکھ روپے تھی درآمد ہوا۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں سگریٹ کی درآمد ۴۶۱۴ پاؤنڈ تک گر گئی جس کی قیمت ۲۲٫۳ لاکھ روپے تھی اور درآمدہ تمباکو تین ملین پاؤنڈ تک گر گیا اور اس کی قیمت ۳۹٫۶ لاکھ روپے ادا کی گئی۔ اس کثیر طلب نے ہندوستان میں سگریٹ بنانے کی ہمت افزائی کی اور کئی کارخانے قایم ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کے بنے کے تمباکو سے سگریٹ نہایت عمدہ بنتا ہے لیکن سگار عام طور پر اچھا

[1] نیز دیکھو جلد دوم "مالیہ اور محصول" کا باب۔

باب ۶

نہیں بنتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سماٹرا اور جاوا سے کثیر مقدار میں تمباکو درآمد کیا جاتا ہے۔ پوسا کے زرعی تحقیقاتی مرکز کے شعبۂ نباتیات نے اپنی توجہ ہندوستانی تمباکو کی خوبی کی اصلاح و ترقی کی جانب مبذول کی ہے، خاصکر نئی نئی بدیسی قسموں کی کاشت کرنے میں اور اس قسم کے رنگ اور خوشبو کے تمباکو کی پیدائش میں جس کو عام طور پر ورجینیا تمباکو کہتے ہیں۔ تمباکو کی درآمد پر جو بھاری محصول عاید کیے گئے ہیں ان کے متعلق بھی یہ توقع ہے کہ وہ ہندوستانی تمباکو کی کاشت اور اس کے صرف کے حق میں محرک کا کام کریں گے۔[ل]

(۸) چارے کی فصلیں سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۰۲ء میں برطانوی ہند میں ان پودوں کے زیر کاشت رقبہ ۶ء۹ ملین ایکڑ تھا جو سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۰ء۱۲ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا جس کے منجملہ تین اہم صوبوں کا حصہ حسب ذیل تھا۔ پنجاب ۶ء۴ ملین ایکڑ، بمبئی ۲ء۶۵ ملین ایکڑ اور صوبہ متحدہ ۱ء۳۱ ملین ایکڑ۔ اس اضافے کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چارے کے لیے جو رقبہ وقف ہے وہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے مویشیوں کی بڑی تعداد کی پرورش اور ترقی اور ان کی کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ محکمۂ زراعت نے کچھ سال ادھر سے چارہ پیدا اور اکھٹا کرنے کے مسئلے کی جانب بہت توجہ مبذول کی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں مشہور مصری تپتیا گھاس کی کامیاب کاشت، زمین کی کایا کلپ کے بارے میں سندھ، بہار، صوبۂ متوسط اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اختیار کی ہوئی تدابیر اور پوسا میں برسیم کی کاشت، ان سب چیزوں کو محکمۂ زراعت کا قابل تعریف کارنامہ خیال کیا جا سکتا ہے۔[ٹ]

(۹) ربڑ۔ ربڑ جس کے فوائد آج کل بے شمار ہیں، زیادہ تر جنوبی ہند مثلاً مدراس، کورگ، اور ریاستہائے میسور، ٹراونکور اور کوچین اور برما میں پیدا ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ربڑ کی کاشت کا مجموعی رقبہ ۱۷۷۰۰۰ ایکڑ اور پیداوار ۱۴ ملین پاؤنڈ خام ربڑ تھی۔ جتنا ربڑ پیدا ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ باہر جاتا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں

ل۔ دیکھو جلد دوم "مالیہ اور محصول" کا باب جس میں "قانون مالیہ بابت سنہ ۱۹۳۴ء" کی رو سے تمباکو پر نظر ثانی کے بعد عائد کیے ہوئے محصول کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس قانون نے ہندوستان میں اُگے ہوئے تمباکو کے سگریٹ بنانے کے لیے کچھ زیادہ سہولت بہم پہنچائی۔

ٹ۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر زرعی کاروبار ہند" برائے سنہ ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۶، ۷ تا
(Review of the Agricuttural opratiens in India)
صفحہ ۷۰۔

جدول (۱)

	مقدار (در ہزار)				
	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانہ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
(۱) غلّہ، دال اور آٹا	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
دھان	۴۲	۳۲	۳۵	۲۸	۱۴
چاول	۲۳۹۸	۱۶۸۵	۱۴۶۳	۲۲۹۸	۱۵۹۲
گیہوں	۱۳۰۸	۸۰۷	۲۳۷	۱۳	۱۱
گیہوں کا آٹا	۵۵	۵۷	۵۶	۵۱	۱۳
دال	۱۵۹	۱۲۹	۱۴۱	۹۷	۱۱۲
جو	۲۲۷	۱۹۸	۴۰	۶	۱۴
جوار اور باجرا	۴۱	۴۱	۱۱	۱۵	۴
دوسرے اجناس	۱۸۱	۱۹۲	۲۷	۲	۶
میزان اشیائے خوردنی	۴۴۱۱	۳۱۴۱	۲۰۰۹	۲۵۱۰	۱۶۶۵
(۲) چائے - (پاؤنڈ)	۲۶۶,۴۹۷	۳۲۲,۶۹۱	۳۲۱,۱۶۹	۳۷۶۶۳۴	۳۲۴۸۳۵

باب

باب ۶

سلسلہ جدول (۱)

	قیمت (بحساب ہزار روپیہ)				
	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
(۱) غلہ دال اور آٹا					
دھان	۲۶/۱۸	۲۰۰۹	۳۱۳۶	۲۲۲۰	۶۶۳
چاول	۲۵۶۶,۵۵	۱۸۸۸,۲۵	۲۴۳۳۶۶	۱۰۳۰۲۸	۳۱۳۸۴۲
گیہوں	۱۳۹۶,۸۶	۱۰۳۳۴۱	۳۶۶۶۱	۲۱۲۴	۱۰۶۱
گیہوں کا آٹا	۸۶,۹۹	۱۱۳۲۰	۱۵۰۳۶	۱۰۷,۸	۱۴۶۷
دال	۱۲۹,۸۱	۱۸۸۵۲	۲۰۲۷۸	۱۶۳۷۸	۱۰۵۰۶
جو	۱,۹۳,۱۶	۲۲۱۷۳	۴۶۵۶	۹۷۲	۹۳۰
جوار اور باجرا	۳۷,۹۰	۴۴۱۵	۱۷۳۹	۲۵۱۳	۴۱۴
دوسرے اجناس	۱۴۲,۹۶	۲۳۲۴۵	۳۴۰۳	۴۴۹	۳۷۱
میزان اشیائے خوردنی	۴۵۸۱,۱۱	۳۷۴۱۸۰	۳۲۸۲۶۵	۳۴۷۹۴۲	۱۱۸۴۰
(۲) چائے۔ (پاؤنڈ)	۱۳۰۶۷۸	۱۰۵۴۵۷	۲۰۹۲۴۲	x	۲۰۱۳۱۹

جدول (۲)

مقدار (بحساب ہزار ٹن)

	زمانہ قبل از جنگ کا اوسط	زمانہ جنگ کا اوسط	زمانہ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵
(۳) ریشے:-	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
خام کپاس	۴۳۰	۳۹۱	۵۲۱	۷۲۷	۶۱۵
خام سن	۷۶۴	۴۶۴	۵۵۴	۸۰۷	۷۵۲
میزان ریشہ	۱۱۹۴	۸۵۵	۱۰۷۵	۱۵۳۴	۱۳۶۷
(۴) روغندار تخم:- جوہری	۱۰	۸	۹	۴	۹
غیر جوہری:- السی	۳۷۹	۲۷۰	۲۵۱	۲۴۸	۲۳۸
مونگ پھلی	۲۱۲	۱۱۹	۱۹۵	۷۱۴	۵۱۱
سرسوں	۲۷۳	۹۱	۲۰۶	۴۴	۳۷
تل	۱۱۹	۳۳	۲۸	۱۱	۴
اریںڈی	۱۱۴	۸۹	۴۸	۱۰۷	۶۹
ناریل	۳۱	۱۶	۷	—	—
بنولہ	۲۴۰	۶۹	۱۵۵	۵۸	۱
رائی	۴	۳	۲	۳	۳
بوڑہ	۲۹	۳	۸	—	—
خشخاش	۳۳	۵	۶	—	—
دوسری قسمیں	۹	۲	۸	۰	۳
میزان روغندار تخم	۱۴۵۳	۷۰۸	۹۲۳	۱۲۵۰	۱۰۳۷

(ماخوذ از "تبصرہ بر تجارت ہند" برائے سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ و سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵) (Review of the Trade of India)

باب ۲

باب ۶

سلسلہ جدول (۲)

	قیمت بحساب ہزار روپیہ				
	زمانہ قبل از جنگ کا اوسط	زمانہ جنگ کا اوسط	زمانہ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۳۰	سنہ ۱۹۳۴ سنہ ۱۹۳۵
(۳) ریشے:					
خام کپاس	۳۳۲۷۸۳	۳۳۶۳۱۹	۶۴۶۳۸۹	۶۵۱۶۶۰	۳۴۴۹۸۳
خام سن	۲۲۲۰۲۴	۱۳۸۰۲۸	۱۹۵۲۷۷	۲۷۱۶۳۸	۱۰۸۴۱۱
میزان ریشے	۵۵۴۸۰۶	۴۷۴۳۴۷	۸۴۲۹۶۶	۹۲۲۵۰۸	۴۵۳۳۹۴
(۴) روغندار تخم:					
السی: جوہری	۲۰۵۶	۲۴۱۶	۳۵۸۸	۱۵۸۶	۱۹۶۵
غیر جوہری	۴۷۸۹۰	۴۹۴۹۴	۷۵۷۷۲	۵۷۲۳۶	۲۹۹۷۶
مونگ پھلی	۳۵۲۵۷	۱۹۱۱۶	۵۶۱۹۶	۱۶۳۸۸۶	۵۹۲۸۴
سرسوں	۴۱۳۶۹	۱۴۳۰۱	۵۰۷۳۶	۹۲۰۸	۴۲۳۹
تل	۲۴۸۱۵	۷۶۳۵	۱۰۲۷۳	۳۷۱۸	۷۵۳
ارینڈی	۱۶۶۴۳	۱۵۷۵۵	۱۱۴۵۴	۲۱۴۹۶	۸۱۰۸
ناریل	۱۱۰۴۳	۶۰۷۳	۲۸۸۴	۶۸	۳۰
بنولہ	۱۴۹۹۸	۵۰۲۵	۱۸۸۰۵	۵۴۸۶	۳۹
رائی	۱۰۰۸	۹۱۶	۹۶۵	۷۷۲	۴۹۰
موٹھ	۲۴۵۳	۳۰۴	۱۲۷۹	۶۳	—
خشخاش	۱۶۶۹	۹۵۸	۲۰۹۷	۷۱	۱۸
دوسری قسمیں	۲۳۲۳	۶۴۸	۱۳۰۳	۲۱۱۳	۵۱۸
میزان روغندار تخم	۲۴۳۶۹۷	۱۲۱۷۴۲	۲۲۵۳۶۴	۲۶۶۷۶۷	۱۰۵۴۱۰

باب ۶ ۳،۶ ۲ ملین پاونڈ ربڑ جس کی قیمت ۲۴،۶۵،۲۴ روپے تھی برآمد کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء سے پیشتر اشیائے برآمد کی مقدار بہت کم تھی، اس لیے کہ صنعت نوخیز اور ابتدائی حالت میں تھی۔ موجودہ زمانے میں بھی دنیا کی مجموعی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ صرف تقریباً ۳ فی صد ہے۔ جون ۱۹۳۴ء سے ربڑ کی پیدائش اور برآمد کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ اس تجویز کے عملی جامہ پہنے سے پیشتر ربڑ کا بازار بہت مندا تھا، لیکن اب یہ حالت باقی نہیں رہی ہے۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء میں درآمدہ ربڑ کی مصنوعات مثلاً ٹائر، ٹیوب وغیرہ کی قیمت ۲ کروڑ ۶ لاکھ روپے تھی۔

۸۔ زرعی پیداوار کی برآمد۔ ہندوستان کی اہم زرعی پیداوار کے مذکورۂ بالا تبصرے میں ان کے برآمد کے پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن اب زرعی پیداوار کی برآمد کے کل مسئلے پر جداگانہ بحث کرنا ضروری ہے۔ اس مسئلے کی ابتدائی بحث کے طور پر اجناس خوردنی اور اشیائے خام کی برآمد کے متعلق کچھ اعداد و شمار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۶ پر مندرجہ جدولوں میں سے ایک میں اشیائے خوردنی کی برآمد کی قیمت اور مقدار اور دوسری میں اہم زرعی پیداوار کی برآمد کی قیمت اور مقدار بتلائی گئی ہے۔

مندرجۂ ذیل جدول نمبر (۳) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مجموعی پیداوار سے بعض اہم فصلوں کی برآمد کا فی صد تناسب کیا ہے۔[۱]

جدول (۳)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء	۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء	۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء
چاول	۹	۵	۵	۸	۸	۷	۵

۱۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند" برائے ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۴۴۔

باب ۶

سلسلہ جدول (۳)

	زمانۂ قبل از جنگ کا اوسط	زمانۂ جنگ کا اوسط	زمانۂ بعد از جنگ کا اوسط	سنہ ۱۹۲۵ / ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۷ / ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۳۰ / ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۳۴ / ۱۹۳۵ء
گیہوں	۱۴	۹	۳	۳	۴	۲	۰ء۱
چائے	۹۶	۸۹	۹۵	۹۰	۹۱ سنہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷ء	۹۶	۸۱
خام کپاس	۵۶	۵۱	۶۱	۶۹	۴۶	۷۵	۷۲
خام سن	۵۱	۲۱	۴۸	۴۶	۴۹	۳۱	۴۹
السی	۷۳	۶۳	۵۹	۷۷	۶۳	۶۸	۵۷
سرسوں اور رائی	۲۳	۸	۱۹	۱۳	۸	۴	۴
تل	۲۵	۸	۶	۱۰	۲	۰ء۲	۱
مونگ پھلی	۳۵	۱۲	۱۹	۲۴	۲۴	۱۹	۲۷
نیل[۱]	۴۰	۴۴	۲۷	۷	۱۷	۷	—

۱ـ سنہ ۱۹۳۴ تا سنہ ۱۹۳۵ کے اعداد دستیاب نہیں ہوئے۔

باب ۶ مندرجۂ ذیل جدول (۴) میں جملہ اشیائے برآمد کی مجموعی قیمت سے مختلف اجناس کا فی صد تناسب دیا گیا ہے اور سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء کی تجارت برآمد میں اہم اشیائے خوردنی اور دوسری قسموں کی پیداوار کی اضافی اہمیت بھی بتائی گئی ہے۔[1]

جدول (۴)

196

اشیا	فیصد	اشیا	فیصد
خام کپاس	۲۳ر۱۵	کھلی	۱ر۳۰
غلہ دال اور آٹا	۷ر۸۳	مسالے	۰ر۵۱
خام سن	۷ر۱۹	قہوہ	۰ر۴۸
تخم	۶ر۹۷	تمباکو	۰ر۵۴
چائے	۱۳ر۳۲	میوے اور ترکاریاں	۰ر۷۱

۹۔ اشیائے خوردنی کی برآمد پر چند قسمیں

جیسا کہ اوپر جدول (۱) میں بیان ہو چکا ہے چاول جملہ برآمد کردہ اجناس میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں جملہ برآمد کردہ اجناس اور آٹے کے مقابلے میں اس کی برآمد کا تناسب ۹۲ر۴۳ فیصد اور سنہ ۱۹۳۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء میں ۹۱ فیصد تھا۔ گیہوں کا نمبر برآمد کردہ اہم اجناس میں

[1] سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۳۱ء میں برطانوی ہند سے جملہ برآمد کی مجموعی قیمت ۱،۵۱،۲۱،۴۴ روپے وصول ہوئی۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "تبصرہ بر تجارت ہند برائے سنہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء" صفحہ ۲۰۔

باب ۶

حال حال تک دوسرا تھا، چنانچہ تجارت برآمد میں اس کی بحث آچکی ہے اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حالیہ سالوں میں برآمد کی مقدار بہت گھٹ گئی ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم اشیائے خوردنی کی برآمد کے مسئلے پر بحث کریں تو فی الحال اشارہ زیادہ تر چاول ہی کی طرف ہوگا۔ کیا اجناس خوردنی اور خام اشیا کی برآمد قابل مبارکباد ہے یا لایق خوف و ہراس؟ بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ برآمد روز افزوں خوش حالی کی علامت ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک منفعت بخش عالی قیمتوں سے نفع حاصل کر رہا ہے اور اپنی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جو زاید پیداوار بچ رہتی ہے اس کو برآمد کرتا ہے اور اس برآمد سے جو قیمت وصول ہوتی ہے اس سے ارزاں مصنوعات خریدتا ہے جو ملک میں نفع کے ساتھ تیار نہیں کی جا سکتیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق برآمد کی ہوئی مقدار" اس اصلی زائد پیداوار کی نمایندگی کرتی ہے جو عمدہ فصل کے زمانے میں ہندوستان میں اس کی اپنی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد بچ رہتی ہے اور دوسروں کو دی جا سکتی ہے اور ایسے ذخیرۂ محفوظ کا کام دے سکتی ہے جو قحط یا خشک سالی کے زمانے میں مقامی ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔[۲]

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اجناس خوردنی اور اشیائے خام کی برآمد اس مفہوم میں اصلی زاید پیداوار نہیں ہے کہ وہ مقامی ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے کے بعد فاضل مقدار کے طور پر بچی رہتی ہے اور اس لحاظ سے ملک کے حقیقی اغراض کے حق میں مناسب یہ ہوگا کہ بھاری محصول عائد کر کے اس برآمد پر بندش قائم کی جائے یا اس کی ممانعت کر دی جائے۔ چنانچہ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ آبادی کا بڑا حصہ فاقوں بسر کر رہا ہو، ملک کے اجناس خوردنی کی برآمد کو روا رکھنا اور قیمتی اشیائے خام بیرونی ممالک چلے جانے پر مسرور ہونا ایک جرم ہے، اس لیے کہ ملکی مصنوعات کو ترقی دینے کے لیے ان اجناس و اشیا کی ملک کو سخت ضرورت ہے۔

ملہ دالیں، جو، جوار، باجرا، اور مکائی دوسرے اجناس ہیں جن کی برآمد کی جاتی ہے لیکن ان کی مجموعی برآمد کی مقدار مقابلۃً کم ہے۔

۲۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "سلطنت کے معاشی ذرایع" مرتبہ ٹی ورسوک، صفحہ ۱۴۵ (Ecenomic Resources of the Empire)

باب ۷

ان مباحث کے سلسلے میں ہمیں ایک سادہ حقیقت پر زور دینا چاہیے جس کو عام طور پر فراموش کر دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بیرونی ممالک کو اشیا کے برآمد ہونے کے مجرد واقعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ برآمد کرنے والے ملک کے باشندوں کی احتیاجیں برآمد کی ہوئی اشیا کی حد تک بخوبی پوری ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں "اصل زاید پیداوار" کی جو اصطلاح عام طور پر استعمال کی جاتی ہے وہ غلط ہے' اس لیے کہ وہ اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ "نفلی زائد پیداوار" جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ سچ پوچھو تو جملہ زاید پیداوار جو برآمد کی جاتی ہے وہی مقررہ باضابطہ نوعیت رکھتی ہے ؛ یعنی وہ اس واقعے کی بنا پر برآمد کی جاتی ہے کہ برآمد کرنے والے ملک میں مروجہ قیمتوں پر اس کی طلب نہیں ہوتی۔ طلب کا مطلب' جیسا کہ معاشیات کے ہر مبتدی کو معلوم ہے' صرف کسی شے کو اپنے قبضے میں لانے کی خواہش نہیں بلکہ ایسی خواہش ہے جس کی بنیاد ضروری قوت خرید پر قائم ہو۔ اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ گیہوں برآمد کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر انفرادی امریکن کو وہ سب خوراک میسر آتی ہے جس کو وہ صرف کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا ہندوستان میں اجناس خوردنی کی برآمد کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جو پیداوار برآمد کی جاتی ہے اس کی ملک میں کسی شخص کو احتیاج ہی نہیں ہے۔ ہندوستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ موخرالذکر ملک کے مقابلے میں اول الذکر ملک میں ایسی آبادی کا تناسب بدرجہا زیادہ ہے جس کی طلب غذا کے بارے میں پوری نہیں ہوتی۔ گویا یہ فرق مدارج کا ہے نہ کہ نوعی۔ چنانچہ جب مالی کمیشن لال بجھکڑ بن کر ہندوستان سے گیہوں اور چاول کی برآمد کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ "موجودہ قیمتوں پر ہندوستان کی موثر طلب پوری ہو جاتی ہے اور زاید پیداوار برآمد کے لیے بچ رہتی ہے"[۱] تو وہ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو ایک حد تک پوری طرح ٹھیک بھی ہے اور بالکل بےکار و بےسود بھی۔ "موجودہ قیمتوں" پر خواہ وہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ "موثر طلب" ہمیشہ پوری ہوتی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ غذا کی "موثر طلب" کے پورا ہونے کے باوجود ملک کے لاکھوں باشندوں کو پیٹ بھر کر کھانا میسر نہ ہو؛ چنانچہ ہندوستان کی عام طور پر یہی حالت معلوم ہوتی ہے۔

[۱] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۵۵ (Fiscal Commission Report)

باب ۶

اِس صورتِ حال کی اصلاح کے دو طریقے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ اور غیر متعلق نہیں ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اجناس کی قیمتوں میں اتنی کمی کر دی جائے کہ عوام کی ادنیٰ قوتِ خرید ان پر دسترس حاصل کر سکے، اور دوسرا یہ کہ اِن کی قوتِ خرید میں اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ مروجہ قیمتوں پر ان کی طلب موثر طور پر پوری ہو جائے۔

اشیائے خور و نوش کی قیمتوں کو کم کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی برآمد ممنوع قرار دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا برآمد کی ممانعت سے یا بھاری محصول برآمد عاید کرنے سے قیمتیں مطلوبہ سطح تک گر جائیں گی؛ اور اگر ایسا ہوا تو آیا ایسے مصنوعی طریق پر قیمتوں کو کم کرنے سے ملک کی معاشی زندگی پر کوئی نقصان رساں ردِ عمل ہوگا یا نہیں؟

جو لوگ اِس طریقے پر اشیائے خور و نوش کی قیمتوں کو کم کرنے کی کسی ارادی کوشش کے مخالف ہیں وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اجناس کی بجائے ناقابلِ خور و نوش پیداوار مثلاً کپاس، سن، روغندار تخم وغیرہ کی کاشت شروع کر دیں گے، اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جبتک کہ اِن پر بھی بندشیں عاید نہ کی جائیں۔ اور اس طرح ملک کی اشیائے خوردنی کی رسد کو ارزاں بنانے کی کوشش کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ اجناس کی پیداوار گھٹ جائے گی اور آبادی کو کافی غذا مہیا کرنے کے نقطۂ نظر سے صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ ابتر ہو جائے گی۔ 198

ہمیں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ برآمد کی ممانعت یا بھاری محصول برآمد عاید کرنے کا نتیجہ، دوسرے حالات مساوی رہنے کی صورت میں، لازمی طور پر یہ ہوگا کہ اشیائے خوردنی کی مجموعی پیدایش کسی حد تک گھٹ جائے گی۔ اگر رسد بہت تغیر پذیر ہے تو ممکن ہے کہ اس کمی کا یہ اثر ہو کہ ملک میں پہلے سے بھی کم مقدار دستیاب ہو۔ تاہم دوسری جانب یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ رسد میں کسی حد تک کمی ہو جائے گی یہ خیال کرنا قطعی غیر متناقض ہوگا کہ ملکی بازار کے لیے دستیاب شدنی غذا کی زیادہ مقدار بچ رہے گی۔ فرض کیجیے کہ چاول کی مجموعی سالانہ پیداوار ۳۰ ملین ٹن کے منجملہ تین ملین ٹن ہر سال برآمد ہوتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر ۲۷ ملین ٹن گھر یلو صرف کے لیے بچ رہتی ہے۔ اب

باب ۶

اگر قیمتیں گر جائیں اور چاول کی رسد انتہائی طور پر تغیر پذیر ہو تو ممکن ہے کہ مجموعی پیداوار ۲۷ ملین ٹن سے بھی کم ہو جائے، لیکن یہ کسی حال یقینی نہیں ہے کہ مقدار میں اتنی کمی ہو جائے گی البتہ ۲۸ ملین ٹن قرین قیاس ہے اور ایسی حالت میں چاول کی رسد گھریلو بازار کے لیے پہلے کے مقابلے میں ایک ملین ٹن زیادہ دستیاب ہوگی۔ غرض ہم یہ اصول قطعی قرار نہیں دے سکتے کہ ممانعت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں پہلے کے مقابلے میں کم مقدار رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اکثر کسانوں کے لیے یہ بات قابل عمل نہ ہو کہ اپنی زمینوں کو اجناس کی کاشت کی بجائے غیر خوردنی اشیا کے کام میں لائیں۔ لہذا منافع کی کمی کے باوجود یہ ممکن ہے کہ کسان پہلے کی مانند کم و بیش وہی مقررہ مقدار پیدا کرتا رہے۔ چنانچہ ہر اس شخص کو جو ہندوستانی کسان کی حقیقی حالت سے ذرا سی بھی واقف ہو یہ معلوم ہوگا کہ کسان کا اپنی پرانی وضع اور اپنے تنگ راستے کو ترک کرنا کس قدر دشوار اور تبدیلۂ حالات کے مطابق اپنی رفتار میں فوری تبدیلی کر دینا کس قدر دقت طلب ہے۔ پس یہ بعید از امکان نہیں ہے کہ بندش کی پالسی کے نتیجے کے طور پر ملک میں غذائی اشیا کی رسد بڑھ جائے۔

پیداوار کی بے روک ٹوک برآمد کے حق میں ایک اور دلیل جس کا مالی کمیشن نے ذکر کیا ہے،[1] یہ ہے کہ غیر ملکی بازاروں میں یہاں کی پیداوار کی مانگ ہندوستان کو "فاضل پیداوار تیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے جس کا یہاں رہنا خاصکر مقامی فصلوں کی خرابی کے زمانے میں جو آئے دن رونما ہوتی رہتی ہے نہایت اہم و ضروری ہے۔ یہ زاید پیداوار اس لیے تیار کی جاتی ہے کہ غیر ممالک میں اسی کی برآمد اس کے لیے ایک نفع بخش نکاس مہیا کرتی ہے اور اگر یہ نکاس بند ہو جائے تو زائد پیداوار کی تیاری رک جائے گی"۔ لیکن قحط کی کافی امداد کے مسئلے کا انحصار کسی بڑی حد تک اس زاید پیداوار کے میسر آنے پر نہیں ہے جو معمولی سالوں میں برآمد کی جاتی ہے۔ اگر اس زاید پیداوار کو جو معمولاً برآمد کی جاتی ہے برآمد کرنے کے بجائے ملک کی

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۱۵؛ اور کے ال دت کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں اضافۂ قیمت کی تحقیق" صفحہ ۹۸۔

باب ۶ خاص اور فوری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے روک لیا جائے تو قحط کے امدادی کام میں کچھ مدد تو مل سکتی ہے لیکن صورت حال میں کوئی بڑا فرق پیدا نہ ہوگا، اس لیے کہ قابلِ برآمد پیداوار کی زاید مقدار ملک کی مجموعی غذائی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی حقیر ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں ایسا بہت ہی شاذ ہوتا ہے کہ تمام ملک میں ہر جگہ ایک ہی زمانے میں خشک سالی یا قلتِ باراں رونما ہو۔ اور قلت و خشک سالی کے زمانے میں صرف سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسد [sic] ایک ایسے مقام سے جہاں مقابلۃً افراط ہو قحط زدہ مقام کو بعجلت منتقل کی جائے، چنانچہ حکومت کا یہ فخریہ دعویٰ نہایت حق بجانب ہے کہ اس کا بنایا ہوا "قحط کی امداد اور بیمہ" کا طریق کچھ عرصے سے نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف کام کر رہا ہے۔ لہٰذا اس بات پر زور نہیں دیا جا سکتا کہ زاید مقدار کی برآمد کو روک کر قحط کے امدادی کام میں لگانے سے قحط کی مصیبت کو دور کرنے کے لئے جو زائد امداد دی جا سکتی ہے اس کی کسی بھی مفہوم میں شدید ضرورت ہے۔

اس لحاظ سے گو ہمیں ان معمولی دلائل سے اتفاق نہیں ہے جو اجناسِ خوردنی کی بے روک ٹوک برآمد کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں، پھر بھی ہم اس امر سے مطمئن نہیں ہیں کہ بندش کی پالیسی مناسب ہوگی۔ ہم اوپر اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ برآمد کی مقدار مجموعی پیداوار کے قلیل جزو کی نمایندگی کرتی ہے۔ اس طرح اگر اسے ملک میں پوری طرح روک بھی لیا جائے تو بھی، اس کا جو اثر اجناسِ خوردنی کی قیمتوں پر عام طور پر پڑے گا وہ بہت ہی ادنیٰ ہوگا، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ یہ ادنیٰ نفع کسانوں کے نقصان سے حاصل ہوگا۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بندش کی پالیسی کے تحت محض گیہوں کی حد تک ان کا نقصان سولہ کروڑ روپے ہوگا۔[1] ایک اور چھوٹی سی بات جس کی طرف کمیشن نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ زیرِ بحث پالیسی زرعی اصلاح و ترقی پر مضر اثر ڈالے گی۔ اعلیٰ قیمتیں، کسی دوسری جماعت سے زیادہ خوشحال کسانوں کو فایدہ پہنچاتی ہیں۔ اور چونکہ یہی طبقہ ضروری اہلیت اور معلومات رکھتا ہے، اس لیے اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اصلاح و ترقی عمل میں لائے گا۔ ادنیٰ قیمتیں، اس طبقے کی خوشحالی میں کمی کر دیں گی

[1] دیکھو مالی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۱۴؛ نیز دیکھو کتاب ہٰذا صفحہ ۴۱۸۔

باب ۷

اور اس طرح اس میں اس بیش بہا کام کو انجام دینے کی صلاحیت کو گھٹا دیں گی۔ گو اس استدلال کے بارے میں مبالغہ کرنا آسان ہے، لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ بجائے خود معقول ہے۔ اجناس خوردنی کو ارزاں بنانے کا واحد اطمینان بخش طریقہ یہ ہے کہ زراعت کی کارکردگی بڑھائی جائے اور اجناس خوردنی کی پیدائش کو فروغ
200 اور ترقی دی جائے، اگرچہ یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ سردست قیمتوں میں کمی کرنا اس قدر ضروری نہیں ہے جس قدر کہ اضافہ کرنا۔ رہا عوام کی قوت خرید کو بڑھانا جس کی بنا پر وہ کافی غذا حاصل کرنے کے ذرائع پر قابو پا سکیں تو یہ ہمیشہ سرکاری پالیسی کا نہایت ہی قابل قدر نصب العین رہے گا۔

گو ہم اس بات کے حامی نہیں ہیں کہ معمولی زمانے میں اجناس خوردنی کی برآمد پر بندشیں عاید کی جائیں، پھر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے غیر معمولی حالات کا پیدا ہونا ممکن ہے جن کی بنا پر بھاری محصول برآمد کا عائد کرنا ضروری ہو جائے چنانچہ ممکن ہے کہ کسی مقام پر بہت ہی شدید قلت رونما ہو یا کسی دوسرے مقام پر قلت کی وجہ سے ہندوستانی پیداوار کی طلب بہت قوی ہو جائے جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانے میں ہوا، اور اس کے باعث یہ خطرہ رونما ہو کہ قیمتیں اتنی بلندی پر چڑھ جائیں جہاں ان کا رہنا نامناسب و غیر محفوظ ہے۔ سرکاری مداخلت کی صورت میں انتظامی اور دوسری قسم کی دشواریاں پیش آسکتی ہیں، جیسا کہ جنگ عظیم کے زمانے میں ہوا کہ قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی تدابیر کے باعث متعدد دشواریاں پیش آئیں، لیکن ان کے باوجود حکومت کے لیے مداخلتی کارروائی کرنا نہ صرف صورت حال کی اصلاح کی خاطر ضروری ہو سکتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ رائے عامہ مقامی تدابیر اختیار کرنے کا مطالبہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی قلت کے باعث ہندوستان میں قیمتوں کا اضافہ، بیرونی عالمی بازاروں میں اشیا کی برآمد کو خود بخود کم کر دے گا، لیکن قبل اس کے کہ برآمد میں مطلوبہ حد تک کمی واقع ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر مقدار برآمد ہو چکی ہو۔ لہٰذا اگر مقصد یہ ہو کہ اس مقدار کو ملک سے باہر جانے نہ دیا جائے اور اضافۂ قیمت کو روکا جائے تو حکومت کو اس بات کا انتظار کرنے کی بجائے کہ واقعات خود بخود اصلاح پا جائیں گے اسی وقت فی الفور کارروائی کرنی چاہیے

باب ۶ جبکہ اُسے خطرہ محسوس ہو۔[1]

اشیائے خام کی برآمد پر بندشیں

اشیائے خام کی برآمد کے بارے میں ان سب امور کا اعادہ غیر ضروری ہے جو "حقیقی زائد مقدار" کی اصطلاح کی تشریح کے سلسلے میں پیش کئے گئے تھے۔

صنعت میں اشیائے خام کے طور پر کام آنے والی زرعی پیداوار کی آزاد اور بے روک برآمد کے خلاف بہت سے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اولاً یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ چونکہ کپاس، سن اور روغندار تخم جیسی غیر غذائی تجارتی پیداوار کی برآمد سے اعلیٰ قیمت وصول ہوتی ہے، اس لیے غذائی پیداوار کے بجائے غیر غذائی پیداوار بوئی جارہی ہے، اس کی کاشت کے لیے بہترین زمینوں کو کام میں لایا جارہا ہے اور اجناس کی کاشت ادنیٰ زمینوں پر کی جارہی ہے۔[2] پھر بھی اجناس کی کاشت چھوڑ کر تجارتی فصلوں کی کاشت کرنے کے باوجود تجارتی پیداوار کے زیر کاشت مجموعی رقبہ، اجناس کے زیر کاشت مجموعی رقبے کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹا ہے۔[3] 201

یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ غیر غذائی فصلوں کی کاشت کا رقبہ بتدریج اور یقینی طور پر بڑھ رہا ہے اور اس کی وجہ سے اجناس کا زیر کاشت رقبہ کم ہورہا ہے، لیکن مجموعی پیداوار کی حد تک ان دونوں میں جو فرق و عدم مساوات ہے وہ سر دست اجناس کی پیداوار کے بہت زیادہ موافق ہے، اور تجارتی پیداوار کے بڑھنے کے باعث اشیائے خوردنی کی رسد میں کمی اس قدر بعید از امکان ہے کہ فکر و پریشانی

۱۔ "قلت وقحط کے زمانے میں برآمد کو ممنوع قرار دینے کی پالیسی جس پر ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں عمل کیا گیا فائدہ رساں ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اندرون ملک کی قیمتوں میں اضافہ ہونے کی صورت میں بھی برآمد پر کافی روک قائم نہیں کی جاتی اس لیے کہ مالی حیثیت سے پیداکنندے (کسان) سوداگروں سے اور سوداگر برآمد کرنے والوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔" دیکھو آنس ٹے کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۷۱۔

۲۔ دیکھو کے، ال، دت کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۶۶۔

۳۔ دیکھو جدول مندرجہ صفحہ ۲۵۲۔

باب ۶ کی کوئی فوری وجہ نہیں ہے۔ ہماری دانست میں ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ قوم کے غذائی ذرائع کو محفوظ کرنے کی غرض سے کوئی خاص تدابیر اختیار کی جائیں اور تجارتی فصلوں کی پیدائش اور برآمد کی روک تھام کی جائے۔ ہمیں اس واقعے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ تجارتی اشیا کی پیدائش سے ان کسانوں کو معقول منافعہ وصول ہوتا ہے جو اس میں کام کرتے ہیں، چنانچہ ایسی صورت میں جبکہ کسان کو اچھا خاصہ منافعہ وصول ہو رہا ہو اس کی آزادی میں مداخلت کرنے کی سردست ہمارے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

اشیائے خام کی آزاد برآمد کے بارے میں ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ایسی پالیسی کی وجہ سے صنعت میں بطور اشیائے خام کام آنے والی اہم پیداوار مثلاً کپاس، سن، اور روغندار تخم کی قیمت ہندوستانی صناعوں کے لیے اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ غیر ملکی حریفوں کے مقابلے میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ اگر ان کی برآمد پر بندشیں عاید کی جائیں تو ہندوستانی صناع ارزاں اشیائے خام سے فایدہ اُٹھا سکتا ہے اور یہ سہولت غیر ملکی صناع کو حاصل نہ ہوگی۔ گو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نوخیز دیسی صنعتوں کی تامین کرنا ضروری ہے، تاہم اشیائے خام کی قیمتوں کو مصنوعی طریقے پر کم کر کے اس مقصد کو موثر طور سے حاصل کرنا ہمیں مشتبہ معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے کہ مصنوعات کی مجموعی قیمت کے مقابلے میں اشیائے خام کی مجموعی قیمت کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ ضروری تامین کا اس سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہوگا کہ مالی امداد دی جائے اور تامینی محصول درآمد عاید کیا جائے۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ کپاس، سن وغیرہ کی فصلوں کی مسلسل کاشت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین پر بار پڑے گا اور اس کی قوت بتدریج سلب ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ روغندار تخموں اور کھلی کی کثیر مقداریں برآمد خاص طور پر قابل اعتراض ہے۔ زمین کی زرخیزی میں اس لیے انحطاط پیدا ہو جاتا ہے کہ جو چیز اس سے خارج ہو جاتی ہے وہ اس کو واپس نہیں ملتی۔ زمین کی کمزوری کو روکنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ روغندار تخموں پر تامینی محصول برآمد اور کھلی، ہڈی اور مچھلی کے کھاد کی برآمد پر بھاری محصول عاید کیا جائے، ضمناً

باب ۲ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روغندار تخموں کے محصول کی تائید اس بنیاد پر بھی کی جاتی ہے کہ اس کی بدولت مقامی روغن برآری کی صنعت کو بھی ترقی ہوگی۔ رہا زمین کی کمزوری کا معاملہ تو یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا در اصل ایسا ہو رہا ہے یا نہیں[۱]۔ لیکن اگر یہ بھی 202
فرض کر لیا جائے کہ زمین کی قوت میں روز افزوں کمی واقع نہیں ہو رہی ہے تو بھی اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ موجودہ حالات میں جتنا کھاد اس کو دیا جا رہا ہے اس سے زیادہ مقدار میں دینے سے زمین کو بہت فایدہ پہنچے گا۔ غرض اس نقطۂ نظر سے یہ سفارش کی جا سکتی ہے کہ روغندار تخموں اور کھلی پر معتدل قسم کا محصول برآمد عاید کیا جائے، اور اس محصول کے ماحصل کے ایک جزو کو ضروری پروپگنڈا کے کام کے لیے الگ رکھا جائے تاکہ اس قسم کے کھاد کا روز افزوں استعمال یقینی ہو جائے۔ اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ کھاد کی قیمت میں اس حد تک کمی ہو جائے گی کہ اس پر غیر مستطیع کسان کو آسانی دسترس حاصل ہو اور اسی کے ساتھ روغندار تخم بونے والے کو بھی کوئی شدید معاشی ضرر نہ پہنچے۔ زرعی کمیشن، مالی کمیشن کی اس رائے کی حمایت کرتا ہے کہ روغندار تخموں یا کھلی پر محصول برآمد عاید کرنا یا ان اشیا کی برآمد کو سرا سر ممنوع قرار دینا حق بجانب نہیں ہو سکتا[۲]۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے یہ استدلال کیا ہے کہ محصول برآمد کا بار تخم بونے والے کسانوں پر پڑے گا، اس لیے کہ ہندوستان ہی روغندار تخم پیدا کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک نہیں ہے؛ اور یہ محصول کسان کو روغندار تخموں اور کھلی کے خریدار کی حیثیت سے جتنا نفع پہنچائے گا اس سے زیادہ اس کو بونے والے کی حیثیت سے نقصان پہنچائے گا۔ چونکہ روغندار تخموں کی کاشت ہندوستان میں بہت بڑے رقبے پر ہوتی ہے اور ان تخموں میں نائٹروجن بھی ملی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کمیشن کی رائے ہے کہ

۱۔ دیکھو فصل ۱۲ اسی باب میں۔
۲۔ لیکن زرعی بورڈ نے سنہ ۱۹۱۹ میں اور محصول کی تحقیقاتی کمیشن کی اکثریت نے محصول برآمد کی حمایت کی تھی۔

باب ۶ نائٹروجن کی کافی بڑی رسد سہولت کے ساتھ حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ روغن برآری کی صنعت کو ترقی دی جائے۔ گو ہندوستان میں تیل کی مانگ ناکافی ہونے کی وجہ سے اور غیر ملکی بازاروں میں اہل یورپ کی سخت مسابقت کے باعث یہ کام مشکل ہے؛ پھر بھی ہندوستان میں اس صنعت کے امکانات کی احتیاط کے ساتھ تحقیق[1] سود مند ہوگی۔

۱۱۔ پیداوار کی کمی اور اس کے اسباب۔

گو ہندوستان میں زراعت ہی واحد قومی صنعت ہے، تاہم اس کو انتہائی غیر اطمینان بخش طریقے پہ چلایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف فصلوں کی پیداوار فی ایکڑ ان ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جہاں زراعت بدرجہا بہتر طریق پر منظم ہے۔ چنانچہ اس واقعے کی تشریح کے طور پر مندرجۂ ذیل جدول (۱) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹، سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴، اور سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں ہندوستان کی اہم فصلوں کی اوسط پیداوار فی ایکڑ کیا تھی اور جدول (۲) میں یہ بتلایا گیا ہے سنہ ۱۹۲۲ میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کی پیداوار فی ایکڑ کیا تھی۔[2]

203

جدول (۱)

پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ (پاؤنڈ)	پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ پاؤنڈ
صاف کیا ہوا چاول	۷۰۱	۷۹۸	۸۳۴	السی	۲۶۵	۲۷۸	۲۶۱

[1] ۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ (۸۷)۔

[2] ۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں اہم فصلوں کی پیداوار اور رقبے کا اندازہ برائے سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴" صفحہ ۹ تا صفحہ ۱۱ اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے محکمۂ زراعت کا "زرعی سالنامہ" برائے سنہ ۱۹۲۳ء۔

باب ۶

سلسلہ جدول (۱)

پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ (پاؤنڈ)	پیداوار	سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۱۹ (پاؤنڈ)	سنہ ۱۹۲۳ تا سنہ ۱۹۲۴	سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴
گیہوں...	۷۰۷	۶۹۴	۵۸۱	سرسوں اور رائی	۳۰۱	۴۱۶	۳۵۳
نیشکر...	۱۸۹۷	۲۵۴۴	۳۴۵۰	تل	۱۷۴	۱۹۲	۱۹۳
چائے...	۵۶۱	۵۲۸	۴۷۰	مونگ پھلی	۹۹۷	۸۶۷	۹۲۲
کپاس (دھوئی ہوئی)	۷۶	۸۷	۸۴	تخم ارنڈ	×	۲۰۷	۲۰۹
سن...	۱۱۹۵ (سنہ ۱۹۱۸)	۱۱۶۴ (سنہ ۱۹۲۴)	۱۲۹۲ (سنہ ۱۹۳۴)	ربڑ	۱۱۵ (سنہ ۱۹۱۹)	۱۲۱ (سنہ ۱۹۲۴)	۱۴۱ (سنہ ۱۹۳۰)
کافی...	۱۸۳ سنہ ۱۹۱۹ تا ۱۹۲۰	۱۳۹	۱۸۴ سنہ ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳				

باب ۶

جدول (۲)

ملک	گیہوں بشل ۶۰ پاؤنڈ	غلہ بشل ۵۶ پاؤنڈ	جو بشل ۴۸ پاؤنڈ	چاول (پاؤنڈ)	کپاس (پاؤنڈ)	تمباکو (پاؤنڈ)
کینیڈا......	۱۷٫۸	۴۳٫۴	۲۷٫۶	۰	۰	۰
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۳٫۹	۲۸٫۳	۲۴٫۹	۱۰۹۰	۱۴۱٫۰	۷۳۵٫۶
انگلستان.....	۳۱٫۲	۰	۳۱٫۰	۰	۰	۰
ڈنمارک	۳۹٫۰	۰	۴۵٫۶	۰	۰	۰
فرانس.......	۱۸٫۶	۱۶٫۰	۲۳٫۹	۰	۰	۱۴۲۶٫۱
اٹلی......	۱۴٫۱	۲۰٫۲	۱۴٫۳	۲۱۵۱	۰	۹۱۷٫۹
جرمنی.......	۲۰٫۵	۰	۲۵٫۷	۰	۰	۲۶۳۹٫۲ (سنہ ۱۹۲۱ء)
مصر.......	۲۴٫۱	۳۶٫۳	۳۰٫۱	۱۴۵۶ (سنہ ۱۹۲۱ء)	۲۹۹٫۰ ۳۵۲٫۰ (سنہ ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۴ء)	×

سلسلہ جدول (۲)

ملک	گیہوں بشل ۶۰ پاؤنڈ	غلہ بشل ۵۶ پاؤنڈ	جو بشل ۴۸ پاؤنڈ	چاول (پاؤنڈ)	کپاس (پاؤنڈ)	تمباکو (پاؤنڈ)
ہندوستان	۱۳ر۰	۱۵ر۶	۱۹ر۸	۹۱۱	۹۸ر۰	×
جاپان	۲۲ر۵	۲۷ر۷ (سنہ ۱۹۲۱)	۳۱ر۷	۲۴۷۷	×	×
آسٹریلیا	۱۱ر۲	۲۵ر۷	۲۱ر۳ (سنہ ۱۹۲۱)	×	×	×

ہندوستانی کھیتوں کی ادنیٰ پیدآوری کا ذکر کرتے ہوئے سر ایم، وس ویسوریا لکھتے ہیں کہ:۔ "زمانۂ قبل از جنگ کی معمولی بنیاد پر برطانوی ہند کی اوسط پیداوار، بہ شمول ان فصلوں کے جن کے زیر کاشت خطوں کی آبپاشی کی جاتی ہے، پچیس روپے فی ایکڑ سے زیادہ قیمت کی نہیں ہوسکتی؛ لیکن جاپان میں ایک ایکڑ کی پیداوار کی قیمت ڈیڑھ سو روپے سے کم نہیں ہوسکتی۔"ھ

ہندوستان میں ادنیٰ پیدآوری کے اسباب میں سے ایک سبب بارش کی غیر معین نوعیت ہے۔ بارش کی قلت اور غیر ہموار 204

ھ۔ دیکھو سر ایم وس ویسوریا کی تصنیف مولۂ بالا صفحہ ۱۷۴۔

تقسیم کے قطع نظر دوسرے اسباب بھی ہیں مثلاً سیلاب، ژالہ باری، کہر اور دوسرے موسمی تغیرات واختلافات جو پیداوار پر مضر اثر ڈالتے ہیں قلت باراں کی اصلاح ایک حد تک آبپاشی سے ہوجاتی ہے، لیکن دوسری مصیبتوں کو انسانی تدبیر سے پوری طرح رفع نہیں کیا جاسکتا۔ جنگلی جانور، جوہے، ٹڈے اور دوسرے کیڑے بھی بہت نقصان پہنچاتے ہیں، اور مختلف محکمۂ جات زراعت نے ان سے بچاؤ کی تدابیر نکالنے اور ان کو عوام میں مقبول بنانے کی جانب کامیابی کے ساتھ توجہ کی ہے۔

پیداوار کی کمی کی ایک اور وجہ غیر موثر کاشت اور آلات کے بارے میں کاشتکار کی بے سروسامانی ہے۔ اس سلسلے میں جو مسائل رونما ہوتے ہیں ان پر نیز زمین کی انتہائی تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی پر جس سے کھیتی باڑی میں فضول خرچی بڑھتی ہے متعاقب بحث کی جائے گی۔

۱۲۔ کیا ہندوستان میں زمین بتدریج کمزور ہورہی ہے؟

وثوق کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ چند سالوں سے ہندوستان میں غذائی اجناس کی اوسط پیداوار فی ایکڑ کم ہوگئی ہے اور ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے تو بھی اس کو زمین کی کمزوری کا بین وقطعی ثبوت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ غذائی اجناس کی کاشت ادنیٰ زمینوں پر کی جاتی ہو، اور کپاس سن اور روغندار تخموں وغیرہ جیسی تجارتی پیداوار کی کاشت کے لیے بہتر قسم کی زمینیں محفوظ رکھی جاتی ہوں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نہ صرف غذائی اجناس بلکہ دوسری اشیا کی اوسط پیداوار فی ایکڑ زمین کی تدریجی کمزوری کے باعث گھٹ گئی ہے اور ممکن ہے کہ اس خیال کا باعث کسی حد تک یہ واقعہ ہو کہ زرعی پیداوار کی طلب کے اضافے کے ساتھ ساتھ، کاشت میں توسیع عمل میں آئی یہاں تک کہ ادنیٰ ترین زرخیزی والی اور غیر نفع بخش زمینیں بھی اس کے زیر کاشت آگئیں۔ اس کا نتیجہ فطری طور پر یہی ہوگا کہ اوسط پیداوار فی ایکڑ کم ہوجائے گی۔ اس بارے میں کاشتکار کا اندازہ اس وجہ سے

باب ۶ غلط ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی بنیاد ایسے زمانے کی یاد پر قائم کرتا ہے جبکہ صرف بہتر قسم کی زمینیں زیر کاشت تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آبادی کی زیادتی کے باعث امیجادی طور پر غیر مزروعہ و افتادہ رقبوں میں کمی ہو گئی ہو اور اس کے نتیجے کے طور پر نہ صرف بے مزائی زمین میں بلکہ کھاد کی موجود رسد کی کم مقدار پائے ہوئے مزروعہ رقبے میں اضافہ ہوگیا ہو اور اسس کا نتیجہ یہ ہوا ہو کہ زمین کمزور اور خراب ہوگئی ہو۔[۱]

ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے ماہروں کی رائے بظاہر اسس نظریے کے خلاف ہے کہ دور حاضر میں ہندوستان کی زمین ہر سال زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر کلاؤسٹن جو اس وقت حکومت ہند کے زرعی مشیر تھے، اپنی تحریری یادداشت میں جو انھوں نے زرعی کمیشن کے سامنے پیش کی، کہتے ہیں کہ "ہندوستان کے اکثر خطہ ہائے زمین لازمی طور پر صدہا سال پیشتر ہی انتہائی کمزوری اور ادنی زرخیزی کی حالت پر پہنچ چکے ہوں گے اور اگر ان پر آیندہ اور صدہا سال تک کھاد کے بغیر فصلیں بوئی جائیں تو ان کی کمزوری میں 205 مزید اضافہ نہ ہوگا۔ کسی اوسط درجے کی فصل میں تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن فی ایکڑ صرف ہوتی ہے۔ لیکن اس نقصان کی تلافی سال بہ سال ہو جاتی ہے، اس لیے کہ زمین سطلوبہ نائٹروجن ہوا سے اور ان گلی سڑی جڑوں سے حاصل کر لیتی ہے جو فصل کی کٹائی کے بعد زمین کے اندر رہ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اکثر خطے نائٹروجن کی حد تک کمزور نہیں ہیں۔ روتھم اسٹیڈ میں جو دنیا کا سب سے بڑا زرعی تحقیقاتی مرکز ہے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ وہاں کی زمین میں انتہائی ضعف اس وقت تک پیدا نہیں ہوا جب تک کہ اس پر مسلسل چالیس سال تک گیہوں کی کاشت نہیں کی گئی؛ لیکن اس مدت کے بعد بھی اور اس امر کے باوجود کہ کھیت کو کسی قسم کا کھاد نہیں دیا گیا سالانہ پیداوار تقریباً ایک حالت پر ساکن رہی۔ اس لحاظ سے ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک محدود رقبہ ایسا ہے جس کی زمینوں میں

۱۔ زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۷۷)۔

باب ۶

فاسفیٹ کی قلت ہے، لیکن اس کے سوا جو قدیم مزروعہ زمین ہے وہ مدت ہوئی کہ انتہائی ضعف کی حالت کو پہنچ چکی؛ یہ کہ اب پیداوار کی زیادتی کا دار و مدار بارش، معیار کاشت اور کھاد کی نوعیت پر ہے؛ اور یہ کہ صرف نئی زمین یا زمینوں میں جن میں فاسفیٹ کی کمی ہے کاشت کی وجہ سے ضعف پیدا ہو رہا ہے"[۱]۔ ڈاکٹر ووئلکر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جہاں تک عام ہندوستانی زمینوں کا تعلق ہے وہاں تک تخموں، کپاس اور دوسری پیداوار کی برآمد کے باعث زمین کے اجزائے ترکیبی خارج ہو جانے کے بعد اس کو واپس نہیں ملتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین مسلسل کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف نے بھی اس خیال کو مشروط طریقے پر ظاہر کیا، چنانچہ وہ اس واقعے کی جانب توجہ منعطف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر سال جو فصلیں بوئی جاتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اور درخت اور خودرو پودے بھی غذا کے محتاج ہیں اور اپنے لیے نائٹروجن ہوا سے لیتے ہیں[۲]۔ کے، ال، دت جملہ ممکنہ شہادت کو جانچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اعدادی شہادت نہیں ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں زرعی زمین کی زرخیزی میں کوئی تغیر واقع ہوا ہے، خواہ ہم زیر تحقیقات زمانہ ۱۸۹۰ء تا ۱۹۱۲ء لیں یا اس سے بھی زیادہ کوئی طویل زمانہ"[۳]۔

خوش قسمتی سے اس انتہائی فنی معاملے پر کوئی قطعی رائے قایم کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی زمین کی پیداآوری در اصل ادنیٰ ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں زمین کی پیداآوری کی اصلاح و ترقی نہایت اہم ہے، نیز یہ بھی کہ پیداوار کی اصلاح و ترقی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زمین کی اچھی طرح خبر گیری کی جائے اور کافی مقدار میں کھاد دیا جائے۔ محض اس بات کا یقین دلا دینے سے طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتی کہ

---

[۱]۔ دیکھو روئداد شہادت متعلقہ زرعی کمیشن رپورٹ جلد اول جزو اوّل، صفحہ ۲۲۔

[۲]۔ دیکھو دت کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۷۔

[۳]۔ دیکھو دت کی تصنیف صفحہ ۶۸۔

باب ۶ ایک سکونی حالت قایم ہو گئی ہے اور زمین میں ضعف اس لیے نہیں پیدا ہو سکتا کہ وہ کمزوری کی حالت پر بہت پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔ اس کے معنی بہر صورت یہ ہیں کہ حالات
206 اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ ان کے اب بد سے بدتر ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف تلافی اور صورت حال کی اصلاح کرنے کی غرض سے جدو جہد کرنے کی توی وجہ ہمارے لیے ہمیشہ کی طرح موجود ہے۔ اس سلسلے میں زرعی کمیشن اس بات پر زور دیتا ہے کہ کھیتوں اور زمین کے حالات کے بارے میں تحقیقاتی کام انجام دینا ضروری ہے اور یہ سفارش کرتا ہے کہ محکمۂ جات زراعت میں محققوں اور ماہروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور خاصکر جراثیمی طبعی اور نباتی تحقیقات کی غرض سے فن داں افسروں کا تقرر کیا جائے[1]۔

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۸۸)۔

207

باب ۷

زراعت

زمین اور اُس کے مسائل

اس باب میں ہم زمین کے متعلق اہم مسائل پر حسب ذیل عنوانات کے تحت بحث کریں گے:۔

(۱) تقسیم و انتشار اراضی؛ (۲) مستقل اصلاح و ترقی؛ اور (۳) آبپاشی[1]۔

تقسیم و انتشار اراضی

۱۔ متوازن کھیت کا تخیل۔ ہندوستان کی زرعی پسماندگی اور کسان کے افلاس کے جو متعدد اسباب ذمہ دار ہیں ان کے منجملہ ایک سبب زمین کی غیر محدود تقسیم

[1] ۔ حقیت اراضی کے اہم موضوع پر کسی متعاقب باب میں علحدہ بحث کی گئی ہے۔

باب

اور اس کا انتشار ہے۔ صنعت و حرفت کی طرح زراعت میں بھی پیدائش کا ایک مقررہ پیمانہ ہوتا ہے جس سے پیدا کنندے کے نقطۂ نظر سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ایک مقررہ حد کے بعد پیدائش کے پیمانے میں مزید تخفیف کی جائے تو اس کی وجہ سے مصارف اور پیداوار کا تناسب بتدریج زیادہ سے زیادہ ناموافق ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ منافعہ بالکل غائب ہو جائے گا۔ بے شبہ ایسا مقام بھی ہوتا ہے جس سے تجاوز کر کے کھیت کی وسعت میں اضافہ کرنا منفعت بخش نہیں ہوتا؛ لیکن اس کُل بحث کے دوران میں جسے ہم عنقریب شروع کریں گے اس امکان کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے گا کہ ہندوستان کی حد تک یہ کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا۔

۲۔ کاشت کی اکائی اور ملکیت کی اکائی

جس وقت ہم مناسب وسعت کے کھیت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں لازمی طور پر زمین کا وہ رقبہ نہیں ہوتا جو زیرِ ملکیت ہو بلکہ دراصل کاشت کی اکائی ہوتی ہے؛ اگرچہ ہندوستان کے رعیت واری علاقوں میں ان دونوں میں بیشتر مطابقت ہوتی ہے۔ مِل کا قول ہے کہ ''محض اس بنیاد پر کہ ملکی جائداد چھوٹے اجزا میں تقسیم ہے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کھیتوں کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ بڑی جائدادوں کے ساتھ چھوٹے کھیت موجود ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ چھوٹی جائدادوں کے ساتھ بڑے کھیت موجود ہوں؛ اور قبضے یا دخیلکاری کی ذیلی تقسیم، ملکی کسانوں کی تعداد کی زیادتی جب کثرت کا بھی ناگزیر نتیجہ نہیں ہے۔'' لیکن یہ صرف اُس وقت ممکن ہے جبکہ ارث تقسیم نہ کی جائے۔ یا جیسا کہ نکلسن بیان کرتا ہے ''بڑی جائدادوں کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ کاشت وسیع پیمانے پر ہو اور نہ وسیع نظامِ ملکیت کے معنی لازمی طور پر یہ ہیں کہ کاشت چھوٹے پیمانے پر ہو۔ ممکن ہے کہ بڑی جائداد چھوٹے چھوٹے اجزا اور کھیتوں میں لگان یا پٹے پر دی جائے، اور کوئی بڑا کاشتکار پٹے کی زمین مختلف مالکوں سے حاصل کرے۔''[۱]

اگر کسان کا ذاتی کھیت اتنا چھوٹا ہو کہ اس پر کفایت کے ساتھ کاشت نہ کی جا سکتی ہو تو اس کمی کو دوسرے اشخاص سے زائد زمین پٹے پر لے کر

[۱]۔ دیکھو نکلسن کی تصنیف محولۂ بالا جلد اول صفحہ ۱۴۹۔

باب ۴ 203

پورا کیا جا سکتا ہے[1]۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک حد تک ایسا ہی ہوتا ہے اور اسی لیے کھیتوں کی وسعت اور اُس کے معاشی نتائج کے متعلق اعداد و شمار کی تشریح کرنے میں ہمیں اس کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ ہمیں ایسی حالتوں کا بھی لحاظ کرنا چاہیے جن میں کاشت مشترک طور پر ہوتی ہے، ہمیں بلا تحقیق براہ راست یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہر خطۂ زمین جو جدا جدا افراد کی ملک ہے اُس پر کاشت بھی جدا جدا افراد کرتے ہیں۔ گو ممکن ہے کہ اس قسم کا مفروضہ عام طور پر صحیح ہو لیکن ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا۔

ایک اور واقعہ جس سے تقسیم اراضی قریب قریب ہر صورت میں ہندوستان میں منسوب کی جاتی ہے زمین کا منتشر خطوں میں پھیلا ہوا ہونا ہے۔ یہی نہیں کہ کھیت حد سے زیادہ چھوٹا ہوتا ہے بلکہ متعدد حصوں میں منتشر ہوتا ہے اور ایک حصہ دوسرے سے تکلیف دہ فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔

زرعی کمیشن نے تقسیم اراضی اور کھیتوں کے انتشار کے مسئلے پر مندرجۂ ذیل چار عنوانوں کے تحت بحث کی ہے:- (۱) حقوق داروں کے کھیتوں کی ذیلی تقسیم؛ (۲) کسانوں کے کھیتوں کی ذیلی تقسیم؛ (۳) حقوق داروں کے کھیتوں کا انتشار؛ اور (۴) کسانوں کے کھیتوں کا انتشار۔ "حقوق داروں" کی اصطلاح اُن اشخاص کی تعریف کے لیے استعمال کی گئی ہے جو کسی نہ کسی قسم کا موروثی حق زمین کے بارے میں رکھتے ہیں، خواہ مالکوں کی حیثیت سے یا دخیلکار کسانوں یا پٹہ داروں کی حیثیت سے؛ اور "کسانوں" کی اصطلاح میں وہ سب اشخاص داخل ہیں جو مذکورۂ بالا حیثیتوں میں سے کسی ایک حیثیت سے زمین پر کاشت کریں یعنی مالکوں یا پٹہ داروں کی حیثیت سے، یا دخیلکار کسانوں یا اسامی غیر دخیلکار یا مستاجر کی حیثیت سے، لیکن ایسا کسان جس کو اجرت دی جائے اس تعریف میں داخل نہیں[2]۔

اس موضوع کی بحث میں ہمیں اس چیز کے مان لینے میں سہولت معلوم ہوتی

[1] ظاہر ہے کہ کسان کو پٹے پر زمین لینے سے جو معاشی فائدہ ہوگا وہ ذاتی زمین کے مقابلے میں کم ہوگا، اس لیے کہ لگان کی مقدار مقررہ مالگزاری سے زیادہ ہوگی۔

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۱۱۸)۔

باب

جو عام طور پر صحیح ہے یعنی یہ کہ حقوق داروں کے کھیت جس طرح ذیلی اور منتشر اجزا میں تقسیم ہیں اسی طرح کاشت کے خطّے بھی ذیلی اور منتشر اجزا میں منقسم ہیں۔ چنانچہ ایک کی اصلاح جن تدابیر سے ہو سکتی ہے وہی دوسرے کی بھی بڑی حد تک اصلاح کر سکتے ہیں۔

۴۳- تقسیم اراضی اور انتشار کی خرابیاں

بہت ہی چھوٹے رقبے کے کھیت پر کاشت کرنے سے مختلف طریقوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ معمولی کسان کے پاس جو تھوڑا سا ساز و سامان رہتا ہے یعنی ایک جوڑ بیل اور ہل اس سے بھی اُس کی انتہائی قوّت تک کام نہیں لیا جا سکتا۔ خطّے بعض اوقات اس قدر تنگ اور مختصر ہوتے ہیں کہ ہل چلاتے وقت بیلوں کو پلٹانا بھی بمشکل ممکن ہوتا ہے۔ بیلوں کی پرورش اور کسانوں کی ضروریات زندگی کے مصارف وہی مقررہ ہوتے ہیں؛ ان میں اس بنا پر کمی نہیں ہو جاتی کہ اس کا کھیت رقبے میں اس کھیت سے چھوٹا ہے جس پر کاشت کرنے کے لیے اس کا مستقل ساز و سامان مکتفی ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف پیداوار کم مقدار میں وصول ہونا یقینی ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو ایک مقررہ حد کے بعد کھیت کی وسعت کی ہر تخفیف کے ساتھ پیداوار کی قیمت کے مقابلے میں جملہ مستقل مصارف کا تناسب بڑھتا جاتا ہے۔ رہے عارضی اور 209
تغیر پذیر مصارف تو ان میں سے بھی بعض میں خطّے کی وسعت اور رقبے کے تغیر کے ٹھیک تناسب سے تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً کھیت کے اطراف جھاڑی لگانے یا احاطہ بندی کرنے کے فی ایکڑ مصارف احاطہ کردہ رقبے کی تخفیف کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی خطّہ بہت زیادہ چھوٹا ہو تو ممکن ہے کہ بھولے بھٹکے جانوروں سے حفاظت کرنے کی غرض سے باڑ لگانے کے مصارف برداشت کرنا سودمند نہ ہو۔ اور مناسب باڑ لگا کر کھیتوں کو محفوظ کرنے کی عدم قابلیت جملہ کسانوں پر کاشت کا یکساں طریقہ عائد کر دے گی۔ فصلوں کو آس پاس کے اُفتادہ خطوں کے بھولے بھٹکے مویشیوں سے نقصان پہنچنے کے امکان کی وجہ سے کوئی نیا کاشت کا طریقہ یا دوہری فصلوں کا طریق ممکن نہیں۔ اگر باڑ لگانے میں زحمت ہو تو چوکی داروں کو لازم رکھنے میں عام طور پر اور بھی زیادہ زحمت ہوگی۔ ایسی صورت حال حوصلہ مند اور اولوالعزم کاشتکار کے لیے انتہائی طور پر بہت شکن ہوتی ہے۔ چھوٹے کھیتوں کی بڑی تعداد

باب
میں موجودگی کی وجہ سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت بڑا رقبہ بیکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً بہت زیادہ جھاڑی اور باڑ لگانی پڑتی اور راستے بنانے پڑتے ہیں اور اس طریقے سے بحیثیت مجموعی بہت بڑا رقبہ ضایع ہو جاتا ہے۔ انفرادی کھیتوں کی تعداد جتنی کم ہوگی اتنا ہی زیادہ رقبہ کاشت کے لیے دستیاب ہو سکے گا، اور کار آمد زمین کی بچت ہوگی۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ کسی کھیت میں زیر زمین پانی بکثرت موجود ہو، لیکن اس سے اس لیے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا کہ کنواں کھودنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کھیت کے انتہائی طور سے چھوٹے رقبے کے مقابلے میں مصارف کا تناسب حد سے بہت بڑھ جائے گا۔ اگر چار یا پانچ ایکڑ زمین ہو تو کنواں کھودنا مفید و مناسب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر رقبہ صرف ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم ہو تو اس میں کنویں کی کندیدگی مناسب نہ ہوگی۔ چھوٹے کاشتکار کے لیے محنت بچانے والے آلات مثلاً ٹریکٹر کاہنے کی مشین غلہ کا بھوسہ نکالنے اور صاف کرنے کی کل وغیرہ کا استعمال کرنا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ امداد باہمی کی کوئی نہ کوئی شکل یا مشترک سرمایہ یا جدوجہد کی کوئی انجمن نہ ہو۔ لیکن یہ چیزیں آسانی کے ساتھ فراہم نہیں کی جا سکتیں۔ کسی نامناسب طور سے چھوٹے کھیت سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ سب اُس کھیت میں یکجا ہو جاتی ہیں جو چھوٹا ہونے کے علاوہ منتشر بھی ہوتا ہے۔ کھیتوں کے انتشار کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مان کہتے ہیں کہ "اس میں چھوٹے کھیتوں کی ساری خرابیاں اس لحاظ سے موجود ہوتی ہیں کہ اُن میں کلوں اور محنت بچانے والے آلات کو استعمال نہیں کیا جا سکتا؛ اور دوسری جانب بڑے کھیتوں کی ساری خرابیاں اس لحاظ سے موجود ہوتی ہیں کہ ان میں واقعی عمیق کاشت دستی محنت کے ذریعے سے نہیں کی جا سکتی جیسا کہ چھوٹے کھیت والا سہولت کے ساتھ کر سکتا ہے"[۱]۔ اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کے باعث باڑ لگانے کی دشواریاں، آس پاس کے کھیتوں کے بھولے بھٹکے جانوروں اور مویشیوں کے حملے اور مداخلت بیجا سے تحفظ کی دقتیں، اور چوروں کی دستبرد کی مدافعت کی مشکلات عام طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

[۱]۔ دیکھو ان کی کتاب موسوم بہ "دکنی گاؤں کی محنت اور زمین" جلد اوّل صفحہ ۴۸۔

باب

لیکن بعض اور بھی خرابیاں انتشار اراضی کے باعث خاص طور پر رونما ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ ایک یکجائی کھیت کے مقابلے میں اُسی کے مساوی رقبے کے منتشر کھیتوں پر محنت واصل زیادہ صرف ہوتا ہے یعنی مصارف کاشت زیادہ ہوتے ہیں اور پیداوار بھی کمتر وصول ہوتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ۵۰۰ میٹر فاصلے کے لیے 211
دستی محنت اور ہل چلائی کے مصارف میں ۳ ء ۵ فی صد کھاد کی نقل و حمل کے لیے ۲۰ تا ۳۵ فی صد اور فصلوں کی پیداوار کی نقل و حمل کے لیے ۵ء تا ۲۲ فی صد کا اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کھیتوں کا انتشار ان سب صورتوں میں مصارف بڑھا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کاشت میں بھی مزاحمت پیدا کرتا ہے اور دیہی سکونتی خطے سے کھیتوں تک اور پھر ایک کھیت سے دوسرے تک جانے میں بہت سا وقت لگتا ہے اور بہت سی محنت اور بہت سی مویشیوں کی قوت ضائع جاتی ہے۔ کھیتوں کے منتشر ہونے کی وجہ سے کسان کے لیے بظاہر یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ موثر کاشت کی غرض سے اپنے کھیت ہی پر مقیم رہے۔ بالعموم یہ بھی ہوتا ہے کہ کسان وقت بچانے کے لیے دوسرے اشخاص کے کھیتوں میں سے گزر کر قریب ترین راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ سے نیز سرحدوں اور حقوق راہروی کے بارے میں اہلِ دِہ میں لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، اور مقدمہ بازیاں ذریعہ آمدنی بن جاتی ہیں۔ اگر کسان کے سب کھیت ایک ہی جگہ ہوں تو وہ اپنے مویشیوں کو روزمرّہ گاؤں سے کھیت کو لانے لے جانے کے بجائے کھیت ہی پر رکھ سکتا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کو کھاد کی بہت بڑی بچت ہو جائے گی۔ لیکن اراضی منتشر ہونے کی وجہ سے کھاد کو بھی گاؤں کے گھورے سے کھیت تک لے جانا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سا کھاد ضایع جاتا ہے۔ اگر کھیت بہت ہی چھوٹے اور منتشر ہوں تو پانی کافی مقدار میں موجود ہونے کے باوجود آب پاشی عام طور پر ناممکن ہو جاتی ہے۔ کسی انفرادی کسان کے سب چھوٹے چھوٹے منتشر کھیتوں میں پانی بہ آسانی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اگر نالیوں کے ذریعے سے پانی پہنچایا بھی جا سکتا ہے تو دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں سے یہ نالیاں لے جانی پڑیں گی۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ نالیوں کے ذریعے سے پانی پہنچانے اور تقسیم کرنے کی دشواریاں بہت کچھ فساد اور لڑائی جھگڑے کا موجب بنتی ہیں۔

بعض اوقات تقسیم اراضی وانتشار کا متحدہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین پر کاشت کلیتہً موقوف ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر مان[1] ان خرابیوں کو اجمالی طور پر یوں بیان کرتے ہیں کہ "یہ طریقہ جو عملہ منڈی کو فنا کر دیتا ہے محنت کی کثیر مقدار کو ضائع کر دیتا ہے حد بندیوں کے باعث بہت بڑی زمین کا نقصان کر دیتا ہے کھیتوں پر کاشت عمیق کو غیر ممکن بنا دیتا ہے جیسی کہ دوسری صورت میں ممکن ہوتی اور دخیلکار کاشتکاروں یا عمدہ زرعی جائداد کے خریداروں کی حیثیت سے زردار غیر اشخاص کے داخلے کے امکان کو روکتا ہے"[1]

۴۔ تقسیم اراضی وانتشار کے حق میں دلائل۔

یہ خیال نہ کر لینا چاہئے کہ انتشار اراضی کی سب صورتیں نامناسب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کھیت کا ایک ہی جگہ نہ ہونا معاشی لحاظ سے پوری طرح حق بجانب بھی ہو سکتا ہے کھیت کا مختلف منتشر خطوں کی شکل میں ہونا اس لحاظ سے ضروری ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک موسمی تغیرات سے بچاؤ کا ضامن ہوتا ہے۔

"ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ صورت حال پائی جاتی ہے کہ مختلف قسم کی زمینوں کے منتشر کھیتوں میں دو یا دو سے زائد قسم کی فصلیں اس خیال سے بوئی جاتی ہیں کہ اگر ایک فصل بارش کی کمی یا بے قاعدہ تقسیم سے تباہ ہو جائے تو دوسرے کھیتوں سے منفعت بخش پیداوار حاصل ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دوری فصلوں کا دقیق طریقہ جو ہندوستانی طریق کاشت کو مغربی طریق کاشت سے ممتاز کرتا ہے زیادہ تر اس وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ کھیت منتشر ہیں"[2] علاوہ ازیں متنوع فصلوں کی بدولت کسان کو ہر سال اس سے زیادہ زمانے تک کام سے لگے رہنے کا موقع ملتا ہے جتنا کہ ایک یکجائی اور ایک ہی قسم کی فصل کے کھیت پر ممکن ہے۔ ایسے منتشر کھیتوں کی متعدد مثالیں پیش کرنا آسان ہے جن پر معاشی فائدے اور سہولت کے لحاظ سے کام کیا جاتا ہے۔

[1]۔ دیکھو موصوف کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ١٥٤۔

[2]۔ دیکھو معاشی رسالہ موسوم بہ "انڈین جورنل آف اکنامکس" بابت اپریل سنہ ١٩٢٧ء، رادھا کمال مکرجی کا مضمون "کھیتوں کی تقسیم پر"

باب ۷

مثلاً کن کان کے علاقے میں چاول کی زمین کی کاشت اس کو ضروری بنا دیتی ہے کہ خشکی (ورکس) کی زمین کی کچھ مقدار بھی قبضے میں رکھی جائے اور اس لیے دونوں قسم کی زمینوں کی ایک ساتھ موجودگی ضروری ہے۔ علیٰ ہذا گھاٹوں کے بالائی حصے میں خاص کر ساحل دریا پر کسان کے لیے یہ قطعی ضروری ہے کہ اس کے پاس کم از کم ایک چھوٹا سا خطہ "ملئی" یا دریائی مٹی کا بھی ہو۔ یہ خطہ اس کے مویشیوں کے لیے چارہ مہیا کرتا ہے اور دوسرے طریقوں سے مفید ثابت ہوتا ہے پس کھیتوں کے انضمام کی کسی تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان واقعات کا لحاظ رکھا جائے۔[لہ]

اسی طریقے سے اراضی کو ایک خاص حد تک تقسیم کرنے کی حمایت اس لحاظ سے کی جا سکتی ہے کہ وہ زمین کی ملک کی وسیع تقسیم کا اور ایسے ملکی کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت کی تخلیق کا موقع بہم پہنچاتی ہے جو اپنی زمین سے مستقل طور پر وابستہ ہوں چنانچہ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ ایسی تقسیم معاشی و معاشرتی استواری و ثبات پذیری کے لیے مفید ہے۔ اس امر کو ہندوستان کے موجودہ کھیتوں کی توسیع کی تجاویز مرتب کرنے کے سلسلے میں ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ انگلستان کے نمونے پر بڑی جائدادیں اور اصلدارانہ طریق کاشت ہندوستانی حالات کے لیے مناسب نہیں ہے۔ چھوٹے پیمانے کی کاشت کا رواج اور ملکی کاشتکاروں کی ایک قوی جماعت کا قائم کرنا اصلی مقصود اور نصب العین ہونا چاہیئے۔

لیکن ہم جس وقت تقسیم اراضی اور کھیتوں کے انتشار کو مذموم قرار دیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایسی مثالیں ہوتی ہیں جن میں اس قسم کے حق بجانب قرار پانے والے حالات اور مستحسن پہلو مفقود ہوتے ہیں اور خرابیاں ناقابل برداشت حد کو پہنچ چکی ہیں۔

(۷) ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۱) حقوق داروں کے کھیتوں کی تقسیم در تقسیم۔

اب ہم یہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ خرابی جو تقریباً ہندوستان کے طول و عرض میں پائی جاتی ہے کتنی پھیلی ہوئی ہے۔[۲ہ] بہار و اڑیسہ کے گنجان آباد علاقے میں اسامی کے کھیت کا اوسط نصف ایکڑ سے بھی کم ہے اگرچہ فی کسان اوسط ۱۳ء۳ ایکڑ نکلتا ہے۔ 213

لہ۔ ملاحظہ ہو "ایل ڈی جادھو کی تقریر" بمبئی کی مجلس مقننہ میں بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء۔

۲ہ۔ تقسیم اراضی کی خرابی کے سلسلے میں بعض اوقات فی کس آبادی کے حساب سے رقبہ (ایکڑوں) کے اعداد و شمار

باب

بنگال میں زیر کاشت رقبے کا اوسط بہ مشکل ۳،۱ ایکڑ فی کسان ہے۔ وہی حقوق جو کسان اپنی زمین پر رکھتا ہے اور جو اس کے لیے خاص طور پر قانون لگان پنجع کر کے حاصل کیے گئے ہیں کسان کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے چھوٹے اور گھٹیا کھیت سے گھونڈ پھوڑ کی طرح چمٹا رہے اور اس کو بجز آخری چارہ کار کے صنعتی مرکزوں میں کام کی تلاش میں جانے سے روکتے ہیں۔ آسام میں ایک اوسط درجے کا کھیت تین ایکڑ سے زیادہ کا نہیں ہوتا' اس کے برخلاف صوبۂ متحدہ میں وہ صرف ۲،۵ ایکڑ کا ہوتا ہے۔ پنجاب کے ۲۳۹۷ مواضع کی خاص تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ کل کھیتوں میں سے ۱۷،۹ فی صد کا اوسط رقبہ ایک ایکڑ سے بھی کم تھا؛ ۲۵،۵ فی صد حصے کا رقبہ اوسطاً ۱ اور ۳ ایکڑ کے مابین تھا؛ ۱۴،۹ فی صد حصہ ۳ اور ۵ ایکڑ کے مابین تھا؛ اور ۱۸ فی صد حصہ ۵ اور ۱۰ ایکڑ کے درمیان تھا۔ ایک ایکڑ سے کم رقبے کے کھیتوں کی خاص تحقیق کی گئی تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے بہت بڑی تعداد زرعی کھیتوں کی تھی۔ مدراس اور بمبئی میں کھیت کا اوسط رقبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر کھیتوں کا رقبہ ۲ یا ۳ ایکڑ سے بھی کم ہے جس کی وجہ سے موثر کاشت غیر ممکن ہوتی ہے۔ ایک ایکڑ سے کم رقبے کے کھیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سر چونی لال مہتا نے بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون پر بمبئی میں بتاریخ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۲۷ء تقریر کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ مقبوضہ رقبوں کے مقابلے میں ان کھیتوں میں کس قدر تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور یہ میلان ۵ ایکڑ اور اس سے کم رقبے کے کھیتوں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر مان ۱۹۱۷ء میں ضلع پونا کے ایک موضع موسوم بہ پمپلا سوداگر میں ایک کھیت کی اوسط وسعت بظاہر

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ہم برطانوی ہند کے مجموعی زیر کاشت رقبے کو مجموعی آبادی پر تقسیم کریں تو ۱،۳ ایکڑ فی کس سے کچھ زاید خارج قسمت حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ کتنا شدید ہے لیکن اس سے تقسیم اراضی و انتشار کے مسئلے کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر حد سے زیادہ اشخاص کا انحصار ہے لیکن کھیتوں کی تقسیم در تقسیم کا حال براہ راست نہیں معلوم ہوتا۔

۱۴ ایکڑ تھی؛ ۱۸۸۱ء میں ½ ۱۱ ایکڑ تک گر گئی اور ۱۸۹۲ء کے بعد سے بہت زمانے تک غیر متبدّلہ حالت میں ۱۱٫۴ ایکڑ رہی؛ لیکن ۱۹۱۵ء تک ۷٫۵ ایکڑ تک گر گئی۔ ڈاکٹر مآن کہتے ہیں کہ "یہ ظاہر ہے کہ گزشتہ ساٹھ یا ستّر سالوں میں کھیتوں کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ برطانوی دور سے پیشتر اور ابتدائی برطانوی دور میں کھیت عام طور پر اچھی خاصی وسعت رکھتے تھے؛ یعنی اکثر و بیشتر کا رقبہ ۹ یا ۱۰ ایکڑ سے بھی زیادہ ہوتا تھا؛ اور دو ایکڑ سے کم کے انفرادی کھیت بہ مشکل موجود تھے۔ لیکن اب کھیتوں کی تعداد دُگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور ان میں سے ۱۸ فی صد کا رقبہ ۱ ایکڑ سے کم ہے؛ اس کے برخلاف کم از کم ۶۰ فی صد کا رقبہ ۵ ایکڑ سے بھی کم ہے۔"[1]

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۲) کاشت کی ذیلی تقسیم۔

کاشت کی ذیلی تقسیم اور بھی زیادہ نمایاں ہے؛ چنانچہ خالص کاشتکاروں کی تعداد حقوق داروں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ آبادی کی بہت بڑی تعداد دوسرے ذرائع معاش کی عدم موجودگی میں آخری چارۂ کار کے طور پر یا محتاج زندگی کے لیے کھیتی باڑی اختیار کرتی ہے۔ پنجاب میں ۲۲٫۵ فی صد کسان ایک ایکڑ یا اس سے کم رقبے پر کاشت کرتے ہیں؛ ۱۴٫۵ فی صد ۱ تا ۲٫۵ ایکڑ پر؛ ۱۷٫۹ فی صد ۲٫۵ تا ۵ ایکڑ رقبے پر؛ اور ۲۰٫۵ فی صد ۵ تا ۱۰ ایکڑ رقبے پر کاشت کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں فی کسان مزروعہ رقبہ (بحساب ایکڑ) حسب ذیل بتلایا گیا ہے:-

صوبہ	مزروعہ رقبہ	صوبہ	مزروعہ رقبہ
بمبئی	۱۲٫۲	مدراس	۴٫۹
پنجاب	۹٫۲	بنگال	۳٫۱
صوبۂ متوسط و برار	۸٫۵	بہار اوڑیسہ	۳٫۱
برما	۵٫۶	آسام	۳٫۰
		صوبۂ متحدہ	۲٫۵

[1] دیکھو ڈاکٹر مآن کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۴۶۔

باب ۷

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۳) حقوق داروں کے کھیتوں کا انتشار۔

قوانین وراثت کے مطابق جائداد کی تقسیم عمل میں آتی ہے، اور کھیتوں کا انتشار عام طور پر اسی تقسیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس طرح بہت کم کھیت ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خاص بمبئی پریسیڈنسی میں قریب قریب ہر کھیت ۳ تا ۴ خطوں میں تقسیم ہے۔ ڈاکٹر مان نے پمپلا سوداگر کے موضع میں یہ پایا کہ ۱۰۶ مالکوں پر ۲۹ء خطے تقسیم تھے جن کے منجملہ ۴۶۳ خطوں کا رقبہ ایک ایکڑ سے کم تھا، اور ۲۱۱ خطوں کا رقبہ ۱/۴ ایکڑ سے بھی کم تھا۔ زمینداری میں انفرادی خطوں کا رقبہ بعض صورتوں میں (۰۰۶۲۵ء) ایکڑ یا ۱/۱۶ ۳۰ مربع گز ہے؛ پنجاب میں بعض کھیت ایسے پائے جاتے ہیں جو طول میں تو ایک میل سے زاید ہیں لیکن عرض میں چند ہی گز ہیں۔ ایسی صورتوں کا بھی حال معلوم ہوا ہے جن میں انتشار ایسی حد کو پہنچ گیا ہے کہ کاشت سراسر ناممکن ہو گئی ہے۔

۵۔ ہندوستان میں خرابیوں کی وسعت

(۴) کاشت کا انتشار

کاشت کا انتشار کھیتوں کے انتشار سے بھی زیادہ شدید اور وسیع خرابی ہے جو موخرالذکر سے بھی زیادہ انتہائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ڈاکٹر مان نے پمپلا سوداگر میں کسانوں کے کھیتوں میں سے ۶۲ فی صد کے متعلق یہ پایا کہ ان کا رقبہ ایک ایکڑ سے کم تھا اور جاتے گاؤں میں ایسے کھیتوں کا فیصد ۳۱ تھا۔ بقول رام لال بھلا پنجاب کے ایک گاؤں موسوم بہ "پیرام پور" میں یہ پایا گیا کہ ۳۴ء۵ فی صد کسانوں میں سے ہر ایک کے پاس ۲۵ منتشر کھیت تھے۔ یہی صورت حال ملک کے باقی حصے میں بھی عام طور پر پائی جاتی ہے[1]۔

۶۔ تقسیم اراضی و انتشار کے اسباب

اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کی خرابی کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک جذبۂ انفرادیت کی ترقی ہے جو اشتراک خاندانی کے طریقے کی شکست کی ذمہ دار ہے۔ موجودہ زمانے میں مشترک کاشت ویسی عام

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ ۱۱۹ تا ۱۲۲۔

باب

نہیں ہے جیسی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ سرحدی نشان اور حدبندیوں کے ذریعے سے تفریق اور منفرد و جداگانہ کاشت پر اصرار اب سابق زمانے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا ہے۔ اس جذبۂ انفرادیت کو اس بات کی وجہ سے اور زیادہ تقویت پہنچی کہ ہندوستان میں عدل گستری کرنے والے انگریز ججوں نے انفرادی ملکیت اور انفرادی حقوق پر بہت زور دیا۔ علاوہ ازیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندو و اسلامی قوانین وراثت و توارث اور ان سے وابستہ رسم و رواج، تقسیم اراضی و انتشار کے اصلی اور اساسی سبب ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ خاندانی کھیت کی وسعت آبائی ملک کی تقسیم در تقسیم سے کتنی چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن تقسیم
214 اراضی کے ساتھ ساتھ معمولاً انتشار بھی عمل میں آتا ہے؛ اس لیے کہ ہر حصہ دار ایک یکجائی کھیت پر مطمئن و قانع ہونے کے بجائے ہر خطے سے تھوڑا تھوڑا جزو لینے پر اصرار کرتا ہے۔ اس طرح کی تقسیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سب کو پوری طرح مساوی حصہ ملے۔ یہی خیال دَور وسطی کے یورپ کی کھلی کھیتی کے طریقے میں مضمر ہے، جس کے تحت مختلف بھلے برے خطے عمدہ اور خراب موقع محل کے اس لیے ملے ہوئے اور منتشر ہوتے تھے کہ اُن کو منصفانہ طریق پر تقسیم کرنا مقصود ہوتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں یہ بظاہر منصفانہ تقسیم کا طریقہ انتہا کو پہنچا دیا گیا ہے اور اس کا محرک یہ نہیں ہوتا کہ فوائد اور سہولتوں کو مساوی طور پر تقسیم کیا جائے بلکہ عام طور پر رشک و حسد اور بدگمانی کے مذموم محرکات اس کی تہ میں مضمر ہوتے ہیں۔ [1]

---

[1] ۔ اس رسم و عادت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر خطہ اُتنے ہی زیادہ ذیلی خطوں میں تقسیم ہوجاتا ہے جتنے کہ وارث ہیں اور اس طرح منتشر کھیتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور ذیلی حصہ داروں کی تعداد کے مساوی ہوتی ہے۔

[2] ۔ "اس کی کیا وجہ ہے کہ آبادی میں کسی مادّی اضافے کے بغیر نسلاً بعد نسلٍ زمین کا انتشار بڑھتا جارہا ہے؟ وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ تقریباً ہر زراعتی خاندان میں بھائی بھائی میں خوفناک بغض و حسد موجود ہے۔ کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے دے۔ کسی درخت کی شاخ پر شہد ہو تو اس کی تقسیم

باب ۶ اس نظریے کے خلاف کہ قوانین توارث و وراثت اس خرابی کے اصلی طور پر ذمہ دار ہیں، یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ قوانین تو صدہا سال سے موجود ہیں لیکن ان کو جس خرابی کا موجب خیال کیا جاتا ہے وہ ایک حد تک تازہ اور جدید ہے[1]۔ تاہم یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان قوانین کی عدم موجودگی میں زیر بحث خرابیاں موجودہ پیمانے پر رونما ہوتیں۔ قوانین جائداد کے حصہ داروں میں سے کسی کو اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چاہے تو اپنے حصے کو الگ کر لے۔ ممکن ہے کہ تفریق و علیحدگی کی خواہش دوسرے اسباب کی بنا پر پیدا ہو لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کا راستہ قانون نے بتلا دیا ہے۔ ہم جذبۂ انفرادیت کی ترقی کا ذکر کر چکے ہیں کہ بہ زمانۂ سابق کے مقابلے میں اب زیادہ شد و مد کے ساتھ جائداد کی تفریق پر اصرار کرنے کے میلان کے اسباب محرکہ میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ میلان دراصل قوانین توارث و وراثت کے ذریعے سے عملی جامہ پہنتا ہے۔ لہذا یہ کہنے کی بجائے یہ کہ قوانین تقسیم اراضی و انتشار کے اسباب ہیں، یہ کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک آلۂ کار یا ذریعہ ہیں جن کی وساطت سے تقسیم در تقسیم مسلسل عمل میں لائی جاتی ہے۔ ان ذرائع سے کام لینا جبری تو نہیں ہے لیکن ان سے جس وقت کام لینے کو جی چاہے ان پر ہر شخص کو بہ آسانی دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ قدیم زمانے میں ان سے اس قدر جلد جلد اور زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا جتنا کہ موجودہ زمانے میں لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان قوانین کا عملدرآمد "قدیم زمانے میں کھیتوں کی تقسیم در تقسیم کا موقع
215 ہی نہیں دیتا تھا"[2] بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ان کے عملدرآمد کو شاذ ہی روا رکھا جاتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کے پیسے لڑنے میں بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ درخت کی شاخوں اور پھل کے لیے نہیں بلکہ اس کے سایے کی تقسیم کے بارے میں بھی لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔" دیکھو یف۔ جی پنج انڈرسن کی تقریر بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل (مجلس قانون ساز) چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں بتاریخ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء۔

[1]۔ دیکھو واڈیا و جوشی کی تصنیف محولۂ بالا۔ صفحۂ ۲۴۴۔

[2]۔ دیکھو واڈیا اور جوشی کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۲۴۴۔

باب٥

اور مشترک خاندان کا طریقہ عام تھا؛ لیکن جب کبھی اُس کو روا رکھا گیا اُس نے ناگزیر طریقے پر تقسیم در تقسیم کا موقع بہم پہنچایا۔

برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد آبادی کے اضافے کو کبھی ایک سبب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اضافۂ آبادی کے معنیٰ ورثا کی تعداد کے اضافے کے ہوں گے۔ لیکن فی نفسہٖ اس کی وجہ سے تقسیم در تقسیم رونما نہ ہوگی تا وقتیکہ دوسرے اسباب ورثاء کو اس بات پر مجبور نہ کریں کہ وہ قطعی تفریق کا مطالبہ کریں اور مشترک خاندان کے روایات کو اس حالت میں باقی نہ رکھیں جس میں کہ وہ قدیم زمانے میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ جس وقت تک غیر مقبوضہ زمین بکثرت موجود تھی، مثلاً پنجاب کی نہری نو آبادیات میں، اس وقت تک یہ ممکن تھا کہ زائد آبادی کے لیے مقبوضہ زمین کی تقسیم در تقسیم کئے بغیر زمین فراہم کی جائے[1]۔ لیکن جب تقریباً وہ سب زمین قبضے میں آگئی جو بہ آسانی زیر کاشت لائی جا سکتی تھی تو صورت حال مختلف ہوگئی اور تقسیم اراضی سے بچنے کا واحد طریقہ مشترکہ کاشت تھا جس کا رواج، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بتدریج کم ہوتا گیا[2]۔

کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کے باعث دستکاریوں کا زوال بھی اہم اسباب میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس موضوع کے متعلق اپنے خیالات کو واضح کرنے کے لیے ہم اس بعینہٖ سبب کے حقیقی عمل کی تفہیم کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، جو دستکار گاؤں سے وابستہ ہوتے تھے وہ عام طور پر گاؤں کی کچھ زمین پر قابض ہوتے تھے۔ ان میں سے وہ لوگ جن کی حیثیت کل کی بنی ہوئی

---

[1] یہاں "مقبوضہ" سے ہمارا مطلب اس زمین کی ذیلی تقسیم ہے جس پر قبضہ ہو چکا ہے اور اُس اوسط رقبے سے ہے جو ہر حقدار کے قبضے میں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی گاؤں میں نئے نئے چھوٹے مالکوں مثلاً ساہوکاروں اور قرضہ دہندوں کی مداخلت بیجا، جائداد کی اوسط وسعت کو آبائی جائداد کی حیثیت پر اثر ڈالے بغیر کم کر دے۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۱۱۹)۔

[2] بقول اینڈرسن مشترک خاندان کی تحلیل و شکست ۱۸۸۶ء کے بعد سے قانون محصول آمدنی کے عملدرآمد کی بدولت خاص طور پر نمایاں ہوگئی۔ دیکھو بمبئی کی مجلس قانون ساز کے مباحث چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں۔

باب

مصنوعات کی مسابقت کے باعث بتدریج خراب ہوئی وہ آخری چارہ کار کے طور پر زمین کی طرف رجوع ہوئے اور انھوں نے کھیتی باڑی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ چونکہ یہ خاندانی کھیت واحد ذریعۂ معاش بن گیا، اس لیے اس کی اہمیت ان لوگوں کی نظروں میں بہت بڑھ گئی جو اُس پر حقوق رکھتے تھے۔ مشترک کاشت کی پیداوار کو ورثا میں ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کرنے کا طریق غالباً ان لوگوں کو غیر منصفانہ معلوم ہونا شروع ہوا جن کی ضرورتیں مختصر تھیں اور جو اس لحاظ سے مجموعی پیداوار کا قلیل حصہ صرف کرنے تھے۔ اس طریقے سے رشک وحسد کا جو احساس پیدا ہوا اُس نے مشترک کاشت کی تجویز کے خلاف عمل کیا، اور اس کے نتیجے کے طور پر ذیلی تقسیم رونما ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طریقے پر جو زمین متاثر ہوئی ہوگی اس کی مقدار یقیناً
216 چھوٹی رہی ہوگی۔

رہے شہروں میں کام کرنے والے دستکار تو عام طور پر وہ کسی زمین کے مالک ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب وہ کل کی بنی ہوئی مصنوعات کی مسابقت کے باعث بیروزگار ہوگئے اور پیشے سے ہاتھ دھو بیٹھے تو بے زمین مزدور بن گئے۔ اس کو زمین پر آبادی کے دباؤ کے بڑھ جانے کا سبب خیال کیا جا سکتا ہے لیکن تقسیم زمین پر اس کا کوئی براہ راست اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض شہری دستکار دیہات کو منتقل ہوگئے ہوں اور وہاں انھوں نے ایک ایسا چھوٹا خطہ خرید لیا یا کسی دوسرے طریقے سے حاصل کر لیا ہو جو یا تو شروع ہی سے غیر معاشی تھا یا قانون توارث کے عملدرآمد کے باعث رفتہ رفتہ غیر معاشی بن گیا۔ لیکن یہ غیر اغلب ہے کہ جو دستکار اپنے ابتدائی پیشے کے غیر منفعت بخش ثابت ہونے کی وجہ سے زمین کی جانب رخ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ان کے پاس اتنی کافی پس انداز کردہ رقم یا کافی اعتبار تھا جس کی بنا پر وہ زمین خریدنے کے قابل تھے۔ بہرحال تاوقتیکہ اس طرح حاصل کی ہوئی زمین کی نوعیت ابتداءً کسی بڑے خطے کے جزو کی نہ ہو ذیلی تقسیم کی حد تک صورت حال پہلے کی طرح غیر متبدلہ رہی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر نئی زمین زیر قبضہ آئی تو اس کی وجہ سے سابقہ کھیتوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہوگا، اور کھیتوں کی ذیلی تقسیم جس حالت میں موجود تھی اُس میں مزید تقسیم نہ ہوئی ہوگی۔ اس لحاظ سے بحیثیت مجموعی

باب ہم یہ بیان کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ گھریلو صنعتوں کے زوال کا نتیجہ بڑی حد تک
یہ ہوا کہ بے زمین مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا؛ لیکن اس کا اثر تقسیم اراضی اور کھیتوں
کے انتشار پر بہت زیادہ نہ پڑا۔ تاہم جس حد تک کہ دستکار پیشہ ترک کر کے اسامی بن گئے
اس حد تک قابل زراعت زمین کے بارے میں ان کی طلب کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوا ہوگا
کہ کاشت کی حد تک اور زیادہ تقسیم اور انتشار عمل میں آیا ہوگا۔
لیکن دو چیزوں کے درمیان علاقہ سببی قائم کیا جا سکتا ہے؛ یعنی ایک تو
اضافۂ آبادی کے تناسب سے صنعت کی توسیع و ترقی کا فقدان اور دوسرے کھیتوں
کی تقسیم در تقسیم اور اراضی کا انتشار اگر موجودہ زمانے میں آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ
صنعتوں میں بھی معقول و معتدبہ ترقی ہوتی تو زمین کی زائد آبادی اُن میں جذب ہو جاتی۔
اگر کسی خاندان میں اتنا اضافہ ہو جاتا کہ اُس کے کھیت پر اُس کا گزارہ مشکل ہو جاتا تو
خاندان کے بعض ارکان صنعتی مرکزوں کو منتقل ہو سکتے اور باقی ارکان کو خاندانی کھیت
پر کاشت کرنے اور اپنی محنت کا پھل پانے چھوڑ جاتے۔ اس صورت میں گاؤں ترک
کرنے والوں کا حق خاندانی کھیت پر باقی رہتا۔ لیکن اگر صنعتوں میں کام کرنے سے اُن کو
معقول ذریعۂ معاش میسر آتا تو وہ خاندانی کھیت کی آمدنی میں اپنے حق سے دستبرداری
کے لیے تیار ہو جاتے اور باقی ارکان کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ بدقسمتی
سے ایسی ترقی ظہور پذیر نہیں ہوئی؛ آبادی بڑھتی گئی اور زائد آبادی صنعتوں میں منتقل ہونے
کی بجائے سیلاب کی طرح زمین ہی کی طرف رجوع ہوئی اور مشترک خاندان کی بندشوں
کی گرفت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے نیز علحدگی کے میلانات کی ترقی کے باعث قانون وراثت 217
سے مدد لینے کا طریقہ روز بروز زیادہ عام ہوتا گیا۔ اس طرح کافی حیرت انگیز طریقے پر
جوں جوں معاشی مجبوریوں کا دباؤ بڑھتا گیا لوگ ایسا طریق کار اختیار کرتے گئے جس کا نتیجہ
پریشانی کو کم کرنے کی بجائے بڑھانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس وقت زمین ہی واحد
ذریعۂ معاش تھی۔ اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے نہایت منفعت بخش طریقے پر
کام لینے کی اور بھی زیادہ وجہ تھی۔ لیکن زمین سے انتہائی غور اور احتیاط سے کام لینے کی بجائے
نہایت بے احتیاطی کے ساتھ اور خودکشی کے انداز میں اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے
گئے۔

باب

غرض مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کے اصلی اسباب اضافۂ آبادی اور اس کے مقابل میں صنعت میں توسیع نہ ہونا، اشتراکِ خاندانی کی شکست اور جذبۂ انفرادیت کی ترقی کو خیال کرنا چاہیئے جن کو قوانین توریث و توارث نے مزید تقویت پہنچائی۔

جس وقت کوئی خرابی ناقابل برداشت حد کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی کچھ نہ کچھ اصلاحی صورت بھی از خود رونما ہوسکتی ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ انتہائی چھوٹا کھیت یا تو فروخت ہو جائے یا مالک کی طرف سے پٹے پر دے دیا جائے۔ لیکن اس قسم کی مثالیں کافی بام نہیں ہیں اور اصل سوال کو کسی قابل لحاظ حد تک متاثر نہیں کرتیں۔ اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ خرابی شدید صورت میں موجود ہے اور اس کے ممکنہ علاج یا اصلاح کی بحث شروع کرنی چاہیئے۔

۷۔ غیر ممالک میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔

یہ مسئلہ کسی حال ہندوستان سے مخصوص نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا اور انھوں نے اس کو مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ فرانس، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، جرمنی، ڈنمارک اور جاپان جیسے ملکوں کے تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ملکی کاشتکاروں کے باہمی ارادی معاہدات، یکجائی اور معقول رقبے کے کھیتوں کے قائم کرنے کے ضامن نہیں ہوتے اور یہ کہ اسی لیے وضع قوانین کے ذریعے سے اصلاح کرنی ضروری ہے۔ چنانچہ اکثر متعلقہ ملکوں میں اس قسم کے قوانین وضع اور اختیار کیے گئے ہیں اور اُن کی تہ میں حسب ذیل اُصول مضمر ہیں:- (١) موجودہ کھیت کے قابضوں کی جبری بے دخلی؛ (٢) زمینداروں کے ایک حصے کے مشورے سے یا بعض صورتوں میں اس کے بغیر کھیتوں کی از سرِ نو تنظیم و ترتیب؛ (٣) جدید قائم شدہ کھیتوں کو آیندہ کے لیے ناقابلِ تقسیم قرار دینا؛ (۴) کھیتوں کو قرضوں کے سلسلے میں قرقی یا ضبطی سے مستثنیٰ کرنا؛ اور (۵) دوسرے کھیتوں کے ساتھ جدید قائم شدہ کھیت کے الحاق کو روکنا۔[1]

[1] دیکھو کیٹنگ کی کتاب موسومہ بہ "بمبئی دکن میں دیہی معیشت" صفحہ ۵۲ تا ۵۳۔

باب

۸۔ معاشی کھیت کا مفہوم۔

حال میں ہندوستان میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مسئلے کو اختیاری طریق پر اور جبری قانون کے ذریعے سے حل کیا جائے خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا گیا ہو، ایک سوال جس سے ہمیشہ دوچار ہونا پڑتا ہے یہ ہے کہ "معاشی کھیت" کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے جواب میں
218 متعدد تعریفیں پیش کی گئی ہیں کیٹینگ کے خیال میں "معاشی کھیت" سے مراد "ایک ایسا کھیت ہے جو کسی شخص کو اتنی پیداوار حاصل کرنے کے قابل بنائے جو اس کی اور اس کے خاندان کی پرورش مناسب آرام کے ساتھ کرنے اور ضروری مصارف زندگی ادا کرنے کے لیے کافی ہو" چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "دکن میں مثالی معاشی کھیت ۴۰ یا ۵۰ ایکڑ کی مناسب اور یکجائی زمین پر مشتمل ہوگا جس میں آبپاشی کے لیے کم از کم ایک عمدہ کنواں اور ایک مکان موجود ہو۔ حالات کے لحاظ سے مختلف علاقوں میں مناسب رقبہ مختلف ہوگا۔ چنانچہ ضلع سورت میں اگر کسی باغبان کے پاس تین ایکڑ زمین ہو تو اُس کی اور اُس کے خاندان کی زندگی آرام سے بسر ہوسکتی ہے۔ اس کے برخلاف دکن کے خشک علاقے میں جہاں زمین کی زرخیزی ادنیٰ ہے تیس ایکڑ بھی مشکل کفایت کرسکتے ہیں۔ مثالی معاشی کھیت اور بدیہی طور سے غیر معاشی کھیت کے درمیان متعدد مدارج ہیں۔ لیکن کسی ایک خطے کے بارے میں معیار مقرر کرنا مشکل نہ ہوگا"[۱]
ڈاکٹر مان معاشی کھیت کی تعریف یوں کرتے ہیں "ایک ایسا کھیت جو ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے ایک اقل ترین معیار زندگی پر جو اطمینان بخش خیال کیا جائے روزگار مہیا کرے"[۲] اسٹینلی جیونس صوبۂ متحدہ کے حالات کے لحاظ سے ایک معیاری کھیت کے لیے تقریباً تیس ایکڑ کا رقبہ مناسب خیال کرتے ہیں۔ وہ کاشتکار کے لیے "اقل ترین معیار زندگی" تو کیا "مناسب معیار زندگی" بھی کافی نہیں سمجھتے بلکہ "اعلیٰ معیار زندگی" چاہتے ہیں۔
اس سوال پر مزید غور و بحث کرنے سے پیشتر یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ معاشی کھیت

---

[۱] دیکھو کیٹنگ کی محولۂ بالا تصنیف صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۳۔
[۲] دیکھو مان کی تصنیف محولۂ بالا جلد دوم صفحہ ۴۳۔

باب کی تعریف مختلف اعتبارات سے مختلف ہوگی۔ مثلاً یہ کہ آیا ہمارے پیش نظر مجموعی خام پیداوار ہے یا خالص پیداوار، آیا وافر اصل مہیا ہو سکتا ہے یا اس کی مقدار محدود ہے وغیرہ۔ علاوہ ازیں تعریف کا انحصار زرعی پیدائش کے طریقوں کی نوعیت پر بھی ہوگا یعنی اس بات پر ہوگا کہ کاشت عمیق ہو رہی ہے یا کاشت وسیع، زمین کی زرخیزی کی کیا کیفیت و حالت ہے، آبپاشی کی سہولتیں موجود ہیں یا نہیں اور کتنی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

اتنی تفہیم کے بعد ہم "معاشی کھیت" کی اصطلاح کی پوری طرح تشریح و توضیح کی کوشش کریں گے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے زمین کا ایسا رقبہ مثالی کھیت ہو سکتا ہے جس میں یہ خاندان اپنی مقدور کے مطابق اپنے اصل اور محنت کو نہایت نفع بخش طریقے پر لگا سکے۔ ہر قسم کے عاملین کو جانچنا اور ملحوظ رکھنا پڑے گا، چنانچہ دستیاب شدنی اصل و محنت یا اس کے ایک جزو کو زراعت کے سوا دوسرے کاموں میں لگانے کے امکان کو بھی خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ زراعت اور دوسرے پیشوں میں اصل و محنت کی تقسیم "مساوی اختتامی حاصل" کے اصول کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ اصل و محنت کی ہر اکائی سے جو زراعت میں لگائی جائے امکانی حد تک بیش ترین خالص پیداوار حاصل ہو۔

لیکن عام طور پر جو مفروضات قائم کیے جاتے ہیں ان میں سے بعض ہندوستان
کے اصلی حالات کے تحت صادق نہیں آتے؛ خاصکر یہ مفروضہ کہ محنت، زراعت اور 219
دوسرے پیشوں کے درمیان گاؤں کے اندر یا باہر کامل طور پر نقل پذیر ہوتی ہے، اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ دیہی صنعتیں مفقود ہیں اور شہروں میں مصنوعات تیار کرنے والی صنعتوں نے ناکافی ترقی کی ہے۔ جہاں تک ہندوستانی حالات کا تعلق ہے، ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ایک اوسط درجے کے کسان کے خاندان کو جتنی محنت پر دسترس حاصل ہو سکتی ہے وہ زراعت کے سوا دوسرے پیشوں میں عملاً ناقابل انتقال ہوتی ہے اور یہ کہ وہ غیر مشروط طریقے پر صرف زراعت ہی کے لیے دستیاب ہو سکتی ہے۔

اگر ہم اعداد و شمار کے ذریعے سے مثال کو واضح کریں تو معاشی کھیت کا تصور بآسانی

باب سمجھ میں آسکتا ہے۔

ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اوسط درجے کا خاندان پانچ ارکان پر مشتمل ہے اور محنت کی اکائی وہ محنت ہے جو یہ خاندان مہیا کر سکتا ہے[1] علیٰ ہذا یہ بھی مان لیجیے کہ اصل کی اقل ترین اکائی کی تعریف میں بیلوں کی ایک جوڑ اور ہل داخل ہے۔ یہ مفروضات ہندوستان کے مروجہ حالات کے عین مطابق ہیں۔ اب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اس خاندان کے قبضے میں پانچ ایکڑ زمین کا ایک خطہ ہے جس پر اصل و محنت کی موجود مقدار لگا کر کاشت کی جائے تو ۱۵۰ روپے کی مجموعی خام آمدنی وصول ہو سکتی ہے۔ اس آمدنی میں سے ۴۰ روپے بیلوں کی پرورش کے مصارف اور دوسرے مصارف بقدر ۲۰ روپے منہا کر لیجیے۔ اس کے بعد خاندان کو خالص آمدنی ۱۵۰ - ۶۰ = ۹۰ روپے وصول ہوگی۔[2] یہ مان لیجیے کہ ایک ہل، بیلوں کی ایک جوڑا اور کاشتکار کے خاندان کی محنت سے ۲۰ ایکڑ زمین پر اطمینان بخش طریق پر ہل جوتا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اس خاندان کے قبضے میں ۵ ایکڑ کی بجائے ۲۰ ایکڑ زمین ہو تو نتیجہ حسب ذیل برآمد ہوگا۔ مجموعی خام آمدنی = ۶۰۰ روپے، بیلوں کی جوڑ کے مصارف پرورش حسب سابق ۴۰ روپے، متفرق مصارف تقریباً ۸۰ روپے یعنی پہلے کے مقابلے میں چہار گونہ (گو اس بات کا امکان ہے کہ دوسرے مصارف میں رقبے کے اضافے کے ٹھیک تناسب سے کم اضافہ ہو)۔ ان سب مصارف کو منہا کرنے کے بعد خالص آمدنی ۶۰۰ - ۱۲۰ = ۴۸۰ روپے بچ رہتی ہے۔

فرض کیجیے کہ ایسے چار خاندان ا، ب، ج اور د ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ۵ ایکڑ زمین ہے اور ہر خاندان الگ الگ کاشت کر رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ۶۰ روپے صرف کرے گا، یعنی ۴۰ روپے بیلوں پر اور ۲۰ روپے متفرق مصارف۔ لہٰذا ہر ایک کو ۱۵۰ روپے مجموعی خام آمدنی اور ۹۰ روپے خالص آمدنی وصول ہوگی۔

---

[1] "ہندوستان میں معاشی زندگی کی اکائی خاندان ہے نہ کہ فرد" دیکھو جیک کی تصنیف موسوم بہ "ایک بنگالی ضلع کی معاشی زندگی" صفحہ ۸۰۔

[2] یہ اعداد و شمار خالصتہً بطور مثال پیش کیے گئے ہیں چنانچہ ان اعداد کو دوسرے اعداد سے بدل دینے سے استدلال پر کسی قسم کا اثر نہ پڑے گا۔

باب ۸

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ سب مل کر ۲۰ ایکڑ کے اس کل رقبے پر مشترکہ طور پر کاشت کرنے کا تہیہ کریں تو اس صورت میں وہ تین جوڑ بیلوں کو نکال کر بھی کام چلا سکتے ہیں، اور اس طرح اس مد میں ان کو ۱۲۰۰ روپے کی مجموعی بچت ہو جائے گی۔ اگر محنت کی مقدار وہی مقررہ فرض کی جائے، یعنی صرف ایک خاندان کی محنت، جیسی کہ پہلے لگائی گئی تھی تو اُن کو اب ۶۰۰ روپے کی مجموعی آمدنی وصول ہوگی جس میں سے
220 ۴۰ روپے بیلوں کے مصارف اور ۸۰ روپے متفرق مصارف منہا کرنے کے بعد خالص آمدنی ۴۸۰ روپے وصول ہوگی۔ گویا ہر خاندان الگ الگ اپنی ۵ ایکڑ زمین پر کاشت کرتا تو ہر ایک کو ۹۰ روپے خالص آمدنی وصول ہوتی، لیکن اس صورت میں ۱۲۰ روپے وصول ہوگی۔ اس طرح ہر خاندان کی آمدنی بڑھ جائے گی، گو کہ بحیثیت مجموعی جو محنت لگائی گئی وہ اب پہلے کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی ہے، اس لیے کہ ہمارے مفروضے کے مطابق ایک خاندان جتنی محنت مہیا کر سکتا ہے اس سے پوری طرح کام لینے کے لیے ۲۰ ایکڑ زمین کی ضرورت ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زائد محنت جو بچ رہی اُس کو کیا کیا جائے، اس کو بدل کے طور پر کسی دوسرے پیشے میں نہیں لگایا جا سکتا اس لیے کہ ہمارے مفروضے کے مطابق کوئی دوسرا پیشہ موجود ہی نہیں ہے۔ گویا انتخاب صرف زرعی کام اور بیکاری کے درمیان رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں کچھ زائد محنت کو زمین پر بخوبی لگایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے نتیجے کے طور پر پیداوار میں بھی کچھ اضافہ ہو، گو ممکن ہے کہ یہ اضافہ محنت کی زائد اکائیوں کے تناسب نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ محنت کی زاید اکائیوں کے لگانے سے مجموعی خام آمدنی میں ۲۰۰ روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ گویا صورت حال یہ ہوگی:۔ مجموعی خام آمدنی ۸۰۰؛ جملہ مصارف ۱۲۰ روپے لہذا خالص آمدنی ۶۸۰ روپے ہوگی۔

ہم اب ان صورتوں کو بہ لحاظ ترتیب خوبی پیش کریں گے:۔

م سے مطلب محنت کی ایک اکائی (یعنی ایک اوسط خاندان)

ا سے مطلب اصل کی ایک اکائی (یعنی ایک ہل اور بیلوں کی ایک جوڑ)

پہلی صورت ۔ ۱م + ۱ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۴۸۰ روپے؛ آمدنی

باب۵

فی رکن خاندان = ۴۸۰/۵ = ۹۶ روپے۔

دوسری صورت۔ ۴ م + ۱ ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۶۸۰ روپے؛ آمدنی فی کس = ۶۸۰/۲۰ = ۳۴ روپے۔

تیسری صورت۔ ۴ م + ۴ ا + ۲۰ ایکڑ؛ خالص آمدنی ۳۶۰؛ آمدنی فی کس = ۳۶۰/۲۰ = ۱۸ روپے۔

گویا بہترین نتیجہ اس وقت برآمد ہوتا ہے جبکہ ۲۰ ایکڑ کے رقبے پر محنت و اصل کی ایک ایک اکائی لگائی جائے۔ بس یہی "معاشی کھیت" ہے۔ اس مثالی کھیت میں زمین، محنت و اصل جس تناسب سے لگائے گئے ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے تناسب سے لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کھیت غیر معاشی یا غیر منفعت بخش ہوں گے اور پیداکنندوں کی آمدنی فی کس گھٹ جائے گی۔ گویا غیر معاشی کھیت کے عاملین پیدائش کے تناسب کو بدل کر مثالی کھیت کی نسبتوں کے جتنا جتنا قریب لیا جائے گا اتنا ہی زیادہ غیر معاشی کھیت، معاشی کھیت بنتا جائے گا۔ پیداکنندوں کے نقطۂ نظر سے پہلی صورت سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں، بشرطیکہ زمین خاندانوں کی زائد محنت کو زراعت کے سوا کسی دوسرے منفعت بخش پیشے میں لگایا جاسکتا ہو۔ لیکن اگر حالات اس قسم کے ہوں کہ کُل خاندانوں کو بلا شرکت غیرے ۲۰ ایکڑ زمین ہی پر انحصار کرنا پڑے تو، دوسری صورت کا انتظام بہترین ہوگا۔ اس لیے کہ پہلی صورت میں چاروں خاندانوں کو بحیثیت مجموعی خالص آمدنی ۴۸۰ روپے اور اس کے برعکس دوسری صورت میں ۶۸۰ روپے وصول ہوتی ہے۔ پھر بھی اس سے اس واقعے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ 221
پہلی صورت ہی میں محنت، زمین و اصل کا تناسب بہترین اور مثالی ہے۔ اس طرح اگر چاروں خاندان کام کریں تو بہترین ترکیب ۴ م + ۴ ا + ۸۰ ایکڑ ہوتی۔ لیکن چونکہ صرف ۲۰ ایکڑ زمین دستیاب ہوسکتی ہے اس لیے اس کے بعد کی بہترین ترکیب اختیار کرنی پڑے گی جیساکہ صورت دوم میں کیا گیا۔ غرض اس سے ضمنی طور پر یہ واقعہ ثابت ہوتا ہے کہ مشترکہ کاشت زمین پر انتہائی دباؤ کی خرابی کو ایک حد تک رفع کردیتی ہے۔

یہ معلوم ہوگا کہ معاشی کھیت کی تعریف کے مسئلے پر غور کرنے کا یہ طریقہ اس طریقے

کے مقابلے میں کم قابلِ اعتراض ہے جو مذکورۂ بالا مروّجہ تعریفوں میں سے بعضوں کی باب
تہ میں مضمر ہے۔ "معقول آرام" "اقل ترین معیار" اور "اعلیٰ معیار" یہ سب مبہم اور گنجلک اسلوب بیان ہے۔ اگر اس کے برعکس ہم یہ کہیں کہ جو مقصد حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ زمین، محنت و اصل کی باہمی نسبت اس طرح قائم کی جائے کہ اس سے پیداکنندوں کو عظیم ترین ممکنہ فائدہ حاصل ہو تو دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ عظیم ترین معاشی فائدہ کسان کو بہت ہی اعلیٰ معیار زندگی برقرار رکھنے کے قابل بنائے یا اقل ترین معیار کے لیے بھی جو چیز ضروری خیال کی جائے اُس کو پورا نہ کر سکے۔ مثلاً یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا پہلی صورت کی آمدنی ۹۶ روپے فی کس عمدہ معیار راحت کے لیے کافی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہی اعلیٰ ترین مقدار ہے جو حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ زمین، محنت اور اصل کی بہترین ممکنہ ترکیب قائم کرنے کے باوجود نتیجہ پوری طرح اطمینان بخش نہ ہو۔ اس کے لیے دوسرے اصلاحی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے؛ مثلاً طریق پیدائش کو زیادہ موثر بنانا، فروخت کے لیے زیادہ سہولتیں پیدا کرنا وغیرہ۔ "معاشی کھیتیوں" کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رعیت کی حیثیت و حالت کو صرف اس حد تک جس حد تک کہ ایک مخصوص طریقے سے اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے درست کیا جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ مناسب وسعت کے کھیت پر اُس کو قبضہ دلایا جائے۔ باقی یہ اُمید رکھنا بیکار ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا طریقہ رعیت کی مشکلات کا کامل حل نہیں ہے؛ بلکہ یہ صرف اُن طریقوں میں سے ایک ہے جن کے ذریعے سے صورت حال کی اصلاح ضروری ہے۔[1]

[1] لیکن بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کھیتوں کے انتہائی طور پر چھوٹے ہونے کی خرابی خیالی اور فرضی ہے اور یہ کہ کھیت اس مفہوم میں غیر معاشی نہیں ہیں کہ وہ بہت زیادہ چھوٹے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے غیر معاشی ہیں کہ وہ کسان کے لیے اس قدر بڑے ہیں کہ وہ اُن کی کافی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اُس کو اصل کی اس قدر کم مقدار پر دسترس حاصل ہوتی ہے اور اُس کا عام ساز و سامان اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ کھیت کے

۹۔ اصلاحی تدابیر اب ہمیں ان اصلاحی تدابیر پر غور کرنا چاہیے جو ہندوستان میں تقسیم اراضی وانتشار کی خرابی کو رفع کرنے کے لیے اب تک اختیار یا تجویز کی گئیں۔ محکمۂ امداد باہمی کی سرپرستی میں پنجاب میں امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرکے منتشر کھیتوں کو ایک شیرازے میں منظم کرنے کے دلچسپ تجربے کا آغاز سنہ ۱۹۲۰ تا سنہ ۱۹۲۱ میں کیا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ کے ختم تک تقریباً تیس ملین کے کل مزروعہ رقبے میں سے تقریباً تقریباً ۶۲۳۴ ، ۲۶۳ ایکڑ زمین کو از سر نو تقسیم کیا گیا ہے۔ مصارف کا اوسط ۲ روپیہ ۵ آنے فی ایکڑ رہا۔[لہ] اس تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں امداد باہمی کے اصول کی سختی سے اتباع کی جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے حقدار کو جو سوءِ ظن اور ناواجب خوف وہراس ہوتا ہے اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ترغیب وتحریص اور مستقل مزاجی کے ساتھ پروپیگنڈا ہی واحد آلۂ کار ہیں۔ کھیتوں کے انضمام واتصال کا نتیجہ جس حد تک کہ اس کو عمل میں لایا گیا پوری طرح مفید برآمد ہوا ہے۔ زمین زیادہ پیداآور ہو گئی ہے جو رقبے سابق میں انتہائی انتشار کی وجہ سے غیر مزروعہ تھے ان پر کاشت شروع ہو چکی ہے۔ مقدمہ بازیوں اور لڑائی جھگڑوں میں کمی اور اصلاح وترقی کی خواہش قوی اور نمایاں ہو گئی ہے۔ چنانچہ صوبۂ پنجاب بعض اعتباروں سے اس قسم کی امداد باہمی کی جدوجہد کے لیے خاص طور پر موزوں ہے جس کے نتیجے کے طور پر انضمام واتصال اختیاری اور غیر جبری طریق پر عمل میں آرہا ہے۔ اوّل تو یہ کہ زمین اور آبادی دونوں کے لحاظ سے پنجاب کے دیہات میں زیادہ یکسانی پائی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ نہری نوآبادیات میں زمین کو زیر کاشت آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے اس لیے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ رقبے میں زیادتی اُس کی مشکلات کو بڑھا دیتی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس کا بدیہی علاج یہ ہوگا کہ متوسط درجے کے کھیت کے رقبے میں مزید کمی کی جائے۔ لیکن ابھی تک اس کی سفارش کرنے کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ بے سروسامانی اور اُس کے نتیجے کے طور پر افلاس خود ایک حد تک کھیت کے بہت چھوٹا ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس میں توسیع کرنا گویا اُس کی پیداوار کی قیمت کو بڑھانا ہے۔ اگرچہ اس اشد ضروری اصلاح کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ضروری ہے کہ معمولی کسان کے پاس اصل کی کمی کی مجبوری کو رفع کرنے کے لیے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کی جائے۔

لہ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ میں" صفحہ ۱۰۶، اور انڈین ایر بک بابتہ سنہ ۱۹۳۹ صفحہ ۳۹۰۔

باب۸

ان میں کھیتوں کی تنظیم زیادہ آسان ہے۔ تیسرے یہ کہ مقابلۃً سادہ حقیت اراضی بھی انضمام میں سہولت بہم پہنچاتی ہے[1] لیکن بہترین حالات کے تحت بھی اس تحریک کی رفتار کا بہت سست ہونا یقینی ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ مستقبل میں انضمام کو برباد نہیں کیا جائے گا۔ پنجاب کا تجربہ صرف انتشار اراضی کے مسئلے کے بارے میں عمل میں لایا گیا اور اس کا مقصد تقسیم اراضی کو روکنا نہیں ہے۔ خود پنجاب کے عہدہ داروں مثلاً ایچ کیلورٹ، ایم۔ ایل ڈارلنگ، اور سی۔ ایف اسٹرک لینڈ نے شاہی زرعی کمیشن کے روبرو اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کھیتوں کے بکثرت انتشار کے مضر اثرات و نتائج سے کسانوں کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آئین و قوانین وضع کر کے ان پر کسانوں کو عمل کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اختیاری عمل کے قانون کی آزمائش ہندوستان میں ہو چکی اور وہ ناکام ثابت ہوا۔ چنانچہ بڑودہ میں اس قسم کا قانون وضع کیا گیا، لیکن، جیسا کہ سر مانو بھائی مہتا نے اپنے صدارتی خطبے میں، جو بمبئی کی صوبہ داری، امداد باہمی کی کانفرنس میں ۱۹۲۶ء میں

223 پڑھا گیا تھا، تسلیم کیا ہے، قانون محض مجموعۂ ضوابط میں درج ہے اور تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اختیاری عمل کی تجویز مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ناکام رہی اور اسی لیے وہ جبری قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوئے۔

پنجاب کی نہری نوآبادیات میں غیر کے ہاتھ جائداد منتقل کرنے پر بندشیں عائد کر کے اور بعض عطیات کی حد تک ترکے کو ایک ہی وارث تک محدود رکھ کر تقسیم اراضی کو روکا گیا ہے۔ لیکن اس کی مدد سے کاشت کی تقسیم در تقسیم کو روکنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

مسلمانوں کے لیے مصری رواج کی سفارش کی گئی ہے جس کی رو سے زمین گو عام طور پر ورثا میں تقسیم کر دی جاتی ہے لیکن جملہ ورثا کی جانب سے کسی ایک شخص کی

---

[1] لیکن زرعی کمیشن قطعی طور پر یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ پنجاب میں جو کام انجام پا رہا ہے اس کے متعلق یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ دوسرے صوبوں کے لیے ناموزوں ہے اور بہت ہی احتیاط و استقلال کے ساتھ معاشی مشکلات کی تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیئے۔

باب۵ نگرانی میں کاشت کی غرض سے دیدی جاتی ہے یا امینوں کے سپرد کر دی جاتی ہے کہ وہ انتظام کریں۔ رہے ہندو تو ان کے لیے کسی تقسیم و تسہیم کے بغیر موروثی کھیت کی مشترکہ کاشت کے طریق کی حمایت کی گئی ہے۔

حکومت کا محض غیر معاشی کھیتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا کافی نہیں ہے، جیسا کہ بمبئی کے تجربے سے ثابت ہوا۔ "مشترکہ رپورٹ"، جس پر بمبئی کا رعیت واری نظام مبنی ہے اس کے مرتب کرنے والوں کو یہ خوف ہوا کہ مبادا اراضی کی تقسیم در تقسیم کی خرابی رونما ہو۔ لہذا ضابطہ مالگزاری میں دفعہ (۹۸) کو شریک کرنے کے وہی ذمہ دار تھے، جس کی رو سے کوئی سروے نمبر (پیمائش کردہ خطہ) ایک مقررہ اقل ترین رقبے سے جو زمین کی مختلف قسموں کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً مشخص کیا جائے چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ شرط اقل ترین مقررہ حد سے اوپر زمین کی تقسیم اور علیحدہ خطوں کے طور پر اُس کی ملکیت کو روکنے میں غیر موثر ثابت ہوئی۔ عدالتوں نے ایسی تقسیم کو جائز تسلیم کیا اور اس لحاظ سے دفعہ (۹۸) کو منسوخ کرنا پڑا۔ چنانچہ آجکل کتابچۂ حقوق چھوٹی سے چھوٹی تقسیم کے وجود کو بھی تسلیم کرتی ہے۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں مسٹر کیٹنگ نے، جو اُس وقت بمبئی کے محکمۂ زراعت کے ناظم تھے، ایک مسودۂ قانون اس غرض سے مرتب و پیش کیا کہ زمینداروں کو اس قابل بنایا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو مستقل معاشی کھیت قائم کریں اور اُن کو آیندہ کسی بنا پر بھی ذیلی حصوں میں تقسیم نہ کیا جا سکے، نیز انتظامی حکومت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ غیر مقبوضہ سرکاری زمین کے بارے میں یہی نتائج حاصل کرے۔ لیکن چونکہ اس مسودے پر محکمہ جات عدالت و مالگزاری کے متعدد عہدہ داروں نے جن کے یہاں یہ مسودہ بغرض اظہار رائے بھیجا گیا تھا اُس پر مخالفانہ نکتہ چینیاں کیں، اس لیے اس کارروائی کو یہیں ختم کر دینا پڑا۔ سب سے اہم اعتراض یہ تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے معاشرتی نظام کے خلاف چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم کھیت کثیر تعداد میں قائم ہو جائیں گے اور یہ کہ ایک بے زمین ادنیٰ طبقہ وجود میں آئے گا جو ایک ایسے ملک میں جہاں صنعتیں اس قدر کم ترقی یافتہ ہوں کہ اُن میں زائد زرعی آبادی کی کھپت نہیں ہو سکتی خاص طور پر خطرناک ثابت ہوگا۔[1]

---

[1] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف ۱۲۳۔

باب ۸ صوبہ متوسط میں کھیتوں کے انضمام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک خاص عہدہ دار کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ صوبہ بمبئی کی مجلس قانون ساز نے بھی ایک قانون "کھیتوں کے انضمام" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں منظور کیا جس کا نفاذ ابتداءً صرف علاقہ
224 چھتیس گڈھ میں ہونے والا تھا۔ اُس کی رو سے منتقل حقداروں میں سے کم از کم نصف کو جن کے پاس گاؤں کے مقبوضہ رقبے میں سے کم از کم ⅔ حصہ تھا' انضمام کی تجویز میں شریک ہونے کا اختیار دیا گیا اور اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد اُس کی پابندی گاؤں کے جملہ حق داروں اور اُن کے ورثا پر لازم ہو جائے گی۔ بنک کاری کی تحقیق کی مرکزی کمیٹی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ تین سال سے کچھ زائد مدت میں جس میں یہ قانون نافذ رہا ۲۰۵ گاؤں اس قانون سے مستفید ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے' ۴۷ گاؤں کا تصفیہ کیا گیا' اور نسبتہً قلیل سرکاری مصارف سے جملہ ۱۵۶۵۰۰ ایکڑ زمین کا انضمام عمل میں آیا جو پہلے ہزاروں چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں تقسیم تھی[1]۔

۱۰۔ بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کا مسودۂ قانون بابتہ ۱۹۲۷ء۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء میں چھوٹے کھیتوں کا مسودۂ قانون آنریبل سر چونی لال مہتا نے بمبئی کی مجلس قانون ساز میں پیش کیا۔ اس مسودے کے ابتدائی جزو میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ مقامی حالات کے لحاظ سے ایک معیاری اکائی کے مقرر کرنے کا انتظام کیا جائے اور اس اکائی میں وہ اقل ترین رقبہ ہو جس پر علٰحدہ خطے کے طور پر منفعت کے ساتھ کاشت کی جا سکے۔ اور اس حد سے نیچے کے جملہ کھیت اجزا قرار دیے جانے والے تھے۔ مسودۂ مذکور کا مقصد یہ تھا کہ قدیم ٹکڑاوں کی مزید ذیلی تقسیم کو اور نئے ٹکڑے قائم کیے جانے کو روکا جائے اور کھیتوں کے اتصال کو ترقی دی جائے۔ موجودہ منتشر خطوں پر گو مالک کاشت کر سکتے تھے' لیکن اُن کو کسی دوسرے کے ہاتھ اس طریقے پر منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا جس سے ان میں مزید انتشار پیدا ہو۔ منتشر کھیتوں کا انتقال اُس وقت تک جائز نہ تھا

[1] دیکھو مرکزی بنک کاری کی کمیٹی کی رپورٹ شائع شدہ ۱۹۳۱ء پیرا گراف (۷۱)۔

باب ۸

جب تک کہ اس کی بنا پر منتشر کھیت یکجا نہ ہو جائیں۔ معیاری اکائی کے مقرر کیے جانے کے بعد جو نئے کھیت وجود میں آئیں ان کی حد تک جملہ انتقالات کا حق شفعہ ہمسایہ مالکوں یا پٹے داروں کے لیے مرجح تھا۔ گو کسی کو نئے منتشر خطے کا قابض بننے سے روکا نہیں گیا تھا، پھر بھی اس پر اس وقت تک کاشت نہیں کی جا سکتی تھی جب تک کہ ملحقہ خطے یا خطوں میں وہ شریک نہ کر لیا جائے تاکہ اس طرح جو مجموعی رقبہ زیر کاشت آئے وہ یا تو معیاری اکائی کے مساوی ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے۔

مسودے کے دوسرے جزو کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ منفعت بخش کاشت کی غرض سے موجودہ منتشر خطوں کا انضمام کیا جائے۔ چنانچہ اس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ کلکٹر کی تحریک پر کسی گاؤں یا رقبے کے لیے تجویز مرتب کی جا سکتی تھی، بشرطیکہ کم از کم $\frac{2}{3}$ خطوں کے قابض اور متاثرہ زمین کے کم از کم نصف حصے کے مالک اس تجویز کے مرتب کرنے پر راضی ہوں۔ اس تجویز کا نفاذ ایک خاص عہدہ دار انضمام کے ذریعے سے عمل میں آنے والا تھا جو متعلقہ گاؤں کے تین نمایندوں کی مدد سے یہ کام انجام دینے والا تھا۔

۱۱۔ مسودۂ مذکور کے بارے میں بحث مباحثہ۔ 223

اس مسودے میں کسی حد تک جبر کا عنصر موجود تھا۔ لیکن بقول اسٹینلی جیونس "یہ ایک حیرت انگیز اور نہایت ہی اہم عمرانی واقعہ ہے کہ وہ قوانین اور رسم و رواج جو تملیک و استعمال زمین کی تنظیم کرتے ہیں معاشرے کی کسی دوسری امتیازی خصوصیت کے مقابلے میں قائم و باقی رہنے کا زیادہ قوی میلان رکھتے ہیں، اور اس لحاظ سے ان میں بجز قانون کی ناقابل مقاومت قوت کے کسی دوسرے خارجی عمل کے ذریعے سے تغیر و تبدل کرنا دشوار ہے"[1]۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مسودۂ مذکور قانون وراثت اور ان اصول میں مداخلت کرتا تھا جن پر ہندوستان کی خاندانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس کا یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ قانون وراثت میں اس وجہ سے مداخلت نہ ہوتی تھی کہ مسودے

---

[1] چنانچہ مجلس مقننۂ بمبئی کے مباحث میں اکتوبر ۱۹۲۷ء میں سر چونی لال مہتا نے اس قول کا حوالہ دیا۔

باب

کی رو سے مفادات کی علٰحدگی کو روا رکھا گیا تھا گو ایک مقررہ حد کے بعد جائداد غیر منقولہ کی کاشت کے لیے دراصل طبیعی طور پر ذیلی تقسیم جائز نہ تھی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "مسودۂ مذکور نے اس قانون میں تغیر" کرنے کی بجائے جس پر تفریق و تقسیم مبنی تھی طریق تقسیم و علٰحدگی میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی؛ بہر حال قانون تو انسان کا بنایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا اگر یہ معلوم ہو کہ وہ مائل بفساد و شر ہے تو اُس کو رفع کرنے کی واحد معقول تدبیر صرف یہ ہے کہ اس کو بدل دیا جائے۔

لیکن اس مسودے کے بارے میں اکثر جو اعتراض سنائی دیتا تھا وہ یہ تھا کہ اس کی وجہ سے بہت سے کسان بے دخل ہو جائیں گے اور بے زمین مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ یہ اعتراض اس مفروضے پر مبنی تھا کہ معیاری کھیت کا رقبہ اتنا مقرر کیا جائے گا جو کسان کے موجودہ متوسط درجے کے کھیت سے بہت بڑا ہوگا۔ لیکن مسودۂ مذکور کا مقصد یہ تھا کہ "معاشی کھیتوں" کی بجائے "منفعت بخش کھیت" وجود میں لائے جائیں۔ چنانچہ معیاری اکائی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ ایسا اقل ترین رقبہ جو معاشی کھیت نہ ہو تو کم از کم نفع بخش کاشت کے لیے ضروری ہو۔ ہماری بیان کردہ تعریف کے مطابق معاشی کھیت جتنا ہونا چاہیے اُس سے بہت چھوٹا کھیت بھی نفع بخش ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن معلوم ہوتا تھا کہ جہاں معاشی کھیت کا رقبہ ۲۰ ایکڑ ہوگا وہاں معیاری اکائی کا رقبہ کم و بیش ۳ یا ۴ ایکڑ مقرر کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس مخصوص قانون کے نفاذ کے نتیجے کے طور پر دراصل بہت کم لوگوں کو زمین الگ کرنی پڑتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ معیاری اکائی کے لیے بہت ہی معمولی رقبہ تجویز کیا گیا تھا تو بھی اس کا قرینہ تھا کہ ان لوگوں میں سے اکثر جنھیں نئے قانون کے تحت پٹہ یا فروخت کے ذریعے سے زمین کو الگ کرنا پڑتا وہی لوگ ہوتے جن کے کھیت اس قدر چھوٹے تھے کہ صرف ان ہی پر گزارہ کرنا ممکن نہ تھا اور جو اس لحاظ سے ہمہ وقتی کسان نہ تھے۔ جو کچھ بھی چھوٹے کھیت اُن کے قبضے میں تھے وہ اس لحاظ سے نقصان رساں تھے کہ وہ ایسے پیشے میں مناسب توجّہ مرتکز کرنے کی راہ میں مزاحم تھے جو ان کسانوں کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش تھا۔ ان حالات میں قابض کا

باٹ 226

اس میں زیادہ فائدہ ہوتا کہ وہ اپنی زمین کو ذیلی پٹے پر دے دیتا گویا وہ محض اس خطّے کا مالک رہ کر بھی فائدہ اٹھاتا اور خود کاشت کر کے نقصان اُٹھائے اور وقت ضائع کرنے سے محفوظ رہتا۔[1]

مسودۂ مذکور کے نقادوں نے اس امکان کو بھی نظر انداز کر دیا کہ یہ مسودہ بے احتیاطی کے ساتھ تقسیم در تقسیم کرنے کے حق میں حوصلہ شکن ثابت ہوتا، اور اس طرح ملکیت کو ساقط کرنے کا سوال اکثر صورتوں میں رونما ہی نہیں ہوتا۔ اگر تقسیم و تفریق کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خاندانی کمیت مقررہ اقل ترین رقبے سے چھوٹے خطوں میں تقسیم ہو جاتا تو، اس پر چند مجوزہ قانونی پابندیاں عائد کر دینے کے بعد لوگ تقسیم کی کوشش سے باز رہتے۔ کھیتوں کو تقسیم کرنے کے بعد بھی مشترکہ طور پر کاشت کرنے کا طریقہ زیادہ عام ہو جاتا جس میں پیداوار کی تقسیم ہوتی اور زمین کی تقسیم عمل میں نہ آتی۔ یہ مسودہ ایک ذیلی منتخب کمیٹی کے حوالے کیا گیا جس نے مئی ۱۹۲۸ء میں رپورٹ پیش کی اور اس مسودے کو زیادہ مناسب اور قابل قبول بنانے کے لیے چند جزوی ترمیمیں بھی پیش کیں۔ لیکن کونسل کے اندر اور باہر سخت مخالفت کی وجہ سے مسودے کو غیر معیّن مدّت کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔ مخالفت اس غلط فہمی کی بنا پر کی جا رہی تھی کہ مسودہ منظور ہو جانے کے بعد ملکیت کو بڑے پیمانے پر ساقط کرنا پڑے گا۔ اس غلط خیال کو رفع کرنے کے لیے مسٹر بی' ڈی' جادھو نے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ خود مسودۂ قانون میں معیاری اکائی کی تعریف کر دینا مناسب تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ تجویز کی کہ باغات کی زمین کے لیے ۱۰ گُنٹے (¼ ایکڑ) نہری کی زمین (چاول کی کاشت) کے لیے ۵ گنٹے، مالی (دریا کے کنارے کی) زمین کے لیے ۵ گنٹے اور خشکی کی زراعت کے لیے ۴۰ گنٹے مقرر کئے جائیں۔[2] گو یہ اکائیاں مقامی حالات کے لحاظ سے غالباً ہر جگہ موزوں نہ ہوتیں، پھر بھی اُن کی

۱۔ دیکھو یف۔ جی۔ یچ اینڈرسن کا رسالہ جو بمبئی کے چھوٹے کھیتوں کے مسودۂ قانون کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

۲۔ دیکھو منتخب کمیٹی کی رپورٹ دربارۂ مسودۂ قانون نمبر (۱۶) بابتہ ۱۹۲۸ء، صفحہ ۶۔

باب ۶

یہ رائے مناسب و معقول تھی کہ عوام کے سوءِ ظن کو رفع کرنے کے لیے کچھ اطمینان دلانا قطعی طور پر ضروری تھا۔ اگر مسودے کے حامی اس کی حقیقی نوعیت کو عوام پر واضح کرتے اور ان کی تفہیم کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اور منظم جد و جہد کرتے تو اس مسودے کو غالباً زیادہ تائید حاصل ہوتی۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا اس لیے جس حالت میں وہ پیش کیا گیا تھا اُسی حالت میں اُس کو کسی معقول شنوائی و سماعت کے بغیر واپس لے لینا پڑا۔

آخر میں زرعی کمیشن کے اس انتباہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ تقسیم اراضی و انتشار کے مسئلے کو حل کرنے میں بہت احتیاط درکار ہے اور متاثرہ اشخاص کی رائے اور اُن کے میلانات کا انتہائی ممکنہ لحاظ بھی ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ جبر کا عنصر ایک حد تک ناگزیر ہو، لیکن یہ خیال نہ کر لینا چاہیئے کہ جبر، عوام کے خیالات و خواہشات پر نہایت احتیاط کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ جبر کو انضمام کی مجوزہ تجویز کی ممکنہ طور پر سب سے آخری منزل کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے، اور اس کا استعمال آبادی کی اکثریت کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے جن کی راہ میں ممکن ہے کہ ایک ضدی اقلیت بصورت دیگر رکاوٹ پیدا کرے۔ حکومت کو پروپگنڈا کا کام اپنے ذمے لینا چاہیئے، اور مشکلات اور دشواریوں کو جد و جہد سے باز رہنے کا عذر نہ بننے دینا چاہیئے۔ جہاں کہیں انضمام اختیاری قانون کے تحت رائج
227 کیا جائے وہاں حکومت کو تدریجی طریقے پر عمل کرنا چاہیئے۔ خاص خاص رقبوں کو منتخب کر کے اختیاری قانون کے تحت اعلان یا اشتہار دینا چاہیئے اور کسی جبری طریقے کو رائج کرنے سے پیشتر حقداروں کی رائیں دریافت کر لینی چاہئیں۔[1]

ہم اوپر یہ بات قطعی طور پر تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر آئینی تدبیر خواہ وہ کتنی ہی معتدل کیوں نہ ہو، اگر اراضی کی تقسیم در تقسیم اور کھیتوں کے انتشار کی موجودہ انتہائی مشکل کی اصلاح کے لیے اختیار کی جائے گی تو اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اسقاط ملکیت یا بے دخلی لازمی طور پر ہوگی۔ اور گو ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ جو لوگ اس طرح

۱۔ زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۱۲۷)

باب ۶

اپنی زمین کو الگ کرنے پر مجبور ہوں گے ان کی حالت نہ صرف مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر بلکہ اس وجہ سے بھی پہلے سے بہتر ہو جائے گی کہ کھیتوں کا رقبہ بڑھ جانے کے معنے زیادہ سرسبز زراعت اور مزدوروں کے لیے زیادہ کام نکلنے کے ہوں گے؛ تاہم خاص تدابیر اختیار کرنا مناسب ہوگا تاکہ بے دخل کیے ہوے قابض جلد کسی منفعت بخش اور اہم دو کام میں جذب ہو جائیں۔ لہذا اسی غرض سے زراعت کی اصلاح و ترقی کو وسعت دینی چاہیے؛ جہاں کہیں ممکن ہو آبادکاری کی تجاویز کو روبعمل لانا چاہیے؛ دیہی صنعتوں کو جو زراعت سے حتی الامکان قریبی تعلق رکھتی ہوں ترقی دینی چاہیے؛ اور صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا چاہیے۔

مستقل اصلاح و ترقی

۱۲۱۔ مستقل اصلاح و ترقی کا فقدان اور اُس کے نتائج۔

مغربی و ہندوستانی کاشتکاری میں جو نمایاں فرق و اختلافات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان میں زمین کی مستقل اصلاح و ترقی تقریباً بالکل مفقود ہے۔ بمبئی دکن کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بارے میں بھی کم و بیش صادق آتے ہیں کیٹنگ کہتا ہے کہ مغربی حصے میں پہاڑیوں کے ڈھالوں پر چھوٹے مالکوں نے احتیاط اور محنت کے ساتھ زینہ نما کھیت بنا لیے ہیں کہیں کہیں کسی خوش نصیب خطے میں آبپاشی کے کنوئیں موجود ہیں، اور کھیتوں پر کسانوں کے کچھ گھر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن میدانوں کے بیشتر حصے کو انسان نے ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا ہے؛ چنانچہ ارد گرد باڑ یا پشتے تو دور کنار آبپاشی کا تک انتظام نہیں ہے اور نہ ان میں انسان یا جانور کے لیے پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے۔[1]

[1] دیکھو کیٹنگ کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۱۰۷۔

باب ۲

مناسب باڑوں کے نہ ہونے سے فصلیں جنگلی خنزیر، بھٹکے ہوئے مویشیوں اور کھیت چرانے والوں کے رحم و کرم پر رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے سرحدوں کے جھگڑے الگ ہوتے ہیں اور مویشیوں کو اکٹھا کرنے اور فصلوں کی نگرانی میں بھی بہت محنت صرف ہوتی ہے۔ ہوا کو روکنے والی دیوار یا باڑ نہ ہونے کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے جھونکے کپاس جیسی فصلوں کو بہت کچھ نقصان پہنچاتے ہیں۔ گو انفرادی طور پر اور امداد باہمی کے اصول پر مناسب باڑ لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ
228 کرنا باقی ہے۔ کھیتوں میں پشتے تو نام کو نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کانٹ چھانٹ اور چھیل چھال کی وجہ سے بہت سی مٹی ضائع ہو جاتی ہے اور کاشتکار کو نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں زمین میں مناسب ڈھال نہیں رکھا جاتا اور نہ اُس کو اس طریقے پر مسطح کیا جاتا ہے کہ پانی یکسانی کے ساتھ جذب ہو سکے۔ زائد پانی کو نالیوں کے ذریعے سے خارج کرنے کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں، نتیجہ یہ کہ پانی گڈھوں میں جمع ہو جاتا ہے، اور اگر بدرو بنائے بھی جاتے ہیں تو دوسرے اشخاص کی زمینوں پر پانی بہنے لگتا ہے اور اُن کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ "دریائے جمنا کے بائیں کنارے ہزاروں ایکڑ قیمتی زمین نالوں کا جال بچھ جانے کی وجہ سے تباہ ہو گئی، اور جن دیہات کے اطراف کسی زمانے میں زرخیز کھیت تھے وہ اب بیکار نالیوں کے جال میں گھرے پڑے ہیں۔"[1] بالائی سطح کے پانی کے بہنے کا مناسب انتظام کرنے سے یہ سب خرابیاں رفع ہو جائیں گی، فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہو گا اور سوتوں کی سطح بلند ہو جانے کی وجہ سے کنویں سال بھر کارآمد رہیں گے۔[2]

عام طور پر دیکھا جائے تو مطلوبہ پیمانے پر کھیتوں کے پشتوں اور مضبوط باڑ کا انتظام انفرادی کسان کے بس سے باہر ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس بات کی

---

[1] دیکھو ڈاکٹر کلاؤسٹن کی یادداشت، زرعی کمیشن کی رپورٹ کی روئداد شہادت میں جلد اوّل، صفحہ ۱۲۔

[2] دیکھو ہاورڈ کی تصنیف محولہ بالا صفحہ ۱۴۔

باب ضرورت ہے کہ زمین کی اصلاح و ترقّی کی مشترکہ تجاویز اختیار کی جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت قرضہ بطور تقاوی آزادی کے ساتھ منظور کرے اور خاص ماہر عہدہ داروں کے تقرر کے ذریعے سے فنی نگرانی اور مشورہ مہیا کر کے اس کام میں مزید مدد بہم پہنچائے۔ بعض صوبہ واری حکومتوں نے جدّت دکھا کر پشتوں کے بارے میں خاص عہدہ داروں کا تقرر کیا ہے۔ کھیتوں پر سائبان یا باڑہ کا نہ ہونا بھی بہت بڑی خرابی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف نگرانی مشکل ہو جاتی ہے بلکہ انسان اور مویشیوں کا وقت اور اُن کی محنت بھی غیر ضروری طور پر ضائع جاتی ہے۔ مویشیوں کو بحفاظت نہیں رکھا جاسکتا اور آدمیوں کے ساتھ جانوروں کو بھی گاؤں کے گھر میں رکھنے کا طریقہ نہایت غیر اطمینان بخش ہے۔ گاؤں سے کھیت تک کھاد ڈھو کر لے جانے کا عمل لازمی طور پر وقت طلب اور نقصان رساں ہوگا۔ لیکن کھیت پر مناسب مکان تعمیر کرنے کی راہ میں متعدد دشواریاں ہیں جن کے رفع کرنے میں وقت لگے گا۔ ایک دقت تو یہ ہے کہ کھیت کے مکان کی بود و باش کسان کو اس امن و امان و تحفظ سے محروم کر دے گی جس سے وہ دوسرے کسانوں کے ساتھ گاؤں کے حدود میں رہ کر سر دست متمتع ہو رہا ہے۔ باہمی تحفظ کی ضرورت سرکار برطانیہ کے نظم و امن قائم کرنے سے پیشتر بہت زیادہ تھی، لیکن اب بھی وہ ایک اہم اور قابل لحاظ امر ہے۔ دوسرے یہ کہ گاؤں کے آبائی مکان سے وابستگی، کھیت کے نئے مکان میں منتقل ہونے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ
نقل مقام کے مصارف ایک اہم حائل ہیں۔ چوتھے یہ کہ اوسط درجے کا مزرعہ عام طور پر 229
اس قدر منتشر ہوتا ہے کہ کسان ایک کھیت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ متعدد چھوٹے چھوٹے کھیت اُس کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں پانچویں یہ کہ کسان جہاں گاؤں کے حدود کے اندر رہ کر پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کے عام مشترکہ کنوؤں سے استفادہ کر سکتا ہے وہاں اگر وہ اپنے مزرعے میں کھیت کے مکان میں منتقل ہو تو اُسے اپنا ایک ذاتی کنواں کھودنا پڑے گا۔ لیکن اس عظیم فائدے کے مدنظر جو ہر کسان کو انفرادی طور پر اپنے کھیتوں پر مقیم ہونے سے حاصل ہوگا ان سب دقتوں اور دشواریوں کو راستے سے دور کرنا چاہیئے۔

باب

آبپاشی

۱۳۱- آبپاشی کی ضرورت واہمیت[1]

اس کے کئی وجوہ ہیں کہ کیوں ہم اپنی زراعت کے بارے میں کُلیتہً بارش ہی پر انحصار نہیں کر سکتے اور کیوں کسان کے لیے آبپاشی کی مناسب سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے۔ سندھ، راجپوتانہ، اور جنوب مغربی پنجاب جیسے اکثر علاقے ہیں جہاں بارش اس قدر کم ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ گویا مصنوعی آبپاشی کے بغیر زراعت غیر ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض مقامات پر بارش اس قدر کم تو نہیں ہوتی لیکن بے وقت ہوتی ہے اور اس کی تقسیم خراب ہے۔ مثلاً دکن کے بالائی حصّوں میں خشک سالی اور وقت پر بارش نہ ہونے کی شکایت بہت دیرینہ ہے۔ تیسرے یہ کہ چاول اور شکر جیسی بعض فصلوں کو باقاعدہ اور کافی پانی دینا ضروری ہے جو بجز خاص خاص مقاموں کے ہر جگہ بارش کے ذریعے سے نہیں ملتا۔ چوتھے یہ کہ اضافۂ آبادی کے دباؤ کے تحت، زمین کی کاشت عمیق نے دوسری یا سرمائی فصلوں کو ضروری بنا دیا ہے؛ لہٰذا سرمائی بارش نہ ہونے کی صورت میں مصنوعی آبپاشی ضروری ہے۔ اور آخر میں یہ کہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قریب قریب ۸۰ فیصد آبادی کا دارومدار زراعت پر ہے، اور آبپاشی کی سی ضروری واہم چیز کی کافی مقدار میں موجودگی یا عدم موجودگی سے اس کی خوشحالی کا متاثر ہونا لابدی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمین ایّام سے ہندوستان میں آبپاشی کا رواج چلا آرہا ہے، خاصکر کنوؤں اور تالابوں کی شکل میں؛ اور برطانوی دور نے آبپاشی کے نظام میں جو اضافہ کیا ہے وہ بڑے بڑے کارہائے آبپاشی پر مشتمل ہے جو بڑے بڑے دریاؤں کے زاید پانی سے

---

[1] دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "سہ سالہ تبصرہ پر آبپاشی از ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۲ء" Triennial Review of Irrigation نیز ہیرس کی کتاب موسوم بہ "ہندوستان میں آبپاشی صفحہ ۱ تا ۴"۔

باب

استفادہ کرنے کی غرض سے تعمیر کیے گئے ہیں۔

آبپاشی کے فوائد بے شمار ہیں چنانچہ اہم ترین یہ ہیں۔ فصلوں کی پیداوار میں اضافہ، خشک اور پُرخطر علاقوں میں مستقل کھیتی باڑی کا کامیاب انتظام، قحط و قلّت سے تحفظ، پنجاب جیسے زرعی صوبوں میں ریلوں سے بکثرت منافع اور سرکاری محاصل میں براہِ راست اضافہ۔

230 **۱۴۔ کارہائے آبپاشی کی تبویب۔**

(۱) عام تبویب۔

ہندوستان میں کارہائے آبپاشی کی تین اہم قسمیں ہیں (۱) کنوئیں (۲) تالاب اور (۳) نہریں۔ نہریں بھی تین قسم کی ہیں (۱) سیلابی نہریں۔ (۲) مدامی نہریں اور (۳) کارہائے ذخیرۂ آب[1]۔

(۱) کنوئیں۔ ہندوستانی آبپاشی کے نظام میں کنواں ایک اہم عامل ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ جن رقبوں پر آبپاشی کی جاتی ہے اُن میں سے ۲۵ فیصد کنووں سے مستفید ہوتے ہیں[2]۔ ملک کے مختلف حصّوں میں بشمول دیسی ریاستوں کے جملہ ۲۵ لاکھ کنوئیں ہیں جن سے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے اور اُن کی لاگت کا اندازہ ایک ارب روپیہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی آبپاشی بہت بڑا افادہ رکھتی ہے اور نہری آبپاشی کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے[3]۔ کنووں کی کھدائی زیادہ ترجیح کے طور پر کی جاتی ہے اگرچہ حکومت بھی

۱۔ آبپاشی کے جن دوسرے طریقوں سے ہندوستان میں کام لیا جاتا ہے اُن کے منجملہ ایک یہ ہے کہ دریاؤں کا پانی کنووں کی طرح نکال کر آبپاشی کی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ سیلابی پانی کو روک کر عارضی بند تعمیر کیے جاتے ہیں۔ دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء" میں صفحہ ۲۲۹۔

۲۔ دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ ضمیمۂ دوم، جس میں ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۶ء میں کنووں کی آبپاشی کے رقبے کے بارے میں اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔

۳۔ جب کاشتکار کو ہر قطرۂ آب جو وہ استعمال کرتا ہے مختلف گہرائیوں سے اوپر کو لانا پڑتا ہے تو اُس کے استعمال میں بھی وہ زیادہ احتیاط سے کام لیتا ہے۔ نہری پانی کے مقابلے میں چاہی پانی کم از کم سہ گونہ زیادہ محنت عائد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں زمین سے پانی نکالنے کے مصارف زیادہ

ان کی تیاری کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مثلاً اس غرض کے لیے تقاوی دیے جاتے ہیں اور اصلاح و ترقی یافتہ زمین پر زائد محصول معاف کیا جاتا ہے۔ کنووں کا افادہ زمین کو برما کر پانی نکالنے کے طریقے اور خاص وضع کے معمولی قوت سے چلنے والے پمپوں کی بدولت بہت بڑھ گیا ہے۔ محکمۂ زراعت کا شعبۂ انجنیری اس قسم کی اصلاح و ترقی کی جانب خاص طور پر توجہ کرتا اور اُس میں حصہ لیتا ہے۔ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کنووں کی آبپاشی کی توسیع کی بہت بڑی گنجائش ہے۔ اگر کنووں کی کھدائی اور پانی نکالنے کے لیے امداد باہمی کی چھوٹی انجمنیں قائم کی جائیں تو وہ چھوٹے چھوٹے انفرادی کھیتوں کے حق میں نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوں گی۔ گو زرعی کمیشن صوبۂ متحدہ کی اس تجویز کا موید نہیں ہے کہ "نل کنوئیں"[1] بنانے کے لیے مالی امداد دی جائے لیکن یہ سفارش کرتا ہے کہ حکومت ان کی تعمیر میں حسب ذیل طریقوں سے مدد دے؛ یعنی فنی مشورہ دیا جائے، تقاوی قرضے دیے جائیں، اور زمیندار کو تھوڑی سی فیس ادا کرنے پر کھدائی اور برمانے کا ساز و سامان اور ماہر مزدور فراہم کیے جائیں[2]۔ باب

(۲) تالاب۔ تالاب بہت ہی قدیم زمانے سے ہندوستانی زرعی معیشت کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ لیکن پنجاب اور سندھ میں وہ تقریباً مفقود ہیں۔ مدراس میں

231 یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں موجود ہیں؛ چنانچہ یہاں ... ۳۵ معمولی کارہائے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ہوتے ہیں اس لیے وہ عام طور پر اعلیٰ درجے کی فصلوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کنوئیں کی آبپاشی کی ہوئی زمینوں کی پیداوار نہروں کی آبیاری کی زمینوں کے مقابلے میں کم از کم $\frac{1}{3}$ زیادہ ہوتی ہے۔ گو ایک نہری نظام کے تحت زیر کاشت لائے ہوئے بڑے بڑے رقبے ان دونوں نظاموں کے باہمی فرق کو کم کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ نہروں کی توسیع کنووں کے ذریعے سے آبپاشی کے امکانات میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ نہروں کا پانی زمین میں جذب ہو ہو کر زمین کے ذخیرۂ آب میں اضافہ اور اُس کی سطح کو بلند کر دیتا ہے۔

[1] (Tube Wells)

[2] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، فقرہ (۲۷۴) و (۲۸۰)۔

باب ۶

آبپاشی ہیں جو ۲۵ تا ۳۰ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ تاہم متعدد قدیم دیہاتی تالاب مٹی اور ریگ سے بھر کر بیکار اور بے مرمت پڑے ہوئے ہیں۔ اس قدیم آبپاشی کی شکل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے طریقے کو عام کرنے کے لیے حکومت اور عوام دونوں کو نہایت سرگرم کوشش کرنی چاہیئے خاصکر ان علاقوں میں جہاں نہری آبپاشی غیر ممکن یا ناموزوں ہے۔

(۳) **نہریں**۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں آبپاشی کی سب سے اہم شکل نہریں ہیں اور حکومت خاص طور پر ان ہی کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ نہروں کی عام طور پر دو قسمیں ہیں (۱) وہ نہریں جو سال تمام دریاؤں سے قدرتی طور پر پانی حاصل کرتی ہیں اور (۲) وہ نہریں جو مصنوعی ذخیرہ آب سے جاری رہتی ہیں۔ قسم اوّل کی نہریں زیادہ تر ان علاقوں میں کاٹی گئی ہیں جن میں سے ہمالیائی دریا گزرتے اور سال بھر بہتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ خشک گرمی کے موسم میں بھی پہاڑی برف لازوال ذخیرے کا کام دیتا ہے۔ مدراس میں بھی ایک حد تک یہی حالت پائی جاتی ہے جہاں سرمائی بارش بمبئی کے مقابلے میں زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی نہریں احاطۂ مدراس، دکن، صوبۂ متوسط اور بندھیل کھنڈ میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ جزیرہ نمائے ہند کے دریا موسم بارش میں دھڑلے سے بہتے ہیں، تاہم سال کے خشک مہینوں میں ان کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے اور اس لحاظ سے مصنوعی ذخیرۂ آب ضروری ہے۔

پہلی قسم کی نہر کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) سیلابی نہر (۲) دائمی نہر۔

(۱) سیلابی نہروں میں دریا پر کوئی بند تعمیر کیے بغیر دریا سے براہِ راست پانی لیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں اس وقت تک پانی نہیں آتا جب تک کہ دریا میں سیلاب نہ آئے اور ایک خاص سطح تک نہ پہنچے۔ چنانچہ نہر کے پانی میں دریا کی قدرتی سیلابی سطح کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ سندھ اور پنجاب کی زمینوں کی آبپاشی اسی قسم کی نہروں سے ہوتی ہے جو علی الترتیب دریائے سندھ اور ستلج سے پانی حاصل کرتی ہیں۔ سندھ کی اکثر نہریں سیلابی ہیں۔ چونکہ ان کا انحصار قدرتی سیلابی سطح پر ہوتا ہے، اس لیے جس وقت اس سطح میں کمی ہو جاتی ہے ان میں بھی پانی کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور مسلسل اور طویل طغیانی کی بدولت وہ زیادہ وسیع خطوں کو سیراب

باٹ

کرتی ہیں۔ اس طرح آبپاشی کا زمانہ جون سے ستمبر تک محدود ہوتا ہے اور سال کے باقی حصّے میں کنووں کو استعمال کیے بغیر کاشت ناممکن ہو جاتی ہے۔ سندھ کے بندسکر کا افتتاح جنوری ۱۹۳۲ء میں ہوا اور وہ اپنی نوعیت کا دُنیا کا سب سے بڑا بند ہے۔ دریائے سندھ کے پانی کو ایک بند تعمیر کر کے روکا گیا ہے اور اس ذریعے سے مذکورہ بالا نقص کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ اس بالائی حصّے سے نکالی ہوئی نہروں میں پانی کو اتنی اعلیٰ سطح تک برقرار رکھنا ممکن ہوگا کہ پانی بافراط دستیاب ہو سکے اور آبپاشی کا کام سال بھر تک جاری رہ سکے۔ اسی قسم کی تدابیر پنجاب میں اختیار کی جا رہی ہیں اور ان کاموں کو انجام دینے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مصارف بہت زیادہ ہیں۔

232 (۲) مدامی نہریں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ایک ایسے دریا کے پانی کو کسی قسم کے سدّ یا بند کے ذریعے سے روک کر تعمیر کی جاتی ہیں جو سال بھر بہتا رہتا ہے اور جہاں آبپاشی کی ضرورت ہو وہاں اُس کا پانی نہر کے ذریعے سے پہنچایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ نہریں دریا کے پانی کی قدرتی سطح کے تابع نہیں ہوتیں۔ اس قسم کے تحت، صوبۂ متحدہ اور پنجاب کی جملہ مدامی نہروں کا نظام آتا ہے۔ سندھ اور پنجاب کی بعض سیلابی نہروں کو مدامی نہروں سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔

کارہائے ذخیرۂ آب کی نہریں کسی وادی میں بند تعمیر کر کے بنائی جاتی ہیں۔ جس میں موسم بارش میں برسے ہوئے پانی کو ذخیرہ کیا جاتا ہے، اور اطراف واکناف کی زمینوں کی آبپاشی کے لئے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مون سون (باد برشگال) کے زمانے میں بارش کے پانی کو جمع کرنے کے طریقے پر بہت قدیم زمانے سے عمل ہوتا آرہا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے کام دکن، صوبۂ متوسط اور بندھیل کھنڈ میں پائے جاتے ہیں۔

۱۴۱۔ کارہائے آبپاشی کی تبویب

(۲) سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم۔

جس ذریعے سے سرکاری کارہائے آبپاشی کا فنڈ مہیا کیا جاتا ہے اُس کو ظاہر کرنے کے لیے ۱۹۲۱ء تک ان کاموں کی تقسیم حسب ذیل طریقے پر کی جاتی تھی:۔ (۱) کارہائے پیدآور (۲) کارہائے حفاظتی اور (۳) کارہائے خورد۔

(۱) کارہائے پیدآور۔ یہ توقع کی گئی تھی کہ ان کے

باب

مکمل ہو جانے کے دس سال کے اندر ان سے اتنی مالگزاری وصول ہوگی کہ جتنا سرمایہ ان میں لگا تھا اس کے سالانہ سود کی رقم کو ادا کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ اس قسم کے کام زیادہ تر شمالی ہند اور مدراس میں پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۳۰ کے تین سالوں میں ان کارہائے پیداآور سے اوسطاً ۲۲،۲۰۲،۳۰۳ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی گئی اور سرمایہ کی مجموعی لاگت سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ کے ختم تک ۹۲ کروڑ روپے تھی۔ یہ سرکاری کارہائے آبپاشی سے آبپاشی کیے ہوئے رقبے میں سب سے زیادہ اضافہ پیداآور کاموں کی قسم کے تحت ہوا، چنانچہ سنہ ۱۸۷۸ تا سنہ ۱۸۷۹ میں ۲ کروڑ ۷ لاکھ ۵۶ ہزار ۲ سو ۹ ایکڑ اور سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ میں ۲ کروڑ ۳۵ لاکھ ۵ ہزار ۶ سو ۷۵ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ میں رقبہ گھٹ کر ۲۲،۴۴۶،۳۰۰ ایکڑ ہو گیا۔

(۲) کارہائے حفاظتی۔ یہ اس توقع سے نہیں بنائے گئے تھے کہ ان سے براہِ راست کوئی نفع حاصل ہوگا، بلکہ مقصد غالباً یہ تھا کہ قحط کے زمانے میں دکن جیسے پُرخطر علاقوں میں خشک سالی سے بچاؤ ہو۔ قحط کے زمانے میں آبادی کی امداد کے لیے میعادی طور سے جن مصارف کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اُن میں یہ کام کمی کر دیتے ہیں۔ ان کاموں کے مصارف سرکاری محاصل جاریہ سے اور عام طور پر اس سالانہ گنجائش سے پورے کیے جاتے ہیں جو امداد قحط اور بیمہ کی مد محفوظ میں رہتی ہے۔ گو یہ کام براہِ راست نفع بخش نہیں ہوتے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ان سے نقصان ہوتا ہے، پھر بھی، حفاظتی کارہائے آبپاشی انجام کار اس لحاظ سے مفید ثابت ہوتے ہیں کہ وہ بے آب وگیاہ خطوں کی معاشی استواری کے ضامن ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۳۰ کے تین سالوں میں کارہائے غیر پیداآور سے اوسطاً ۴،۱۰۹،۷۹۳ ایکڑ رقبے کی آبپاشی ہوئی اور اُن پر جتنا اصل صرف ہوا
اس کی لاگت سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ کے ختم تک ۴۴ کروڑ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ 233
میں زیر آبپاشی رقبہ ۴٫۲ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا۔

(۳) کارہائے آبپاشی خورد۔ ان کا شمار متفرق کاموں کی قسم میں تھا جس میں خاصکر تالاب جیسے تمام جن کو برطانوی حکومت نے اپنے اقتدار میں لینے کے بعد درست کیا اور برطانوی دور کے صرف چند کارہائے خورد شامل تھے۔

ان کارہائے خورد میں سرمائے اور مالگزاری کی مد رکھنے یا نہ رکھنے کے اعتبار سے مزید امتیاز کیا جاتا تھا۔ اور ان کے کل مصارف رواں مالگزاری سے پورے کیے جاتے تھے۔ قرضے لینے کی اجازت صرف پیداآور کارہائے آبپاشی کے لیے دی جاتی تھی۔ باب

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ قدیم تقسیم بدل دی گئی ہے چنانچہ اب افادہ عام کے کسی کام کے مصارف بھی قرضے کے فنڈ سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ کارہائے پیداآور و خورد کی قسموں کو منسوخ کر دیا گیا ہے اور جملہ کارہائے آبپاشی کو خواہ وہ کلاں ہو یا خورد جن کے مصارف کے لیے سرمایے کی مد رکھی جاتی ہے از سر نو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی (۱) پیداآور اور (۲) غیر پیداآور؛ اور اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا کہ ان کی تعمیر کے لیے کس فنڈ سے رقم حاصل کی جاتی ہے۔ تیسری قسم میں وہ رقبے داخل ہیں جن کی آبپاشی کارہائے غیر سرمایگی سے کی جاتی ہے۔

۱۵۔ کل کاموں کا پھیلاؤ، ان کی ترقی اور آمدنی۔

برطانوی ہند کا مجموعی رقبہ جس پر جملہ ذرائع سے آبپاشی کی گئی سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ تھا جس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء میں رقبہ صرف ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ تھا۔ دو فصلی کھیتوں کی آبپاشی کے رقبے کو منہا کرنے کے بعد خالص زیر آبپاشی رقبہ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں ۵ کروڑ ۱۱۰ لاکھ ایکڑ اور اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۲۸ء میں ۴ کروڑ ۳۲ لاکھ ۴۰ ہزار ۷ سو ۲۶ ایکڑ تھا۔ سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء میں جتنا رقبہ زیر آبپاشی تھا اس کے منجملہ ۲۷ ملین ایکڑ پر نہروں کے ذریعے سے، ۷ ملین ایکڑ پر تالابوں کے ذریعے سے، ۱۱ ملین ایکڑ پر کنوؤں کے ذریعے سے اور ۶ ملین ایکڑ پر دوسرے ذرائع سے آبپاشی ہوئی۔ زیر آبپاشی مجموعی خام رقبے کے منجملہ ۱۹ ملین ایکڑ پر چاول، ۱۱ ملین پر گیہوں، ۷ ملین پر جو، مکئی، جوار، باجرا، ۶ ملین پر دالیں اور دو ملین ایکڑ پر نیشکر کاشت ہوئی۔ کپاس کی کاشت ۳ ملین ایکڑ پر اور دوسرے غیر خوردنی اجناس کی کاشت ۵ ملین ایکڑ زمین پر ہوئی[1]۔ گزشتہ چالیس سال میں کارہائے سرکاری کے زیر آبپاشی رقبے میں تدریجی ترقی ہوئی ہے۔

[1]۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "زرعی اعداد و شمار برائے سنہ ۱۹۳۳ء تا سنہ ۱۹۳۴ء" (عارضی) صفحہ ۱۔

چنانچہ سنہ ۱۸۷۸ء تا سنہ ۱۸۷۹ء میں رقبۂ زیر آبپاشی جس پر سال میں ایک دفعہ آبپاشی کی جاتی تھی باب
۱۰،۵ ملین ایکڑ تھا، انیسویں صدی کے آغاز میں یہ بڑھ کر ۱۹،۲۵ ایکڑ ہو گیا اور
سنہ ۱۹۱۹ تا سنہ ۱۹۲۰ میں ۲۸،۱ ملین ایکڑ تک بڑھ گیا۔ گویا اس سے قبل تک اتنا بڑا رقبہ
کبھی زیر آبپاشی نہ آیا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ تا سنہ ۱۹۲۳ میں اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ
برطانوی ہند میں کارہائے سرکاری کے زیر آبپاشی کُل رقبہ ۲۸،۳۳ ملین ایکڑ تھا۔
سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۲۷ میں رقبہ اُس کے قریب قریب یعنی ۲۸،۲ ملین ایکڑ رہا۔ سنہ ۱۹۲۹
تا سنہ ۱۹۳۰ میں ہر قسم کے کارہائے سرکاری کے زیر آبپاشی رقبہ برطانوی ہند میں
۳۱،۶۴ ملین ایکڑ یعنی ہندوستان کے مجموعی زیر کاشت رقبے کا ۱۲،۷ فیصد تھا۔
سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳ میں سرکاری کارہائے آبپاشی سے کاشت کیا ہوا رقبہ $\frac{3}{4}$ ۲۹ ملین ایکڑ 234
سے بھی زائد تھا جو مجموعی زیر کاشت رقبے کا ۱۲،۵ فیصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان
ہو چکا ہے، اضافہ زیادہ تر کارہائے پیداآور کے تحت ہوا، چنانچہ سنہ ۱۸۷۸ تا سنہ ۱۸۷۹ میں
۴،۵ ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۰۰ تا سنہ ۱۹۰۱ میں ۱۰،۵ ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۲۷ تا سنہ ۱۹۲۸ میں ۱۹،۱۵
ملین ایکڑ، سنہ ۱۹۲۹ تا سنہ ۱۹۳۰ میں ۲۳،۵۰ ملین ایکڑ اور سنہ ۱۹۳۰ تا سنہ ۱۹۳۱ میں ۲۲،۴۵
ملین ایکڑ کی آبپاشی کی گئی۔ سنہ ۹ تا سنہ ۱۹۰۱ میں کار آمد بڑی نہروں، اُن کی شاخوں
اور تقسیم کنندہ نالوں کا مجموعی طول ۴۲،۳۹ میل تھا، لیکن سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳ میں یہ
طول بڑھ کر تقریباً ۷۵،۰۰۰ میل ہو گیا۔ اندازہ کیا گیا کہ اس سال کارہائے سرکاری
سے آبپاشی کردہ فصلوں کی قیمت ۸۲ کروڑ روپے تھی۔ پنجاب سے سالانہ جو گیہوں
برآمد کیا جاتا ہے اس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ سے بڑھ کر ۶ ملین اسٹرلنگ ہو گئی ہے۔
سنہ ۱۹۳۲ تا سنہ ۱۹۳۳ کے ختم تک کارہائے آبپاشی و کشتی رانی پر بشمول ان کاموں کے جو
زیر تعمیر ہیں، ایک ارب ۴۶ کروڑ روپیہ سرمایہ صرف ہوا۔ اس کے برخلاف سنہ ۱۹۰۰ تا سنہ ۱۹۰۱
میں اصل لاگت کی مقدار ۴۲،۲ کروڑ روپے تھی۔ مجموعی خام آمدنی ۱۲،۵ کروڑ ہوئی
اور مصارف کار ۴،۷ کروڑ روپے تھے، گویا صرف شدہ اصل پر ۵،۵ فیصد کی خالص

ل۔ دیکھو ہیرس کی تصنیف محولۂ بالا صفحہ ۸ تا صفحہ ۹؛ اور ایک کتاب موسوم بہ "انڈین ایر بک برائے سنہ ۱۹۳۵"
صفحہ ۳۱۸ تا صفحہ ۳۲۰ اور کتاب موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۳۳ تا سنہ ۱۹۳۴ میں" صفحہ ۹۹۔

باب ۵

آمدنی وصول ہوئی۔ یہ ایک اطمینان بخش نتیجہ ہے، اس لیے کہ مجموعی اصل میں سے ۴ کروڑ روپے کار ہائے غیر پیدا آور پر صرف کیے گئے جس کے اکثر و بیشتر حصے سے ۱ فیصد سے بھی کم آمدنی وصول ہوئی۔ انفرادی کار ہائے آبپاشی کی آمدنی کی مقدار میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دکن کے بعض کار ہائے آبپاشی سے مشکل ۱ تا ۲ فیصد آمدنی وصول ہوتی ہے اور اس کے برخلاف پنجاب کے کار ہائے آبپاشی سے صرف کردہ اصل پر معقول منافع ہوتا ہے مثلاً ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء میں اس کا اوسط ۱۱٫۶۲ فیصد رہا؛ مدراس میں ۷٫۰۰ فیصد اور صوبۂ متحدہ میں ۵٫۰۹ فیصد منافعہ وصول ہوا۔ ان اعداد پر نظر ڈالتے وقت یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ صرف کردہ اصل میں وہ عظیم مصارف بھی شامل ہیں جو درجۂ اوّل کی چار تجاویز یعنی سارد ھا اور دھ کی نہریں، وادیٔ ستلج کی تجویز، بندلائڈ کی تجویز، اور کاویری (میٹر) کی تجویز کے بارے میں ہوئے ہیں۔ یہ تجاویز یا تو حال ہی میں مکمل ہوئی ہیں یا اب بھی زیر تکمیل ہیں اور ان سے بہت ہی کم آمدنی وصول ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی[1]۔ آبیانہ مختلف صوبوں میں مختلف طریقوں سے لیا جاتا ہے۔ مثلاً سندھ میں معمولی مالگزاری میں آبیانہ بھی شامل ہوتا ہے، چنانچہ مقررہ مالگزاری کے ۹/۱۰ حصے کا باعث نہروں کو خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے صوبوں مثلاً مدراس اور بمبئی کے بعض حصوں میں مالگزاری کی شرحیں اس لحاظ سے مقرر کی جاتی ہیں کہ زمین کی آبپاشی کی جارہی ہے یا نہیں، اور آبپاشی کی زمین کی مالگزاری میں آبیانہ بھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن ان طریقوں کو استثنائی خیال کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے حصے میں پانی کا محصول الگ وصول کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کے حقیقی رقبے کی پیمائش کی جاتی ہے اور اگائی ہوئی فصلوں کے لحاظ سے بحساب فی ایکڑ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ محصول کی شرحیں نہ صرف فصلوں کی اگائی کے لحاظ سے بلکہ ہر صوبے میں اور عام طور پر ایک ہی صوبے کی مختلف نہروں پر مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ پنجاب میں محصول کی شرحیں شکر

235

---

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء" میں صفحہ ۹۹ اور "انڈین ایربک" برائے ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۱۸۔

بابٹ

کے لیے فی ایکڑ ۷ روپیے آٹھ آنے سے لے کر ۱۲ روپے تک، چاول کے لیے ۴ روپیے سے ۷ روپے آٹھ آنے تک، گیہوں کے لیے ۳ روپے ۴ آنے سے ۵ روپیے ۴ آنے تک، کپاس کے لیے ۳ روپے سے ۴ روپے ۴ آنے تک، اور جوار اور دالوں کے لیے ۲ روپے سے ۳ روپے ۴ آنے تک ہیں[1]۔

مختلف صوبوں کی دیہی معیشت میں آبپاشی کا جو اہم حصہ ہے وہ مختلف صوبوں میں مختلف ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے معلوم ہوگا[2]۔

صوبہ	رقبۂ زیر کاشت کے مقابلے میں رقبۂ زیر آبپاشی کا فیصد	صوبہ	رقبۂ زیر کاشت کے مقابلے میں رقبۂ زیر آبپاشی کا فیصد
آسام	۷،۵	صوبۂ متوسط و برار	۴،۲
بنگال	۶،۲	مدراس	۲۹،۷
بہار و اوڑیسہ	۱۷،۴	شمال مغربی سرحدی صوبہ	۳۴،۴
بمبئی خاص	۳،۹	پنجاب	۱،۴۴
بمبئی سندھ	۷۳،۷	صوبۂ متحدہ	۲۲،۰
برما	۸،۴	دوسرے چھوٹے علاقے	۱۹،۳

برطانوی ہند کا مجموعی اوسط ۴،۱۹ ہے۔

ا۔ دیکھو "انڈین ایر بک" برائے سنہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۱۸۔

۲۔ یہ اعداد سنہ ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۲ سے لیکر سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۲۶ کے پانچ سالوں کا اوسط ہیں (دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان سنہ ۱۹۲۸ تا سنہ ۱۹۲۹ میں" صفحہ ۱۱۰)۔ سنہ ۱۹۳۱ تا سنہ ۱۹۳۲ میں برطانوی ہند میں مختلف ذرائع سے جتنے رقبے پر کاشت ہوئی اس کے منجملہ پنجاب کا رقبہ سب سے بڑا یعنی ۲۷،۱۴ ملین ایکڑ ہے۔ صوبۂ متحدہ کا نمبر اس کے بعد ہے۔ اس کا رقبہ ۰۷،۱۰ ملین ایکڑ ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب مدراس (۲۰،۹ ملین ایکڑ) بہار و اڑیسہ (۱۸،۹ ملین ایکڑ) اور بمبئی بشمول سندھ (۲۳،۴ ملین ایکڑ) ہیں۔ دیکھو ایک رپورٹ موسوم بہ "برطانوی ہند کے اعداد و شمار کا خلاصہ" برائے سنہ ۱۹۳۱ تا ۱۹۳۲۔

باب ۴ اس سے یہ واضح ہوگا کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبے، سندھ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ، مدراس، صوبۂ متحدہ اور بہار و اڑیسہ ہیں۔ بمبئی خاص اور صوبۂ متوسط میں آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت ہے اور دونوں بہت کم ترقی یافتہ ہیں۔ آئندہ ان کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا چاہیے، تاکہ ان علاقوں میں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے یا وقت پر نہیں ہوتی فصلیں یقین کے ساتھ حاصل ہو سکیں۔ بنگال، برما اور آسام بھی اسی ذیل میں آتے ہیں لیکن بارش کی کثرت کی وجہ سے یہاں آبپاشی کی ضرورت بدرجہا کم ہے۔

۱۶۔ آبپاشی کی سرکاری پالیسی۔

برطانوی حکومت کو اس کے پیشرووں سے موجودہ کارہائے آبپاشی میں سے بعض بطور ترکہ ملے؛ مثلاً شمالی ہند کی چند سیلابی نہریں، کارہائے ذخیرۂ آب اور خاصکر احاطۂ مدراس کے تالاب۔ لیکن ابتدائی برطانوی دور میں ان کاموں سے غفلت برتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض تباہ ہو گئے۔ لیکن گزشتہ صدی کے وسط تک حکومت کی پالیسی میں تغیر ہو گیا، چنانچہ اس نے قدیم کاموں کی مرمت اور از سر نو درستی شروع کی۔ لیکن ترقی میں اس لیے رکاوٹ پیدا ہوئی کہ خانگی ضمانتی کمپنیوں کو یہ کام سپرد کرنے کا تجربہ ناکام رہا۔ اس کے نتیجے کے طور پر حکومت نے ایک نئی پالیسی اختیار کی جس سے اس کے تحت اس نے آبپاشی کے کارہائے پیدآور کی تعمیر اور ان کا قیام و انتظام اپنے ذمے لے لیا، اور اس غرض کے لیے ضروری قرضے حاصل کیے۔ اس پالیسی کی رو سے صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں بعض کارہائے کلاں تعمیر ہوئے۔ پنجاب کی نہری نوآبادیات کا مختصر حال اس باب کے آخر میں بیان کر دیا گیا ہے۔

236 لیکن آبپاشی کی ترقی کی رفتار بحیثیت مجموعی بہت سست رہی۔ اس اثنا میں حکومت کی پالیسی میں ایک اور اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ سرکار نے اس کو واضح طور پر اپنا فرض تسلیم کیا کہ قحط زدہ علاقوں میں کارہائے آبپاشی بغرض تحفظ تعمیر کیے جائیں، چنانچہ دکن اور دوسرے علاقوں میں اس کے مطابق تدابیر اختیار کی گئیں۔[1] لیکن

---

[1] ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء کے قحط کے بعد یہ قرار پایا کہ ہر سال ڈیڑھ کروڑ روپیہ امداد قحط اور بیمہ فنڈ

باب ۵

مصارف کی زیادتی اور کسانوں کی جانب سے پانی کی بے قاعدہ مانگ کی وجہ سے نیز بارش کی کمی اور بے وقت آمد کی بنا پر یہ کام منفعت بخش ثابت نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے پنجاب کے دریاؤں سے متعلق زیادہ منفعت بخش کاموں کی جانب توجہ مرتکز کرنی شروع کی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں ملک میں جو قحط نمودار ہوئے اور جنھوں نے خاص کر دکن کو بہت بُری طرح متاثر کیا اُن کی بنا پر لارڈ کرزن کی حکومت نے ۱۹۰۱ء میں آبپاشی کا ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس جماعت نے یہ تسلیم کیا کہ ۱۸۸۰ء کے کمیشن قحط کی سفارش کے مطابق قحط سے تحفظ کے لیے کارہائے آبپاشی کے ساتھ ساتھ ریلوں کی تعمیر نے قحط سے بچاؤ کے سلسلے میں نہایت عمدہ کام انجام دیا تھا لیکن یہ خیال ظاہر کیا کہ اب خوردنی اجناس کو ترقی دینا ضروری تھا۔ آبپاشی کے کمیشن نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ نفع بخش کاموں کا میدان پنجاب، سندھ اور مدراس کے بعض علاقوں تک ہی محدود تھا حالانکہ وہ قحط سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔ چنانچہ اس نے یہ سفارش کی کہ ان کاموں میں بعجلت ممکنہ اضافہ کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ ایک جانب سرکار کے لیے نفع بخش ثابت ہوں گے تو دوسری جانب ملک کی خوردنی پیداوار کی مجموعی رسد میں اضافہ ہوگا۔ کمیشن نے قحط زدہ رقبوں کی حفاظت کے لیے یہ سفارش کی کہ کارہائے حفاظتی تعمیر کیے جائیں جو اگرچہ براہِ راست نفع بخش نہ ہوں گے لیکن امداد قحط کے سلسلے میں کثیر مصارف کو روک سکیں گے جن کا روکنا بصورت دیگر ناممکن ہوگا۔ بمبئی دکن کے لیے خاص طور پر سفارش کی گئی کہ گھاٹوں میں تالاب اور ذخیرہ ہائے آب تعمیر کیے جائیں اور ان سے نہریں نکالی جائیں۔ کمیشن نے کرشنا اور تنگ بھدرا اسکیموں کی بھی سفارش کی۔ چنانچہ یہ توقع کی گئی تھی کہ ان تجاویز پر ۴۴ کروڑ روپیہ صرف ہوگا 237

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کے لیے الگ رکھے جائیں۔ اس مد کا ایک جزو کارہائے حفاظتی میں صرف کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں وزیر ہند نے اس غرض کے لیے امداد قحط کے فنڈ سے ۷۵ لاکھ روپے کے علاوہ ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ امداد کی منظوری دی۔ لیکن اس کل ایک کروڑ روپے کی منظوری کو پوری طرح کام میں نہیں لگایا گیا تھا کہ جنگ کی وجہ سے تخفیف مصارف لازم ہو گئی۔

باب ۷

اور زیر آبپاشی رقبے میں ۶½ ملین ایکڑ کا اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد کی حکومت کی پالیسی ان ہی سفارشوں پر مبنی تھی اور آبپاشی کو نظر انداز کر کے ریلوں پر توجہ مرکوز کرنے کی سابقہ پالیسی سے جس پر آر سی ڈت جیسے اشخاص نے نکتہ چینی کی تھی بین تضاد رکھتی تھی۔ غرض بہت سے نئے کاموں کو انجام دیا گیا۔ پیدآور و حفاظتی کارہائے آبپاشی کے مصارف دُگنے سے زیادہ ہوگئے ہیں اور ان کے ذریعے سے جتنے رقبے پر آبپاشی ہو رہی ہے اُس میں زائد از ۰۰ فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔

آجکل آبپاشی ایک صوبہ واری مسئلہ ہے چنانچہ صوبہ واری حکومتوں کے مالی اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور قوتِ اختراع و جدت سے کام لینے کا انھیں زیادہ موقع حاصل ہے۔ وزیر ہند اور حکومت ہند کی منظوری کی صرف ان کاموں کی صورت میں ضرورت پڑتی ہے جن کی لاگت کا اندازہ پچاس لاکھ روپے سے متجاوز ہو۔ علاوہ ازیں قرضہ حاصل کر کے کام جاری کرنے کا طریقہ صرف کارہائے پیدآور تک محدود نہیں ہے۔ صوبہ واری بیمۂ قحط کی منظورہ گنجائش سے بھی رقم حاصل کی جاسکتی ہے بشرطیکہ امداد قحط کے لیے اس کی حقیقت میں ضرورت نہ ہو؛

زرعی کمیشن نے حکومت بمبئی کی اس تدبیر کو نہایت پسند کیا کہ حکومت نے ۱۹۲۵ء میں ایک خاص عہدہ دار اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ قحط سے محفوظ رہنے کے قدرتی ذرائع کی تحقیقات کرے اور کمیشن مذکور دوسرے صوبوں کو بھی اس مثال کی تقلید کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ امداد باہمی کے اصول پر آبپاشی کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں اور اس قسم کے کاموں کو انجام دینے اور برقرار رکھنے کے لیے حکومت کو اُن کی مدد کرنی چاہئے۔ کارہائے آبپاشی خورد کی تیاری و ترمیم و توسیع اور بقا و حفاظت کی جانب اُن کے استحقاق کے لحاظ سے اب تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔[۱]

۱۹۲۲ء کے بعد سے کارہائے آبپاشی کے بارے میں بہت نمایاں جد و جہد کی گئی ہے چنانچہ ۱۹ بڑے اور اہم کام یا تو مکمل ہو چکے ہیں یا زیر تیاری ہیں اور اُن کے مصارف ۰ ۵ کروڑ روپے سے زائد ہوئے ہیں۔ ان کی بدولت جو علاقہ زیر کاشت

---

[۱] دیکھو زرعی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف (۲۷۹)

آئے گا یا زیادہ بہتر طریقے سے پانی حاصل کرے گا اس کا رقبہ ۲۲ء۱۱ ملین ایکڑ ہے باب
جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ؁۱۹۰۲ تا ؁۱۹۰۳ کے مقابلے میں مجموعی رقبہ سہ گونہ بڑھ گیا۔
غیر معمولی اہمیت کے نئے کارہائے کلان حسب ذیل ہیں:" (۱) وادی ستلج کی تجویز"
جو ؁۱۹۳۲ تا ؁۱۹۳۳ کے ختم پر مکمل ہوئی۔ اُس کی مرمّمہ لاگت کا اندازہ ۸۶ء۲۳ کروڑ
روپے ہے اور اس سے ۵ ملین ایکڑ سے زائد زمین پر آبپاشی ہوگی۔ (۲) "بند سکر"
جس کی لاگت کا اندازہ تقریباً ۲۰ء۲۰ کروڑ روپے کیا گیا ہے اور جن سے ۵ ملین ایکڑ
سے زائد زمین کی آبپاشی ہوگی[۱] (۳) "کاویری کے مخزن آب" اور "میٹر پراجکٹ" 238
(جس کا افتتاح اگست ؁۱۹۳۴ میں ہوا) کے مصارف کا اندازہ ۳۷ء۷ کروڑ روپے تک
کیا گیا ہے۔ اس سے تین ملین ایکڑ زائد زمین پر آبپاشی ہوگی' اور ملک کی غذا کی رسد میں
۱۵۰۰۰۰۰ ٹن چاول کا اضافہ ہوگا۔ بمبئی میں دو کارہائے کلان حال ہی میں تکمیل کو
پہنچے ہیں۔ ایک تو ہندوستان میں سب سے اونچا یعنی ۲۷۰ فٹ بلند "بھنڈر دارا بند"
؁۱۹۲۵ میں؛ اور دوسرے ؁۱۹۲۶ بمقام بھاٹ گر" لائیڈ بند" جو دُنیا کی سب سے
بڑی سنگ بستہ تعمیر ہے۔ صوبۂ متحدہ میں "سارداا ودھ نہروں" کے سلسلے میں بہت
اطمینان بخش ترقی ہوئی ہے۔ دریائے ساردا کی آبپاشی کی تجویز ؁۱۹۲۸ کے موسم خزاں
میں باقاعدہ طور پر مکمّل ہوگئی اور اس سے ایک ملین سے زاید رقبے کی آبپاشی ہوگی۔

[۱] یہ تو زخ کی گئی ہے کہ ؁۱۹۳۴ تا ؁۱۹۳۵ کے ختم تک مرمّمہ تخمینے کے مطابق بند سکر کی تجویز پر ۲۰ء۲۰ کروڑ روپے اور
بشمول مطالبات سود ۲۵ء۲۵ کروڑ روپے صرف ہوں گے۔ سر یم دسویس وریا اور نواب علی نواز جنگ بہادر
(چیف انجنیر و معتمد تعمیرات حکومت حیدرآباد) بند سکر اور سندھ کی نہروں کے بارے میں اپنی رپورٹ میں یہ رائے ظاہر
کرتے ہیں کہ اس وقت سندھ کے جملہ کارہائے آبپاشی کی بدولت زرعی پیداوار ۸ کروڑ روپے کی مالیت کی
حاصل ہو رہی ہے لیکن بند سکر کی پوری تکمیل کے بعد ۳۰ یا ۳۵ کروڑ روپے کی پیداوار حاصل ہوگی۔ جیسا کہ
اوپر بیان کیا جا چکا ہے بند سکر کا افتتاح جنوری ؁۱۹۳۲ میں عمل میں آیا' ؁۱۹۳۳ تا ؁۱۹۳۴ میں مجموعی
زیر آبپاشی رقبہ ۲۷۰۰۰۰۰ ایکڑ تھا۔ گیہوں اور کپاس کے زیر کاشت رقبہ علی الترتیب
دس لاکھ ایکڑ اور ۵ لاکھ سرسٹھ ہزار ایکڑ تھا۔ دیکھیے ایک رپورٹ موسوم بہ "ہندوستان ؁۱۹۳۳ تا ؁۱۹۳۴
میں" صفحہ ۹۹۔

صوبۂ متوسط میں بھی ایک بیش خرچ اور وسیع نظام العمل چودہ سال سے زائد مدت کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر صوبے میں کئی تجاویز زیر تحقیقات ہیں۔ اس وقت جن زیادہ امید افزا تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے اُن کو اور موجودہ تجاویز کی قدرتی توسیع کو ملحوظ رکھنے کے بعد اغلب ہے کہ انجام کار بحیثیت مجموعی ۵۰ ملین ایکڑ زائد رقبے کی آبپاشی ہو۔ ہاٹ

زرعی کمیشن نے حسب ذیل سفارشیں بھی کی ہیں۔ (۱) محکمۂ آبپاشی اور محکمۂ زراعت میں زیادہ قریبی تعلق قائم کیا جائے۔ (۲) ریلوں کی مقامی مشاورتی کمیٹیوں کے مثل آبپاشی کی بھی مشاورتی کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ وہ آبپاشی کے بارے میں شکایات کا تصفیہ کریں۔ (۳) دہلی میں ایک مرکزی محکمۂ اطلاعات عامہ قائم کیا جائے۔ (ا) جس میں آبپاشی کی مطبوعات کا ایک کتاب خانہ ہو (ب) جو صوبہ داری عہدہ داروں میں اطلاعیں تقسیم کرے تاکہ دوسرے صوبوں کے حالات کے متعلق انھیں جو لاعلمی ہے اُس کا ازالہ ہو (۴) تو سّت برقاسیب کی ترقی سے رونما ہونے والے مسائل کا بھی حل کیا جائے۔ کمیشن مذکور یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ آبپاشی کے مسائل کی تحقیقات پر بہت زیادہ توجہ کرنی چاہیئے اور بڑے بڑے غیر منفصلہ تجاویز آبپاشی کی صورت حال پر میعادی طور پر تبصرہ کرنا چاہیئے[1]

۱۷۔ آبپاشی بمقابلۂ ریل۔

239 آبپاشی بمقابلۂ ریل کا بحث مباحثہ ایک زمانے میں خاص کر گزشتہ صدی کے اختتامی سالوں میں بہت سرگرمی کے ساتھ جاری تھا۔ چنانچہ آر۔ سی۔ دت نے اس میں بہت ہی نمایاں حصّہ لیا اور یہ بتلایا کہ ۱۹۰۲ء تک حکومت نے آبپاشی پر نو صرف ۲۸ کروڑ روپے بہائے تھے اور اس کے مقابلے میں ریلوں پر ۲۷۰ کروڑ روپے بچھا دیے۔ یہ فرق و عدم مساوات اس لیے خاص طور پر قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ ایک طرف

[1] دیکھو ایک کتاب موسوم بہ "ہندوستان ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء" میں "صفحہ ۱۷۱"؛ "ہندوستان ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء" میں "صفحہ ۱۲۸ تا صفحہ ۱۳۰"؛ "ہندوستان ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء" میں "صفحہ ۲۳۰ تا ۲۳۴"؛ اور زرعی کمیشن کی رپورٹ پیراگراف (۲۶۹ تا ۲۷۶)۔

باب

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں تک آمدنی کے لحاظ سے ریلوں سے نقصان ہو رہا تھا، اور دوسری طرف گزشتہ صدی کے آخر میں قحط کا بہت شدّت سے دور دورہ تھا۔ وت نے یہ استدلال کیا کہ برطانوی اصلداروں، محکموں اور صنّاعوں کے اثر کے تحت حکومت پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ ضمانتی طریق پر بعجلت ریلیں تعمیر کی جائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضرورت سے زیادہ ریلیں بن گئیں۔ فوجی اغراض کا لحاظ اور قحط زدہ علاقوں تک امداد پہنچانے کی ذمّہ داری کا روز افزوں احساس حکومت کی پالسی پر اثر انداز ہوا۔ یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ حفاظتی کارہائے آبپاشی منفعت بخش نہ تھے، اور اس لحاظ سے ان کی ترقّی کی رفتار بہت سست تھی۔ علاوہ ازیں سرکاری پالسی کے نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ریلوں کی تعمیر میں نامناسب عجلت نے ملکی صنعتوں کے زوال کی رفتار کو بڑھا دیا جس کی وجہ سے زراعت میں آبادی کا دباؤ بڑھ گیا اور اس طرح حفاظتی ریلوں کا مقصد یعنی قحط کی شدت میں کمی کرنا ایک حد تک فوت ہوگیا۔

کئی اسباب کی بنا پر مذکورۂ بالا مباحث میں اب وہ سرگرمی باقی نہیں رہی ہے۔ اب جبکہ ریلیں عام طور پر منفعت بخش ثابت ہو رہی ہیں اور محصول ادا کرنے والے کی جیب پر ان کا کوئی بار نہیں پڑ رہا ہے، ان کی توسیع کے بارے میں نقادی کی مخالفت بڑی حد تک کمزور پڑ گئی ہے گو بالکل معدوم نہیں ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۰۱ء کے آبپاشی کے کمیشن کی سفارشات کے نتیجے کے طور پر حکومت آبپاشی کے معاملے میں بتدریج بہت فراخ دلی سے کام لے رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت نے بعض ایسے نئے کاموں کی تکمیل بھی اپنے ذمّے لی ہے جس پر کمیشن نے غور و خوض نہیں کیا تھا۔

خود مباحث کے عیب و صواب کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو ممکن ہے کہ ریلوں اور آبپاشی کے درمیان صحیح تناسب قائم کرنے کا معاملہ نزاعی ہو لیکن ایک دوسرے کا مخالف و متضاد نہیں ہے بلکہ مویّد و معاون ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر غذا کی زائد رسد آبپاشی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے تو ملک میں اس کی مناسب تقسیم زیادہ تر ریلوں ہی کے ذریعے سے عمل میں آ سکتی ہے۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ

باب ۸

گزشتہ صدی کے آخر میں حکومت کی آبپاشی کی پالیسی ویسی ترقی پذیر نہ تھی جیسی کہ آجکل ہے اور اگر حفاظتی کارہائے آبپاشی کو انجام دینے کا فیصلہ کرنے میں فوری فائدے اور نقصان کے ملحوظات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے تو آجکل بھی آبپاشی کی توسیع کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہ بات بمبئی کے بارے میں خاص طور پر صادق آتی ہے اس لیے کہ یہاں سندھ کو خارج کر کے مجموعی زیر کاشت رقبے کے ۴ فیصد سے بھی کم کی آبپاشی جملہ ذرائع سے ہوتی ہے جس میں سرکاری آبپاشی کا حصہ بقدر نصف ہے؛ گو یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ نئے پراجکٹ جو زیر تجویز یا زیر غور ہیں اس رقبے میں مستقبل قریب میں توسیع کر دیں گے۔ احاطۂ بمبئی میں بارش عام طور پر بے وقت اور کبھی کم کبھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کارہائے آبپاشی کی کافی سہولتیں مہیا کرنے کی اہمیت پر زیادہ زور دینا مبالغہ نہیں قرار پا سکتا۔ ۱۹۲۶ء کی احاطۂ بمبئی کی زرعی نمائش میں شعبۂ آبپاشی اور شعبۂ ارضی ترقی کا انتظام اس بات کا ثبوت خیال کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کو اس ضرورت کا واضح طور پر احساس ہے۔ جہاں تک کل ملک کا تعلق ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں میں جہاں آبپاشی نہایت منفعت بخش ہے مثلاً شمالی ہند میں، وہاں قحط اور غیر ثبات پذیر زراعت کا امکان و قرینہ زیادہ نہیں ہے؛ اس کے برخلاف جزیرہ نمائے ہند میں خاصکر خاص احاطۂ بمبئی میں جہاں بارش بہت ہی غیر معین ہے آبپاشی براہ راست منفعت بخش نہیں ہے۔ لیکن یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہاں نفع و نقصان کے خالص تجارتی ملحوظات بے موقع ہیں اور مسئلے پر ایک وسیع نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۸۔ آب زدگی اور نمکی فوران [1]

آب زدگی (پانی کا جمع ہونا) اور نمکی فوران (کلر پیدا ہونا) ایسے خطرات ہیں جو نہری آبپاشی سے خاص طور پر وابستہ ہوتے ہیں؛ اور گزشتہ زمانے میں ان خطرات سے بچنے کا انتظام ہمیشہ موثر طریقے پر نہیں کیا گیا۔ اسی لیے زمین بعض اوقات آبپاشی کے

[1] Water logging and salt Effervescence.

240

باب

نتیجے کے طور پر خراب ہوتی گئی۔ چنانچہ پنجاب میں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۲ء میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ زمین اس وجہ سے ناقابل کاشت بن گئی تھی کہ زیر زمین پانی کی سطح بلند ہو گئی۔ اس سے بھی بڑا رقبہ نمکوں (کلر) کے سطح زمین پر پہنچ آنے کی وجہ سے ناقابل زراعت ہو گیا، اور اس کا خطرہ ہے کہ یہ خرابی اس سے بھی زیادہ بڑے رقبے پر پھیل جائے[1]

بمبئی کی وادی نیرا میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ الکلی (لونا) کی زمینیں محض نہری آبپاشی کے براہ راست نتیجے کے طور پر رونما ہوئی ہیں اور یہ خرابی ہر سال بڑھ رہی ہے[2]

یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ جن رقبوں میں نہروں کے ذریعے سے
آبپاشی ہوتی ہے ان میں کسان بہت سا پانی ضائع کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ ان اسباب
میں سے ایک ہے جس کی بنا پر زمین میں پانی جمع ہو جاتا ہے اور کلر پیدا ہوتا ہے۔
لیکن جیسا کہ زرعی کمیشن نے بتلایا ہے اس کو سراسر اس واقعے کی جانب منسوب نہیں
کیا جا سکتا کہ کسان کو یہ ترغیب نہیں ہوتی کہ حکومت کے مہیا کیے ہوئے پانی کو کفایت
کے ساتھ استعمال کرے۔ پانی کی بہت بڑی مقدار ضائع ہو جانے کا باعث پانی کی
رسد کا عدم تیقن ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ پانی کے کفایت شعارانہ استعمال کو
یقینی بنانے کے لیے آبپاشی کمیشن کی سفارشات کے مطابق جو تحقیق و تجربہ عمل میں لایا گیا
241 تھا اس کا از سر نو احیا کیا جائے اور پانی کو بلحاظ مقدار فروخت کرنے کے خلاف آخری
فیصلے پر پہنچنے سے پیشتر پنجاب اور دوسرے مقامات میں مزید تحقیق و تجربہ کیا جائے[3]

نہری علاقوں میں زائد پانی کی مناسب طور پر نکاسی کرنے میں کوتاہی صرف زرعی نقطۂ نظر ہی سے خرابی اور نقص ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اس نے ایسے خطوں کو بھی مرطوب اور ملیریائی بنا دیا ہے جو سابق میں صحت بخش تھے۔ لہٰذا نہری آبپاشی محض انجنیئر ہی کا کام نہیں ہے بلکہ ارضی طبعیات، زرعی کیمیا، طب و حفظان صحت کے

۱۔ دیکھو برج نرائن کی تصنیف موسومہ بہ "ہندوستان کی معاشی زندگی" صفحہ ۳۸۳

۲۔ دیکھو ہاورڈ کی کتاب محولہ بالا صفحہ ۵۴۔

۳۔ زرعی کمیشن کی رپورٹ فقرہ ۲۷۷۔

باب ۷

ماہروں سے بھی اس کام میں مشورہ اور مدد لینے کی ضرورت ہے۔ زرعی کمیشن یہ سفارش کرتا ہے کہ آیندہ آبپاشی کی جملہ نئی تجاویز تیار کرتے وقت پانی کی نکاسی کی بدررووں کی احتیاط کے ساتھ مساحت بھی لازمی طور پر کرنی چاہیے اور پانی خارج کرنے کے رقبے کے نقشے تیار کرنے چاہئیں۔

۱۹۔ پنجاب کی نہری نوآبادیات[1]

ہندوستانی آبپاشی کی بحث کو ہم پنجاب کی اُن نہری نوآبادیات کا کچھ حال بیان کرنے کے بعد ختم کردیں گے جنھوں نے ہماری آبپاشی کی تاریخ میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ پنجاب میں آبپاشی کے جن مسائل کا حکومت کو مقابلہ کرنا پڑا وہ دوسرے صوبوں کے مسائل سے مختلف ہیں۔ گزشتہ صدی کے آٹھویں عشرے میں آبپاشی کا کام شروع ہونے سے بیشتر ملک کا وہ وسیع رقبہ جس کی اس وقت زیریں چناب جہلم اور باری دوآبہ کی نہروں سے آبپاشی کی جاتی ہے بے موقع اور کم بارش کی وجہ سے صحرا تھا۔ اسی وجہ سے "یہ بات ضروری ہوئی کہ کارہائے آبپاشی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ جن نئے رقبوں کا افتتاح ہو اُن میں آبادی کو بھی مستقل طور پر منتقل کیا جائے" (دیکھو ہیرس کی تصنیف)۔ آبادکاروں کی آمد سے پیشتر پانی گزرنے کے سیدھے راستے قائم کیے گئے اور اسی کے مطابق ہر نوآبادی کی زمین کے چھوٹے بڑے مربع اور مستطیل خطے الگ الگ بنا دیے گئے، دیہات کی سرحدیں مقرر کی گئیں، سڑکوں کی تعمیر کے نشان ڈالے گئے، اور متصلہ زمین کو چراگاہ کے طور پر اور دوسرے اجتماعی کاموں کے لیے الگ رکھا گیا۔ آبادکاروں کو منتقل ہونے پر مکان تعمیر کرنے پڑے اور ان خطوں پر کاشت شروع کرنی پڑی جو اُن کو دیے گئے تھے۔ اس طرح ان دیہی نوآبادیات کا نہایت باقاعدہ خاکہ مرتب کیا گیا تھا اور ان میں حفظ صحت کی ایسی سب سہولتیں موجود ہیں جو معمولی دیہات میں مفقود ہیں۔ مالگزاری کے عہدہ داروں نے دانشمندی کے ساتھ صوبے کے گنجان آباد علاقوں سے اور موروثی زمینداروں

---

[1] دیکھو ہیرس کی کتاب محولۂ بالا صفحہ ۸۴ تا صفحہ ۹۵ اور ڈارلنگ کی تصنیف موسوم بہ "پنجابی کسان" باب ۶۔